

اکتوبر 2018

ماہنامہ خواتین کی دنیا

خواتین کی دنیا

آلف
میرزا احمد
ماہنامہ کی مکمل

خواتین و طبیعت

حکومت و کتاب خانہ

خواتین و طبیعت

37 - لکھنؤ

APNS
CPNE

ایڈیٹر —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

شعبہ —————

APNS
CPNE





12 مسیر

13 ادارہ

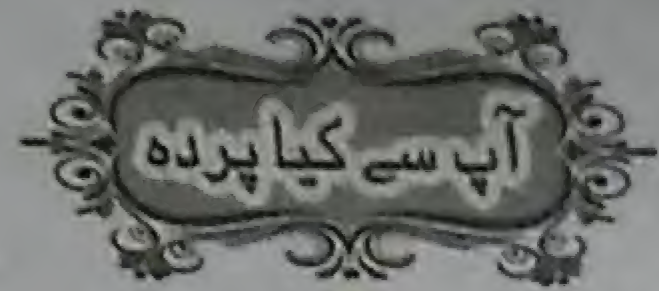
23 نادو خاتون

کہنہ سنٹی
کرن کرن روٹی
ہمارے تادم

30 عمیر احمد

152 عمرہ احمد

الف
حالم



18 انشاجی

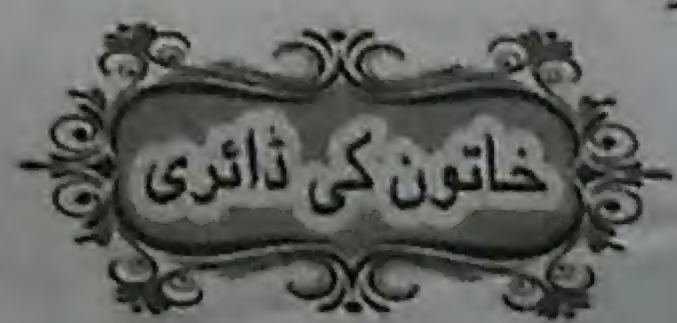
فقیر کر



198 سمیرا حمید

108 سائرہ رضا

اُم الیقین
جمال زہرا

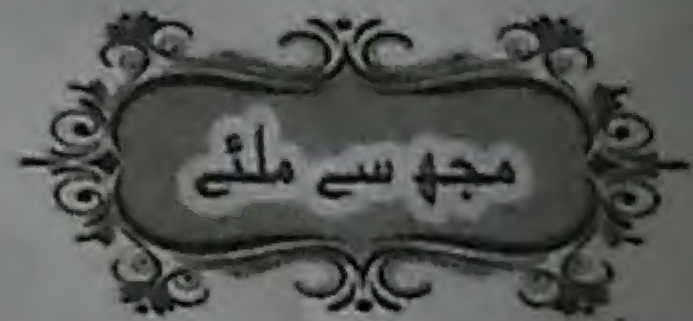


242 میری ڈائری سے (امت الصبور)



80 فریدہ سنی

دل بھی تو ہے



19 شاہین رشید

باتیں اتمہ بیگ سے



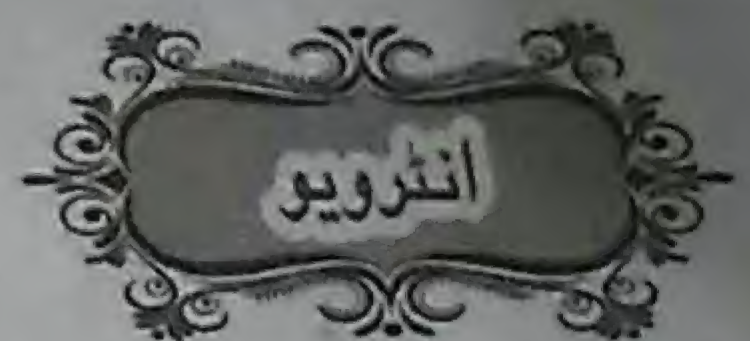
185 عفت سحر طاہر

61 عطیہ خالد

100 میمنہ صدف

67 ربیعہ طارق

دھتک کے رنگ
رشتوں کی چابی
مسٹر اسمائل
دل عشق میں



246 شاہین رشید

252 ادارہ

کمر شاہد علی زیدی
مشی کو بیاں ملے

نامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے معنی و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل و ارقط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



نظمیں غزلیں

- غزل
غزل
نظم
غزل
- 237 شکیب جلالی
238 مومن خان مومن
238 ٹوبہ قطب
237 شبانہ یوسف

رنگارنگ پھول

- رنگارنگ سلسلہ
خبریں ویریں
- 239 شگفتہ جہا
250 واصفہ آیل

پکوان

- موسم کے پکوان
آپ کا یاد رکھی خانہ
- 255 خالدہ جیلانی
254 سیدیہ وحیدہ پوری

بیوٹی بکس

- بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور
- 258

نفسیات

- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں
عدسان
- 256

میری بیاض سے

- آپ کی بیاض سے
خالدہ جیلانی
- 244

اکتوبر 2018

جلد 46 شمارہ 6

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذریہ بیاض نے اس سن پر رنگ پر پس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 1، بلاک W، نزد گھوٹا علم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32768872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر کچھ سچی

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمار دلیے ماضی میں۔
عموماً ہمارے ہاں دانش ور حضرات ذہنی اور فکری سطح پر معاشرے کی بگڑتی صورت حال اور سب سے زیادہ اہمائی پھرت
کے زوال پر اظہار افسوس کرتے رہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں اظہار رائے کی آزادی نہ ہو۔ وہاں سچ اور
جھوٹ میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ کون صحیح ہے کون غلط؟ اس کا فیصلہ کون کرے۔ میڈیا بے اعتباری کی زد میں ہے۔
جہوریت کے چوتھے ستون کی یہ بے اعتباری بہر حال افسوس ناک ہے۔ لیکن ایک حقیقت بلکہ سب سے بڑی حقیقت
یہ بھی ہے کہ عوام کے مسائل کچھ اور ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ ملک کے لیے کون سا نظام بہتر ہے۔ وہ یہ چاہتے
ہیں کہ نظام کوئی بھی ہو، کم از کم وہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ رہیں۔ انہیں علاج معالجہ اور تعلیم کی سہولت
مہیا ہو۔

انتخابات کے بعد نئی حکومت کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ پچھلی حکومت کے خلاف محاذ آرائی۔ پھر عدالتی احکامات
کے تحت حکومت کی معطلی سے میثیت کو جو دھچکا لگا ہے، وہ رنگ لارہا ہے۔ نئی حکومت آتے ہی ٹیکسوں
میں اضافہ کر دیا ہے۔ پٹرول، گیس اور بجلی کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ اس اضافے کا مطلب ہے کہ مہنگائی
میں مزید اضافہ۔ منغیتیں بند آمد بے روزگاری مزید بڑھ جائے گی۔ مہنگائی اور مسائل کے صحرا میں جھلکتے عوام کے
لیے یہ صورت حال مرے پر سودے کے مترادف ہے۔

کاش اقتدار کی سند پر بیٹے یا اختیار لوگ جان سکتے کہ ایک غریب مزدور کے لیے زندگی کیسا بھیانک خواب
بن گئی ہے اور بے روزگاری کتنا بڑا غراب ہے۔

حالات بہت کھٹن اور مشکل ہیں لیکن اس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مایوسی کے اندھیروں میں فی الحال کہیں امید
کی کرن بھی نہیں نظر آ رہی ہے۔

سفر صحیح سمت میں ہو تو جلد یا بدیر منزل مل جاتی ہے لیکن فی الحال یہاں منزل تو دور کی بات، صحیح راستے کا
بھی تعین نہیں ہو پا رہا ہے۔

اس صورت حال میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ آمین۔

محمود بابر فیصل
جائے دانوں کو کون روک سکا ہے، کوئی لاکھ جتن کر لے، جنہیں جانا ہوتا ہے، وہ خاموشی سے ہاتھ جھڑا کر چلے جاتے
ہیں۔ محمود بابر فیصل کو دنیا سے رخصت ہونے کو یل غصہ گزر گیا کہتے ہیں وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ وقت ہر
زخم کا مرہم بھی، لیکن زخم بھر بھی جائیں تو کسک چھوڑ جاتے ہیں۔ جدائی کا دکھ بھرا احساس رہ جاتا ہے۔
زندگی سے بھرپور محمود بابر فیصل آج ایک کسک، ایک اداس اور افسردہ کر دینے والی یادیں زندگی اور موت
کا رشتہ تو بھی بھی ضابطوں اور قواعد کا پابند نہیں رہا لیکن یوں بھری بہار میں رخصت ہونے والے بہت ہی
رلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ محمود بابر فیصل کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ قارئین سے دُعا ہے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ ام الیقین، سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ جمال تہرلو (دوسری اور آخری قسط)
- ۲۔ فریدہ بیگمی کا ناولٹ۔ دل ہی تو ہے، عمیرہ احمد اور منیرہ احمد کے ناول،
- ۳۔ عفت سحر طاہر، عطیہ خالد، میمونہ صدق اور ربیعہ طارق کے افسانے،
- ۴۔ ڈاکٹر شاہد علی زیدی سے ملاقات، کرن کرن روشنی۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- ۵۔ ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- ۶۔ خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کین کین روشنی

ادارہ

اظہار کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص کو تو اللہ نے کبھی معاف نہیں کرنا، حالانکہ یہ اللہ کی شان میں بے ادبی کا مظاہرہ اور اپنی بابت حد سے زیادہ خوش گمانی کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس عابد و زاہد و متقی کے سارے عمل برباد کر کے اسے جہنم میں پھینک دے اور اس گناہ گار کو معاف کر کے جنت میں بھیج دے جس کی بابت یہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ اسے اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

مسلمان کی تکلیف پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مومن تو بھائی بھائی ہیں۔“

الحجرات-10

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک وہ لوگ جو اہل ایمان کے اندر بے حیائی کے پھیلائے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔“

وصیت سے متعلق احکام و مسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ

حضرت جناب بن عبد اللہ رسی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔
”ایک آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔“

تو اللہ عز و جل نے فرمایا:

”کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے عمل میں نے برباد کر دیے۔“

(مسلم)

فوائد و مسائل:

بعض لوگوں کو اپنی عبادت اور زہد و تقویٰ پر گھمنڈ ہو جاتا ہے، جو انہیں دوسروں کی بابت بدگمانی میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ بڑے یقین سے اس بات کا

(سورة النور 19)

حضرت وائلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اے (مسلمان) بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو (کہیں ایسا نہ ہو) کہ اللہ تعالیٰ اس پر تو رحم فرمادے اور تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

شرعی طور پر ثابت نسب میں

طعن کرنا حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف دیتے ہیں، یقیناً انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔“

(سورة احزاب 58)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں جو ان کے کفر کا باعث ہیں: نسب میں طعن کرنا اور فوت شدہ پر بین کرنا۔“

(مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ دونوں گناہ ایسے ہیں کہ اگر انسان انہیں حلال سمجھ کر ان کا ارتکاب کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، تاہم بشری کمزوری کی وجہ سے ان کا صدور سخت کبیرہ گناہ ہے۔

2۔ نسب میں طعنہ زنی کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اس کی تحقیر و توہین کی نیت سے کہا جائے کہ تیرا باپ تو فلاں کام کرتا ہے، تیری ماں تو ایسی ویسی ہے، یا تو جولاہا، لوہار، دھوبی اور موچی وغیرہ ہے۔ پیشوں کی وجہ سے بھی کسی خاندان یا شخص کو حقیر سمجھنا طعن فی النسب ہی کی ایک صورت ہے۔

3۔ نوحہ و ماتم (بین کرنے) کا مطلب:

مردے کے اوصاف بیان کر کے رونا پیٹنا اور زور زور سے چیخنا اور واویلا کرنا ہے۔

جعل سازی اور دھوکا دہی کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور تکلیف دیتے ہیں، انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔“

(سورة الاحزاب 58)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے۔ وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں۔ اور جو ہمیں دھوکا دے، وہ ہم میں سے نہیں۔“ (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ کا غلے کے ایک ڈھیر پر سے گزر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں نے تری محسوس کی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”اے غلے والے! یہ کیا ہے؟“ اس نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اسے بارش پہنچی ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا:

”تو تو نے اس (بھیکے ہوئے حصے) کو غلے کے اوپر کیوں نہ کر دیا تا کہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ (یاد رکھ جس نے ہم سے دھوکا کیا، وہ ہم میں سے نہیں)۔“

فوائد و مسائل:

1۔ ہتھیار اٹھانے سے مراد مسلمانوں کی جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کرنا، یا بغیر کسی وجہ کے کسی مسلمان پر تلوار، بندوق، موڑادر کلاشنکوف وغیرہ اٹھانا اور اسے مار دینا ہے، جیسے آج کل بدقسمتی سے یہ دہشت گردی عام ہے۔

2۔ جعل سازی اور دھوکا دہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک معنوی ہے، جیسے باطل پر حق کا غلاف چڑھا دینا اور دوسری مادی اور ظاہری ہیں، جیسے

سودے میں کوئی عیب ہو تو اسے ظاہر نہ کرنا، اچھے مال میں ردی اور گھٹیا مال کی آمیزش کر دینا۔ سودے میں کسی اور چیز کی ملاوٹ کر دینا تاکہ اس کا وزن زیادہ ہو جائے، اس طرح کی متعدد صورتیں۔

3۔ ہم میں سے نہیں کا مطلب ہے، مسلمانوں کے طریقے پر نہیں۔ اس کا یہ کردار مومنانہ نہیں، غیر مومنانہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو ہر قسم کی دھوکا دہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”خریداری کی نیت کے بغیر بولی میں اضافہ مت کرو۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

انسان کی نیت خریدنے کی نہ ہو، پھر بھی قیمت بڑھا کر بولی لگائے تو ظاہر بات ہے کہ اس سے دوسرا خریدار دھوکا کھا جائے گا اور اسے اصل قیمت سے کہیں زیادہ قیمت پر وہ چیز خریدنی پڑے گی۔ گویا یہ بھی دھوکا دہی کی ایک صورت ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دھوکا دینے کی نیت سے قیمت بڑھانے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں بھی نرخ پر نرخ بڑھانے سے منع فرمایا گیا ہے، جب کہ مقصد خریدنا نہ ہو، بلکہ صرف دوسرے کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ وہ خرید و فروخت میں دھوکا کھا جاتا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس سے تو سودا کرے تو یہ کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

مذکورہ الفاظ کہنے سے مقصد ثبوت خیار کا تحقق ہے، یعنی اگر سودے میں کوئی دھوکا اور فریب ہو تو خریدار کو سودا واپس کرنے کا حق ہوگا۔ بیچنے والوں کو

بھی اس حق کا احترام کرنا پڑے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص کسی کی بیوی یا اس کے غلام کو دھوکا دے تو وہ ہم میں سے نہیں۔“ (ابوداؤد)

فائدہ:

کسی کی بیوی یا غلام کو دھوکا کر خاوند اور مالک کے خلاف کر دینا اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے متنفر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مومن کی شان تو اصلاح بین الناس ہے نہ کہ فساد بین الناس (لوگوں کے درمیان فساد ڈالنا)۔

بد عہدی کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔“

(سورۃ المائدہ - 1)

نیز فرمایا: ”عہد کو پورا کرو، اس لیے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔“

(الاسراء 34)

فائدہ آیات:

ایک عہد تو وہ ہے جو انسان آپس میں کرتے ہیں۔ اور ایک عہد وہ ہے جو اللہ نے انسانوں سے لیا ہے کہ وہ اس کی توحید و ربوبیت کا اقرار کریں اور اس کے احکام و ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں۔ ان دونوں قسم کے عہدوں کی پاسداری ضروری ہے اور ان میں کوتاہی پر قیامت والے دن باز پرس ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”چار خصلتیں ہیں، جن میں وہ ہوں گی وہ

خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی

یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اس کے پاس

امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، جب بات

کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی عہد کرے تو بے

وفائی کرے اور جب کسی سے جھگڑے تو بدزبانی

کرے۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: فصلتیں ہیں، ایک مومن کو ان تمام خصلتوں سے پاک ہونا چاہیے۔

2۔ اخلاق فاضلہ کا ایمان سے گہرا تعلق ہے، جہاں ایمان ہوگا، وہاں حسن اخلاق کی بھی جلوہ گری ہوگی اور جہاں ایمان نہیں ہوگا، اخلاق کا بھی فقدان ہوگا۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”قیامت والے دن ہر عہد توڑنے والے کے لیے ایک جھنڈا ہوگا، کہا جائے گا کہ یہ فلاں کی بد عہدی (کا نشان) ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

عذر سے مراد عہد توڑ دینا اور اس کی پروا نہ کرنا ہے، قیامت والے دن تمام لوگوں کے سامنے ایسے عہد شکن کو ایک جھنڈا دیا جائے گا جو اس کی بد عہدی کا ایک نشان ہوگا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر عہد شکن کے لیے قیامت والے دن، اس کی سرین کے پاس ایک جھنڈا ہوگا۔ اسے اس کی بد عہدی کے تناسب سے بلند کیا جائے گا۔ سنو! عام لوگوں کے امیر و حاکم کے عہد کو توڑنے والے سے بڑا عہد شکن کوئی نہیں۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ عامۃ المسلمین کے امیر سے مراد حاکم وقت (خلیفہ، بادشاہ اور حکمران) یا اس کا نائب ہے۔ اس کے عہد کو توڑنے سے مراد اس کے عہد اطاعت اور بیعت کا توڑنا اور اس کے خلاف خروج و بغاوت ہے۔ اسلام نے حکمرانوں پر تنقید کرنے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کی اصلاح کرنے کی

تو تائید کی ہے اور اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، لیکن ان کے فسق و فجور یا ان کے ظلم کی وجہ سے ان کے عہد اطاعت کو توڑ دینے اور ان کے خلاف خروج و بغاوت کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس طرح ملک میں فساد اور بد امنی پیدا ہوتی ہے، جس سے حالات مزید خراب ہی ہوتے ہیں، اصلاح پذیر نہیں ہوتے۔

تاریخ میں خروج و بغاوت کے جتنے بھی واقعات ہیں، ان میں سے کسی سے بھی امت مسلمہ یا اسلام کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ نقصان ہی ہوا ہے۔ اسی طرح آج کل کی جمہوریت میں بھی، جس میں حکومت وقت کے خلاف مظاہرے جمہوریت کا ایک حصہ بلکہ اس کی جان سمجھے جاتے ہیں، یہ ایک بے شرم عمل ہے جس سے نہ حکمرانوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ نہ ملک و قوم کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ البتہ توڑ پھوڑ سے لوگوں کی املاک اور قومی املاک کو نقصان پہنچتا ہے اور بعض دفعہ انسانی جانوں کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سیاسی مظاہرے بھی شرعاً محل نظر ہیں۔

اس حدیث میں حکمرانوں کے خلاف اس قسم کے اقدامات پر سخت وعید بیان کی گئی ہے، اس لیے ہمیں حکومت وقت اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے کوئی اور مناسب طریق کار وضع اور اختیار کرنا چاہیے جس میں محض تنقید برائے تنقید نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں خیر خواہی اور ملک و قوم کے مفادات کا جذبہ کار فرما ہو۔

2۔ عربوں میں رواج تھا کہ وہ بد عہدی کرنے والوں کے لیے بازار میں جھنڈے گاڑ دیا کرتے تھے تاکہ وہ بدنام اور ذلیل ہوں۔ اسی رواج کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کی اخروی سزا کا تذکرہ فرمایا، تاکہ اس جرم اور اس کی سزا کی نوعیت لوگ سمجھ سکیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین آدمی ہیں جن سے قیامت والے دن میں خود جھگڑوں گا: ایک وہ آدمی جس نے میرے نام سے عہد کیا، پھر اسے توڑ دیا، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھالی اور تیسرا وہ آدمی جس نے اجرت پر ایک مزدور حاصل کیا، پتا چلا اس سے اپنا کام تو پورا لیا لیکن اسے اس کی اجرت نہیں دی۔“

(بخاری)

فائدہ: اس میں عہدوں کو پورا کرنے، آزاد شخص کو فروخت نہ کرنے اور مزدور کو اس کی مزدوری دینے کی ترغیب ہے۔

عطیہ وغیرہ دینے کے بعد احسان

جستلانے کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے ایمان والو! احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنے صدقے ضائع مت کرو۔“ (سورۃ البقرہ ۲۶۳)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وہ لوگ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ (ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان پر نہ تو کچھ خوف ہے اور نہ وہ اداس ہوں گے۔“ (سورۃ البقرہ ۲۶۳)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”تین آدمیوں سے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا، نہ (رحمت کی نظر سے) انہیں دیکھے گا اور نہ پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔“

راوی بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔ حضرت ابو ذر نے عرض کیا۔

”وہ نامراد ہوئے اور گھائے میں رہے اے اللہ

کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا، احسان کر کے احسان جتلانے والا اور اپنا سامان جھوٹی قسم کے ذریعے سے بیچنے والا۔“ (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ”اپنی ازار کو نیچے لٹکانے والا۔“ یعنی اپنی شلوار، پاجامے اور کپڑے کو تکبیر کی وجہ سے مخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے واضح ہے کہ شلوار، پاجامہ، پتلون اور تہ بند وغیرہ مخنوں سے نیچے لٹکانا حرام ہے۔ یہ حکم مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے اس کے برعکس ہے۔

2۔ کھل مشہور ہے۔ ”نیکی کر دریا میں ڈال“ یعنی کسی پر احسان کر کے پھر اسے ہرگز نہیں جتلاتا چاہے کیونکہ اس سے نہ صرف وہ نیکی برباد ہوتی ہے بلکہ انسان عذاب شدید کا بھی مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس لیے کسی پر احسان کرنے سے زیادہ مشکل اس نیکی کی حفاظت کرنا ہے۔

3۔ جھوٹی قسم کھانا مطلقاً حرام ہے لیکن سودا بیچنے کے لیے گاہک کو دھوکا دینے کی نیت سے جھوٹی قسم جھوٹی قسم کھانا تو اور زیادہ بڑا جرم ہے، کہ اس میں دو جرم اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جھوٹی قسم اور دھوکا دہی۔

قربانیوں کا گوشت رکھ چھوڑنا

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا گوشت سنبھال رکھنے سے لوگوں کے فقر و فاقہ کی وجہ سے منع فرمایا تھا، پھر اجازت دے دی۔ (بخاری)

حضرت نبیہ (بن عبد اللہ ہذلی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے تم کو قربانی کے گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کیا تھا۔ اب کھاؤ اور ذخیرہ کرو۔“ (ابوداؤد)

فقیر بن کر

انشائی

فقیر بن کر تم ان کے در پر ہزار دھونی رملے بیٹھو
جبیں کے لکھے کو کیا کرو گے، جبیں کا لکھا ملے بیٹھو

اے ان کی محفل میں آنے والو، اے سود و سودا بتانے والو
جوان کی محفل میں آ کے بیٹھو تو ساری دنیا بھلا کے بیٹھو

بہت جتاتے ہو چاہ ہم سے، مگر کرو گے نباہ ہم سے؛
ذرا ملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آ کے بیٹھو

جنوں پرانا ہے عاشقوں کا، جو یہ بہانا ہے عاشقوں کا
تو اک ٹھکانا ہے عاشقوں کا، حضور جنگل میں جا کے بیٹھو

ہمیں دکھاؤ نہ زرد چہرا، لیے یہ وحشت کی گرد چہرا
رہے گا تصویر درد چہرا، جو روگ ایسے لگا کے بیٹھو

جناب انشایہ عاشقی ہے، جناب انشایہ زندگی ہے
جناب انشایہ جو ہے یہی ہے، نہ اس سے دامن پھڑکے بیٹھو

بیاتین ائمہ بیگ

شاہین رشید



1 "اصلی نام؟"

"آئمہ نورالعین بیگ۔"

2 "پیار کا نام؟"

"زیادہ تر لوگ آئمہ کہتے ہیں۔ ویسے پیار کے

بھی بہت سے نام ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش؟/شہر؟"

"10 مارچ 1989ء/رحیم یار خان۔"

4 "قد/ستارہ؟"

"قد کو چھوڑیں۔ ستارہ میرا "حوت" ہے۔"

5 "تعلیم؟"

"اسکول آف کری ایشن آرٹ سے پچلرز کیا

ہے اور فلم اور ٹی وی میں پچلرز کیا ہے۔"

6 "بہن بھائی کی تعداد/آپ کا نمبر؟"

"ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔"

7 "والدین؟"

"جی والد ماشاء اللہ حیات ہیں۔ والد صاحب

الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ جبکہ والدہ نے انگریزی ادب

میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ اس لیے کہا کہ ان کا انتقال ہو

چکا ہے۔"

8 "مادری زبان؟"

"والد صاحب پنجابی ہیں اور والدہ اردو

اسپیکنگ ہیں اور میں کس پلیٹ۔"

9 "گھر میں بولی جانے والی زبان؟"

"انگریزی..... کبھی کبھار اردو اور پنجابی کا تڑکا

بھی لگ جاتا ہے۔"

10 "بہن بھائی کیا کرتے ہیں؟"

"بڑے بھائی الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ ایک

بہن ڈاکٹر ہے۔ دوسری بزنس منجمنٹ پڑھ رہی ہے۔

پھر میرا نمبر ہے اور چھوٹا بھائی بھی زیر تعلیم ہے۔"

11 "آپ کے علاوہ کون ہے اس فیلڈ میں؟"

"میرے بڑے بھائی انسٹرومنٹ پلیئر ہیں۔ تو

ہم دونوں کو جب بھی موقع ملتا ہے ہم "کنٹاز" اور

"کی بورڈ" بجاتے ہیں اور ساتھ ساتھ گاتے بھی

ہیں..... ویسے میرے علاوہ خاندان میں اور کوئی نہیں

اس فیلڈ میں۔"

12 "دوستی کس سے ہے اور پیار؟"

"دوستی بڑے بھائی سے ہے اور پیار سب سے

ہے۔"

13 "آئمہ نورالعین" اتنا لمبا نام کس نے رکھا

تھا؟"

"آئمہ رکھا "ماما" نے اور نورالعین والد

صاحب نے رکھا۔ اس لیے پورا نام "آئمہ نورالعین"

ہو گیا..... کوئی لمبا نام نہیں لیتا۔ اس لیے آئمہ ہی

مشہور ہو گیا۔"

14 "شو بزم میں آمد؟"

”تھوڑی لمبی کہانی ہے۔ مگر راستے بنتے گئے اور
میں آگے بڑھتی رہی۔“

15 ”فیلڈ میں متعارف کرانے کا سہرا؟“
”خاور جاوید۔“

16 ”شہرت کس گانے نے دی؟“
”قلا باز دل ہے میرا اور ”روٹھایا روناوٹا اے“
ان دونوں نے بہت شہرت دی۔ دوسرا والا ”بازی“
کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔“

17 ”دیگر مشہور گانے؟“
”بے فکریاں، چن دے، بچنا دور، دل میں
ہیں، بالو ماہی“ اور کچھ اور بھی ہیں مگر یہ زیادہ مقبول
ہوئے۔“

18 ”ایوارڈ ملا؟“
”جی بالکل ملا..... مجھے ”لکس اسٹائل ایوارڈ“
مل چکا ہے۔“

19 ”کن کن زبانوں میں گاتی ہیں؟“
”اردو اور انگریزی۔“
20 ”کس سے متاثر ہو کر اس فیلڈ میں
آئیں؟“

”اگر میں یہ کہوں کہ بچپن سے شوق تھا تو آپ
کو یقین نہیں آئے گا۔ لیکن مجھے بچپن سے ہی شوق
تھا۔ کسی سے متاثر نہیں تھی۔“
21 ”حوصلہ افزائی کس نے کی؟“

”سب نے ہی..... بہن کو نعتیں پڑھنے کا شوق
تھا اور والد صاحب اکثر اکیلے میں گنگنا کرتے تھے،
تو مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی گاؤں۔“

22 ”مقابلوں میں حصہ لیا؟“
”جی بالکل..... اسکول، پھر کالج، پھر یونیورسٹی
ہر جگہ کامیابی ملی تو پھر سوچ لیا کہ گلوکارہ ہی بنتا ہے۔“
23 ”کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں؟“

”2015ء میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔“
24 ”آپ کی رول ماڈل شخصیت؟“

”میری ماں جواب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

25 ”کامیابی کا راز؟“

”محنت اور صرف محنت اور کام کی لگن۔“

26 ”آپ کی کوئی ایکسٹرا صلاحیت؟“
”میں رائٹر بھی ہوں اور اگر گلوکاری کی فیلڈ میں
نہ ہوتی تو پھر ایک اچھی رائٹر ہوتی۔“

27 ”غصہ آتا ہے؟“
”جب کوئی ایک ہی بات کو بار بار دہرائے۔“
28 ”رد عمل؟“
”کوئی خاص نہیں، برداشت کر لیتی ہوں۔“

اظہار مشکل سے کرتی ہوں۔ صبر کا مادہ بہت ہے۔“
29 ”گھر میں بھی آواز کا جادو جگاتی ہیں؟“
”ارے نہیں، چھوٹی تھی تو کمرہ بند کر کے گاتی
تھی کہ کوئی مذاق نہ اڑائے۔“

30 ”کبھی سوچا تھا کہ ایک دن معروف گلوکارہ
بن جاؤں گی؟“

”نہیں جی..... یہ احساس تھا کہ گلے میں سر
ہے مگر کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اتنی مقبول ہو جاؤں
گی۔“

31 ”پسندیدہ پروفیشن؟“

”یہی میوزک..... اور اس پروفیشن کو اپنانے کا
مشورہ خاور جاوید صاحب نے دیا۔“
32 ”ٹی وی پہ پہلا پروگرام؟“

”مذاق رات“ اس کی کو ہو سٹ تھی میں۔ پھر
میوزک کے ایک پروگرام میں تین گانے گائے جو کہ
بہت پسند کیے گئے۔“

33 ”شوق میں رکاوٹ ڈالی؟“

”نہیں کسی نے نہیں..... یہ کوئی ایسا پروفیشن تو
ہے نہیں کہ لوگ مخالفت کریں۔“

34 ”سب سے زیادہ سپورٹ کس نے کیا؟“
”ماما نے پھر ابانے۔“

35 ”گھر میں غصہ کس کا تیز تھا یا ہے؟“
”کسی کا نہیں..... رعب تھا ابا کا اور ہے بھی۔“

36 ”کس کے سامنے گاتے ہوئے جھجھک

”جی..... مجھے اللہ تعالیٰ کے غیض و غضب سے ڈر لگتا ہے کہ کبھی اللہ کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔“

45 ”گھر کے کس کو نے میں سکون ملتا ہے؟“
”اپنے کمرے..... گو کہ پورے گھر میں سکون ملتا ہے مگر اپنا کمرہ اپنا ہے۔“

46 ”پیسہ کس پہ خرچ کرتی ہیں؟“
”گھر والوں پر اور اپنے اوپر۔“
47 ”گھر کی تزئین و آرائش کا شوق ہے؟“
”جی بالکل ہے..... کبھی آپ میرا کمرہ دیکھیں

کس طرح میں نے سجایا ہے۔“
48 ”فارغ اوقات کے مشاغل؟“
”اب فارغ وقت نہیں ملتا۔ مل جائے تو میوزک اور دیگر دلچسپیاں ہیں جن سے دل بہلا لیتی ہوں۔“

49 ”کس کے لیے ٹائم نکالنا مشکل نہیں؟“
”میرے پاس ایک کتا اور ایک بلی ہے۔ ان کے لیے کسی نہ کسی طریقے سے ٹائم نکال ہی لیتی ہوں۔“

50 ”رنگوں سے پیار ہے؟“
”بہت..... اچھے رنگ کے کپڑے پہننا اور اپنے کمرے کو مختلف رنگوں سے سجانا مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے اپنے کمرے کو سفید اور سیاہ رنگ کی چیزوں سے سجایا ہے اور کمرے کی ایک دیوار پہ رنگ برنگی تتلیاں بھی لگائی ہیں۔“

51 ”پسندیدہ رنگ؟“
”سرمئی جسے گرے رنگ بھی کہتے ہیں۔“
52 ”بھی پڑوسی ملک سے گانے کی پیش کش ہوئی؟“

”بالکل آئی ہے پیشکش اور میں نے معروف گلوکار ”میکا سنگھ“ کے ساتھ ایک گانا بھی ریکارڈ کروایا ہے۔“

53 ”کیسا رہا تجربہ؟“

جاتی ہیں؟“
”اب تو خیر کسی کے سامنے گاتے ہوئے جھجکتی نہیں آتی۔ لیکن شروع شروع میں ”ایا“ کے سامنے گاتے ہوئے بہت شرم اور جھجک آتی تھی۔“
37 ”کن کن ممالک کی سیر کر چکی ہیں؟“

”کانی سارے..... کیونکہ والد صاحب اپنے کام کے سلسلے میں بیرون ملک جاتے رہتے تھے تو ہم بھی ساتھ جاتے تھے، اس لیے بہت گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔“

38 ”فلاحی کاموں سے دلچسپی؟“
”بہت زیادہ ہے اور کینسر کے مریضوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ میری پیاری امی کا انتقال بھی کینسر سے ہی ہوا تھا۔“

39 ”فیوچر میں اپنے آپ کو کہاں دیکھنا چاہتی ہیں؟“

”میں اپنے آپ کو پاکستان کی پہلی میوزک کمپوزر خاتون کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“
40 ”کون سے دن بہت یاد آتے ہیں؟“
”ماما کے ساتھ گزارے ہوئے دن بہت یاد آتے ہیں۔“

41 ”زندگی کا کون سا دور بہت اچھا ہوتا ہے؟“
”ابھی تو ایک ہی دور دیکھا ہے، بچپن۔ دوسرے دور میں اب قدم رکھا ہے۔ ابھی تو اچھا ہی گزر رہا ہے آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“
42 ”بچپن کی کوئی شرارت جو یاد ہو؟“

”بچپن میں بہت شرارتی تھی۔ عموماً بجلی کے سوئچ میں ہاتھ ڈال دیتی تھی جس کی وجہ سے ماما ڈانٹتی بھی بہت تھیں اور مجھ پر نظر بھی رکھتی تھیں۔“
43 ”آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟“

”بالکل بھی مختلف نہیں ہے..... میں عام لوگوں جیسی ہی ہوں۔ مجھ میں کوئی چیخ نہیں آیا۔“
44 ”آپ کو ڈر لگتا ہے؟“

”بہت اچھا..... توقع سے زیادہ اچھا رسپانس ملا۔“

54 ”وٹڈ شاپنگ کرتی ہیں یا؟“
”مجھے ہر طرح کی شاپنگ کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔“

55 ”ایک گانا جو اکثر گنگنائی ہیں؟“
”ایک نہیں..... کئی گانے..... جو زبان پر چڑھ جائے۔“

56 ”اپنا ہی گانا جو بہت پسند ہو؟“
”بانورے..... بلکہ سب ہی پسند ہیں۔“

57 ”جب بور ہونے لگتی ہیں تو؟“
”تو کوئی گیم کھیل لیتی ہوں..... یا پھر کچھ نہ کچھ لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ کیونکہ مجھے اسٹوریز لکھنے کا کافی شوق ہے۔“

58 ”کھانے سے لگاؤ ہے یا پکانے سے؟“
”کھانے سے لگاؤ ہے۔ مگر کم کھاتی ہوں اور کھانا پکا لیتی ہوں..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ میری بڑی بہنیں زیادہ اچھا پکا لیتی ہیں۔“

59 ”کھانے میں پسندیدہ ڈش؟“
”بریبانی..... بشرطیکہ گھر کی پکی ہوئی ہو۔“
60 ”کون سا میوزک مقبول عام ہے؟“
”جو ایک دم سے دل کو بھا جائے، ویسے خوب صورت آواز میں گایا ہوا کلام زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔“

61 ”کیا لوگوں میں میوزک کا شعور ہے؟“
”بہت زیادہ شعور ہے اور لوگ ہر طرح کا میوزک اب سنتا چاہتے ہیں۔“

62 ”گھر میں آپ کے لیے زیادہ فکر مند کون رہتا ہے؟“

”فکر مند تو خیر کوئی نہیں..... کیونکہ میں ہر کام بڑوں کی مرضی سے کرتی ہوں۔ البتہ میرے والد میرے معاملے میں بہت حساس ہیں۔“

63 ”آپ کے موسیقی کے استاد؟“

”کوئی نہیں..... میری آواز میرے لیے اللہ کا تحفہ ہے اور میں نے جو کچھ سیکھا اپنی محنت اور لگن سے اور کوشش سے سیکھا۔“

64 ”پسندیدہ سگر؟“

”عابدہ پروین صاحبہ۔ ان کا گایا ہوا ہر کلام مجھے پسند ہے۔“

65 ”لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟“

”لوگ ملتے ہیں تو تعریف ہی کرتے ہیں۔“

66 ”آپ انجوائے کرتی ہیں؟“

”اپنی پہچان کو، لوگوں کا محبت سے ملنا، بات کرنا، تعریف کرنا۔“

67 ”لائسنس ٹائٹل کتنی کاہلی ہیں؟“

”ارہائے نہیں..... میرے والدین کی تربیت نے ہمیں پراعتماد بنایا ہے۔ بہت آسانی سے پرفارم کر لیتی ہوں۔“

68 ”فخر کا کوئی لمحہ؟“

”جب اپنے گھر والوں کو اپنے لیے خوش دیکھتی ہوں اور جب سب کے سامنے پرفارم کرتی ہوں۔“

69 ”ڈراموں سے آفر آئی؟“

”جی بالکل آئی..... مگر مجھے ڈراموں میں، فلموں میں کام کرنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔“

70 ”اکیلے میں سوچوں کا محور؟“

”میری ماما کو کینسر میں کتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔ ایک سال ہوا وہ ہم سے بچھڑ گئیں۔ بہت یاد آتی ہیں۔“

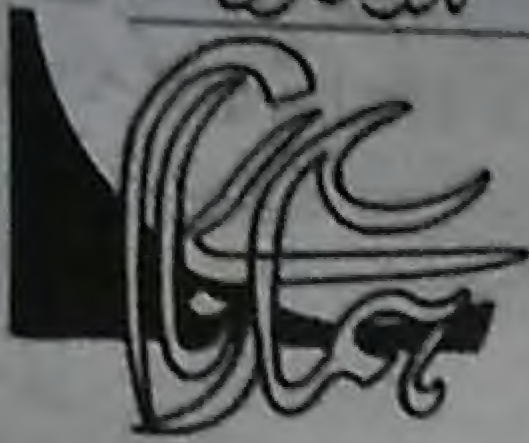
71 ”آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟“

”اللہ نہ کرے ابھی تو شہرت کا آغاز ہے۔“





نامہ خالقون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

ہونے کا ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات اچھی لگی۔ مستقل سلسلے سبھی اچھے تھے۔ نفسیاتی الجھنیں میں ناہید مسعود کی زندگی قربانیاں اور نتیجے میں جو حالات ان کو درپیش ہیں، اس قدر دکھ ہو رہا ہے کہ کیا کہیں بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔

ج: پیاری ناہید! یہ اعزاز صرف خواتین ڈائجسٹ کو حاصل ہے، یہ خواتین کا پہلا پرچا تھا جو ڈائجسٹ کی کے سائز میں آیا۔ اس کے بعد اس طرز کے دوسرے پرچے نکالنا شروع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت و تندرستی کے لیے دعا گو ہیں۔

سلمیٰ ناز..... اوج شریف

ظلم کی بہت ساری اقسام ہیں۔ مگر آپ کا ظلم کس قسم میں آتا ہے؟ آپ سب کی تحریروں میں خواب ہی خواب، پھول ہی پھول بارش، اس کے پس پردہ محبت، بہت زیادہ خیال رکھنے والا، ایک ایک رنگ میں ڈھلا،

ناہید اسماعیل..... کراچی

پوچھنا یہ تھا کہ اپریل میں خواتین ڈائجسٹ کو چھیالیس سال ہو چکے ہیں اور ہماری معلومات بھی یہی ہیں کہ یہ سب سے پہلا ماہنامہ ہے جو صرف خواتین کے لیے شائع ہونا شروع ہوا لیکن ایک ڈائجسٹ کا بھی یہ کہنا ہے کہ ان کے ڈائجسٹ کو بھی اسی اپریل میں چھیالیس سال ہوئے ہیں جبکہ ہماری ایک آنٹی کہتی ہیں کہ یہ اعزاز صرف خواتین ڈائجسٹ کو ہی حاصل ہے۔

سب سے پہلے نمبروں تحریر ”محبت رب“ کا ذکر کریں گے پیرا کے موضوعات ہمیشہ ہی حیران کن ہوتے ہیں لیکن اس بار تو وہ ایسا موضوع لائیں جس نے ہمیں ساکت کر دیا، کتنی ہی دیر ہم سے کچھ اور پڑھا ہی نہ جاسکا۔ یہ تو تحریر کی شکل میں ایک آئینہ ہے جسے انہوں نے ہر فرد کے سامنے رکھ دیا ہے۔ لفظ، لفظ نہیں حرف، حرف جیسے دل پر نقش ہو گیا، بہت ہی زبردست..... ”حالم“ ہمیشہ کی طرح منفرد اور لا جواب، قانع کی یادداشت کا جانا ہمیں برداشت نہیں ہو رہا۔ پلیز

نمرہ نالیہ کو دکھ نہ دیجیے گا۔ ”دشت جنوں“ بھی بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ آمناب جلدی سے ایک ہنسی مسکراتی تحریر بھی لکھ ڈالیں۔ یہی فرمائش ہماری عفت سحر طاہر اور راشدہ رفعت سے بھی ہے۔ ”الف“ بھی اچھا لگ رہا ہے، دوسری ہی قسط میں کہانی واضح ہوتی نظر آئی ہے، اس پر ڈراما بھی بننے کا سنا ہے۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول ”بمال زہرا“ بہت اچھا لگا، لگتا ہے زہرا کے ساتھ بہت برا ہو چکا ہے۔ ”بے اماں مسافتیں“ گو موضوع نیا نہیں لیکن قرۃ العین نے کافی اچھا لکھا۔ نازیہ رزاق بہت پرانی رائٹر نہیں لیکن ابھی اچھا لکھنے والوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ عطیہ خالد نے ”مہمان“ میں رشتوں کی بے بسی کے ساتھ ساتھ مہمان نوازی کی برکتیں اجاگر کیں، مختصر کہتی ہیں اچھا کہتی ہیں۔ نورین زہرا کی تحریر بھی اچھی لگی وہی مرد کی ازنی خود غرضی اور عورت بے قصور ہوتے ہوئے بھی بے بس، صوفیہ کی بے بسی پر افسوس ہوا۔ قرۃ العین خرم ہاشمی نے ”برکت“ میں اچھا سبق دیا ان کا جملہ اچھا لگا۔ ”کثرت میں برکت ہو یہ ضروری نہیں ہوتا۔“ صدف کی سادہ سے انداز میں لکھی تحریر ”چشم مارو شن“ پسند آئی۔ اور جناب ہماری بہن انتظار کر رہی ہیں اپنی فرمائش کے پورا

آپ کی ہر ہر قدم پہ سپورٹ کرنے والا، آپ کے سونے جاگنے، کھانے پینے کا دھیان رکھنے والا، آپ کا ہر لاڈ، نخرہ، ہار سنگھار پورا کرنے والا، آپ کی خاطر سب کرنے والا سناٹھی۔ وہ کہاں ہے؟

ہم مڈل کلاس مائیں ان کی تعبیر اپنی معصوم بیٹیوں کو کیسے دیں۔

وہ ان رسالوں میں لکھے ہر ہر لفظ کا ہاتھ پکڑ کے سوتی ہیں اور خواب بھری آنکھوں سے جاگتی ہیں وہ سوچتی ہیں۔ ایک شہزادہ آئے گا۔ نہ جھیز لے گا نہ کچھ اور لے گا، بس مان، محبت، عزت کے ساتھ ہاتھ تھام کے لے جائے گا وہ اس خود غرض دنیا سے ہٹ کے ہوگا۔

یہ لفظ لفظ خواب دکھانے والی، لفظوں کو دل میں اتارنے والی، ماؤں کی نیندیں سکون برباد کرنے والی یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ خواب سراب ہوتے ہیں۔ غرض محبت کے لبادے میں لپٹی ہے۔ بظاہر محبت ہے مگر محبت کچھ لو اور کچھ دو ہے۔

اتنا جادو اثر لفظ لکھنے والی کیا خوبصورت دل بھی رکھتی ہیں یا بس صرف لفظوں کی نمائش کرتی رہتی ہیں؟ خوابوں کے اس سفر میں کچھ حاصل نہیں۔ یہ کیوں نہیں بتاتیں آپ؟

ہر لفظ کے اندر چھپے خوابوں خوشیوں کے راستے پر چلنے کی میری معصوم بیٹیوں کی شروعات ہے زندگی بد صورت بھی ہے۔ میں ان کو یہ بھی بتانہ پاؤں گی۔ اس سفر میں مات نہ ہو۔ آپ یہ دعا بھی کریں۔ ان خوابوں کی تعبیر میں آپ سب لکھنے والیوں کا حصہ ہے۔ آپ صرف لکھ کے بری نہیں ہیں۔

اگر کوئی میری بات اس کے پس منظر میں چھپی فکر سمجھ گیا تو ٹھیک ورنہ دماغ پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ بچیوں کے ہاتھ میں خوابوں کی لمبی لمبی فہرست مت دیں۔

ج: پیاری سلٹی، ہم آپ کی بات بھی سمجھ گئے اور اس میں چھپی فکر کو بھی۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ ہمارے پرچے میں شائع ہونے والی تحریروں کو نہیں سمجھ سکیں۔ ہم نے صرف خواب نہیں دکھائے۔

خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے محنت اور کوشش کا سبق بھی دیا۔ ہم نے زندگی میں مصروف محبت، خیال رکھنے والا، ہار سنگھار، لاڈ نخر اٹھانے والا سناٹھی نہیں دکھایا، یہ بھی بتایا ہے کہ اس سے الٹ لوگ بھی نصیب بن سکتے ہیں۔ اور ایسے میں صرف صبر و تحمل، وفا شعاری اور نیک دلی کو زاد راہ بنا کر زندگی کی منازل طے کی جاتی ہیں۔ ہماری مصنفین بہت خوب صورت دل رکھتی ہیں وہ حقیقت کو خوش نما الفاظ کے لباس میں ضرور بیان کرتی ہیں لیکن اس کے پس پردہ سفاک حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ اور صرف محبت ہی نہیں بیان کرتیں معاشرے کی خود کو غرضی، محبت کے پیچھے چھپی غرض بھی آشکار کرتی ہیں۔

اگر ہم صرف زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کریں گے تو آپ کی بچیاں پر چا پڑھنا ہی چھوڑ دیں گی۔ وہ ناامید ہو کر مکمل کا راستہ ترک کر دیں گی۔ اور مایوسی کے اندھیروں میں گم ہو جائیں گی۔ اپنی بچیوں کو بتائیں کہ زندگی میں تلخ حقیقتوں کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی ہیں۔ زندگی میں جہاں دکھ ہیں وہاں خوشی بھی ہے۔ محبت کے ساتھ ساتھ خود غرضی اور نفرت بھی ہے۔ زندگی صرف آسائشیں ہی نہیں تنگی ترشی بھی ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے اور ہمیں زندگی کو ان تمام سچائیوں کے ساتھ قبول کرنا ہے۔

آپ کی بچیوں کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو۔

ماہا بشیر..... ڈنگہ

میرا خواتین میں پہلا خط ہے۔ ساری رائٹرز کمال کا لکھتی ہیں۔ نمرہ احمد، عمیرہ احمد، سائرہ رضا، ایمل رضا، سمیرا حمید، فرزانه کھرل، عفت سحر طاہر، مصباح علی سید، فاخرہ حبیب، نایاب جیلانی، عطیہ خالد، شازیہ الطاف آپ سب کی کہانیاں ہمارے لیے مشتعل راہ ہیں خواتین کو مزید نئی رائٹرز کو متعارف کروانا چاہیے۔ نئے طریقے، نئے

آئیڈیاز سے لکھنے والی۔ پلیز ماہا ملک اور میمونہ خورشید سے کہیے کہ دوبارہ لکھیں۔ فائزہ افتخار کو بھی واپس لے آئیں۔ نمرہ احمد کا ”حالم“ زبردست ناول ہے۔ اگر ہمیں کچھ ناول منگوانے ہوں تو ہم کس طرح منگوائیں

اور ٹائل اسی طرح مکمل دیا کریں، زبردست۔

ج: پیاری ماہا! آپ نے صرف اس ڈر سے اتنا عرصہ خط نہیں لکھا کہ خط شائع نہیں ہوگا۔ خط شائع نہ بھی ہوتا تو یہ کیا کم ہے کہ ہم آپ کے خیالات جان لیتے۔
خواتین کی مصنفین تک آپ کی پسندیدگی پہنچا رہے ہیں۔

ناول منگوانے کے لیے آپ درج ذیل نمبر پر فون کر کے ضروری معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔

021-32735021

تبسم حسین..... ڈنگہ

شعاع، خواتین، کرن سے ہمیں کتنا پیار ہے، یہ آپ نہیں جانتی ہیں۔ بہاروں سے ٹائل نے دل جیت لیا۔ (کہنی سننی) ہمیشہ کی طرح خوب صورت الفاظ۔ (کرن کرن روشنی) بہت پیارا سلسلہ۔ یا سر عالم سے مل کر اچھا لگا۔ عمران عباس، فیروز خان اور دانش تیمور کا انٹرویو پلیرز۔ ڈاکٹر نسیم کا انٹرویو کافی مختلف رہا، بہت مزا آیا ان سے مل کر۔ ”الف“ کی دوسری قسط بھی لا جواب رہی۔ ”دشت جنوں“ ناول کا اختتام مبارک ہو آمنہ کو۔ اب آمنہ باجی ہمارے لیے ایک اور ناول لکھیں جلدی سے، مکمل ناول میں۔ جمال زہرہ، سائرہ رضا، دیکھ کر دل خوش ہو گیا، پہلی قسط زبردست رہی، جو کافی لا جواب ہے۔ ”تیرا عہد فراق“ زبردست رہا۔ نازیہ رزاق ایک نئی رائٹر کو متعارف کروا رہے ہیں آپ۔ ”بے اماں مسافتیں“ قرۃ العین نے بھی کافی عمدہ لکھا۔ افسانوں میں سمیرا حمید کو دیکھ کر اچھا لگا۔

ج: جی تبسم! آپ جس سلسلے میں چاہیں، لکھیں۔ ضرور شائع ہوں گے۔ خواتین اور شعاع کے سلسلے ہم نے اپنی قارئین کی شرکت کے لیے شروع کیے ہیں۔ آپ ان سلسلوں میں شرکت کے لیے اپنا انتخاب لکھ کر بھجوا دیں۔ خواتین کا پچھلا شمارہ آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

روبی عامر..... پورے والا

تبسم کا شمارہ ہاتھ آیا تو اگست کا شمارہ بھی یاد آ گیا جو کہ مہمان، عید اور مہمانوں کی مصروفیات میں الماری میں بھی پڑا رہ گیا۔ مہمان تو خیر ابھی بھی آ جا رہے ہیں لیکن ساتھ کچھ فرصت بھی مل گئی ہے، اس لیے دونوں شمارے ایک ساتھ ہی پڑھ ڈالے۔ ”الف“ کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں، شان داؤد لا جواب تحریر۔ قلب مومن نام ہی پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ کامیاب وکیل نے دل بہت اداس کیا۔ ”کہنی سننی“ کاش عوام سارا کام حکومت پر ڈالنے کے بجائے خود بھی کچھ کرنا سیکھ لے تو کافی حد تک ذمہ داری کا احساس ہو جائے۔ ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات پسند آئی۔ کرن کرن روشنی میں وارث اور وصیت دل پر گہرا اثر چھوڑ گئے۔

ج: پیاری روبی! جو لوگ دل میں بستے ہوں، ان کے لیے وقت اور فاصلے اہمیت نہیں رکھتے۔ ہماری قارئین ہمارے دل سے بہت قریب ہیں۔ بارہ، چودہ سال آپ نے بے شک خط نہیں لکھا لیکن ہمارے پرچے پڑھتی رہیں، یعنی ہمارا اور آپ کا تعلق برقرار رہا نا۔ ہمارے لیے یہ ہی بہت بڑی بات ہے۔

اس بار آپ کے خط میں مزا نہیں آیا، آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

مقدس مغل..... لاہور

میں اٹھارہ سال سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ جس ناول نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے، وہ ہے ”بن پاکھی“ بہت زبردست ناول تھا۔ بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ نمرہ احمد میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ عمیرہ احمد تو لا جواب ہیں، پلیئر فائزہ افتخار کو واپس لائیں۔ عنیزہ سید، تنزیلہ ریاض، نبیلہ ابرار جہ، نگہت سیما سب کدھر غائب ہیں۔ ”الف“ ناول میں قلب مومن بہت زیادہ متکبر ہے۔ عمیرہ جی آپ کے سب ہی ناولز کتابی شکل میں میرے پاس رکھے ہیں۔ شکر ہے کہ ”دشت جنوں“ کی آخری قسط تھی۔ آپ سائرہ رضا اتنا

طویل ناول لکھتی ہیں، پلیئر انہیں کہیں کہ ایک بات کو بار

دیتے ہیں۔

آمد ریاض اور عمیرہ احمد نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

پری و ہش بلوچ، دل و ہش بلوچ،

مہر و ہش بلوچ..... کوہلو، بلوچستان

ہم تینوں کے علاوہ ہماری بڑی بہنیں بھی خواتین

ڈائجسٹ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ امی اس زمانے میں

باجیوں کو خواتین اور شعاع پڑھنے سے روکتی تھیں تو وہ

بے چاریاں چھپ چھپ کر کبھی ہاتھ روم تو کبھی اسٹوریٹ

میں پڑھا کرتی تھیں ایک دفعہ باجی خواتین پڑھ رہی تھیں،

اتفاقاً بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو باجی نے جلدی

سے ہنگر پر لٹکا تولیہ اٹھا کر اس کے نیچے ڈائجسٹ چھپا دیا

تو بھائی نے بھانپ لیا کہ باجی نے کچھ چھپایا ہے لہذا

نے فوراً کمرے سے اٹھ کر روم میں ہاتھ دھوئے اور

بھانے سے تولیہ اٹھالیا۔ اس کے نیچے سے ڈائجسٹ

برآمد ہوا۔ بھائی نے اور باجی سے کہا کہ ”یہ مجھ سے چھپا

رہی تھیں، یہ تو میں تمہیں خود لا دوں گا“ اس کے بعد سے

ڈائجسٹ بھائی خود لادیتے ہیں کیونکہ ضلع بھر میں

ڈائجسٹس صرف بھائی کی دکان میں ہیں اور اب تو امی بھی

ہم سے کہانیاں سنتی ہیں اور افسانے پڑھتی ہیں لیکن جب

تک امی سرورق پر ماڈل گرل کی تصویر پھاڑ نہ ڈالیں، ان

کا ناشتا ہضم نہیں ہوتا۔ پری و ہش میری بیاض سے خاص

لطف اٹھاتی ہے۔ خیر اب چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔

صحاح ستہ کی خوب صورت احادیث ہماری رہنمائی کرتی

ہیں۔ ادارے سے گزارش کہ خواتین میں سلسلے وار اور

مکمل ٹائمرز کی تعداد بڑھادیں عدنان بھائی کے مخلصانہ

مشورے دل کو چھو لیتے ہیں۔ قارئین کے مسائل بھی ان

ہی مشوروں سے حل ہو جاتے ہیں۔ شاہین آ پا! پلیز سچی

خان کا انٹرویو لیں، اپنا تو دیتی نہیں ہیں۔

☆ پری! دل اور مہر! جتنے پیارے آپ کے نام

ہیں۔ اتنا ہی پیار بھرا خط آپ نے لکھا ہے۔ آپ کے

بھائی واقعی بہت اچھے ہیں ورنہ ہمارے پاس تو ایسے خط

بار مت دہرایا کریں۔ احادیث والے صفحات

بڑھادیں، بلکہ پورا ڈائجسٹ ہی طویل کر دیں۔ آپ

مجھے آپ کے جوابات بہت اچھے لگتے ہیں۔ رائٹرز کی

انٹرویو بھی شائع کیا کریں۔

ہلا پیاری مقدس! نفسیاتی اور ازدواجی الجھنیں

اور خبروں و بروں کا سلسلہ لیکن یہ دونوں سلسلے ہماری بیشتر

قارئین بہت پسند کرتی ہیں۔ ”سیدھی سڑک“ سمیرا حمید کا

نہیں سائرہ رضا کا ناول تھا۔

شاز یہ چوہدری کو زندگی مہلت نہ دی وہ اپنا ناول

مکمل نہ کر سکیں، اب کسی اور مصنف کے لیے اس ناول کو

مکمل کرنا مشکل ہوگا۔

نگہت سیما اور دیگر مصنفین تک آپ کا پیغام ان

سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آپ کی بیٹی کی بیماری کا جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ

تعالیٰ اسے صحت عطا فرمائے، آمین۔

روبینہ منظور..... رحمان پورہ، ضلع سیالکوٹ

خواتین میں پچھلے اٹھارہ سال سے پڑھ رہی

ہوں۔ اس کے سارے ہی سلسلے مزے دار ہیں۔ خواتین

نے مجھے زندگی میں بہت راہنمائی فراہم کی۔ دراصل

2007ء میں شادی ہوئی اور پھر ماشاء اللہ میرے چار

بچے۔ ایک بیٹی، تین بیٹے اور پھر گورنمنٹ جاب۔ زندگی

کے ان بھرپور سالوں نے خواتین سے کچھ فاصلہ پیدا

کر دیا جس کی وجہ سے میں کچھ اچھی تحریروں سے محروم

رہی۔ عمیرہ احمد کا ناول ”الف“ بہت زبردست ہے۔

مصنفہ کا نام دیکھ کر ہی ہمیں ان کی تحریر سے محبت ہو جاتی

ہے۔ عمیرہ احمد کی تصویر اور مکمل انٹرویو خواتین میں شائع

کریں۔ رفعت سراج اور آمد ریاض کے بارے میں بھی

کچھ معلومات مہیا کریں۔

ج: پیاری روبینہ! ایک طویل رفاقت میں آپ

نے پہلی بار خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا، بہت خوشی

ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ زندگی کی مصروفیات مہلت نہیں دیتیں

لیکن کبھی کبھی تو ان لوگوں کو یاد کر لیا کریں جو دل کے

قریب ہوتے ہیں۔ آپ کے خط ہمیں ہمت اور حوصلہ

یقین نہیں آتا اور لڑکی بھی تالیہ جیسی۔ وکیل افسانہ پڑھ کر مجھے لگا جیسے یہ واقعی کوئی کچی کہانی ہے۔ سائرہ رضا کا نام پڑھ کر جب ناول تک پہنچے تو پتا چلا کہ یہ تو قسط وار ناول ہے پھر تو مزہ ہی آ گیا ہے۔

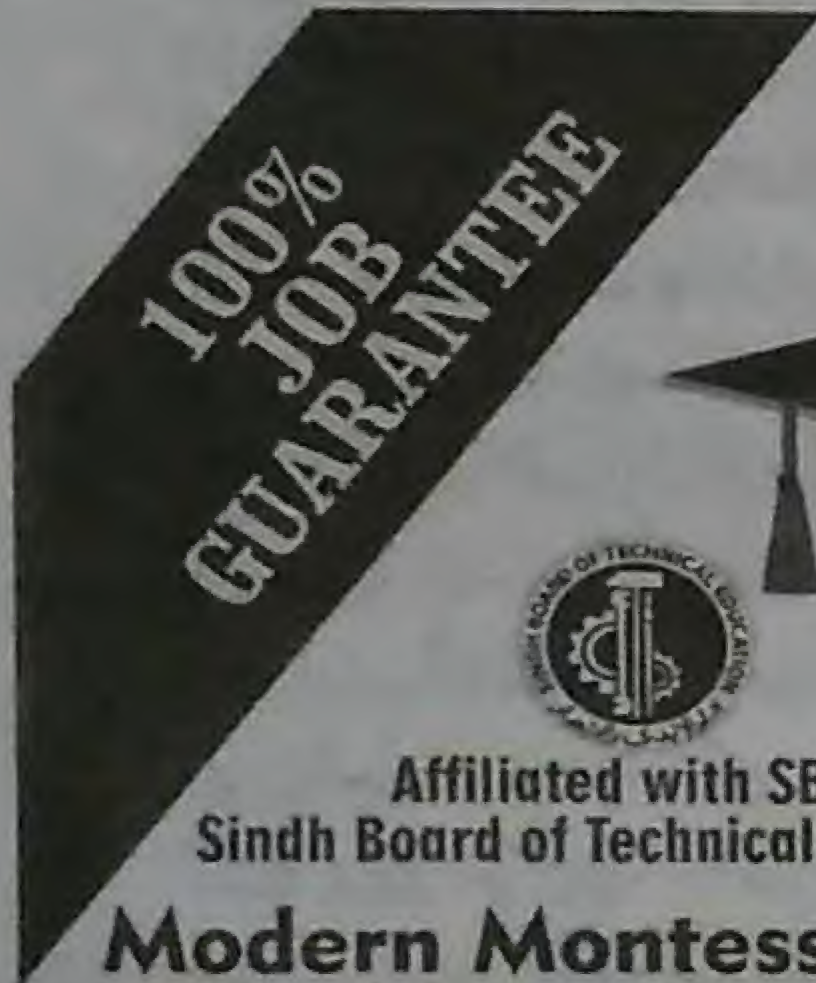
☆ پیاری ماہم! صرف محبت میں تو واقعی کوئی لڑکی نہیں بدل سکتی کیونکہ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی لیکن جو لوگ اچھی اور نیک فطرت کے مالک ہوتے ہیں اور حالات کے تحت غلط راستے پر نکل جاتے ہیں، وہ بدل سکتے ہیں۔ تالیہ دل کی بری نہیں تھی، حالات نے اسے چور بنادیا تھا اس لیے وہ صحیح راستے پر لوٹ آئی۔ آئے کت کو بالکل صحیح سزا ملی۔ آپ تصور کریں اس نے اپنے محبت کرنے والے شوہر کو جس نے اس کی خاطر اپنے والدین کو ناراض کر دیا اس شوہر کو نفسیاتی مریض بنایا پھر الماری میں بند کر کے مار دیا۔

مسرت الطاف احمد..... کراچی

بھی آتے ہیں کہ بھائیوں نے یا والد صاحب نے پرچا پھاڑ دیا یا چولہے پر رکھ دیا۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ پروف کی غلطیاں نہ ہوں، اب مزید خیال رکھیں گے۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ماہم حمید..... میرپور خاص

”دشت جنوں“ کیا کہوں اس کے بارے میں۔ پہلی قسط سے آخری قسط تک سسپنس بنا کر رکھا اس کہانی میں آمنہ جی نے۔ آئے کت نے جو کیا اس کی سزا اس کو بہت بھیا نک ملی اور شاید اس کی غلطی سے بڑی بھی اور شکر ہے خوش نصیب کو بھی آخر کار خوشیاں مل ہی گئیں۔ ”حالم“ پڑھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وقت کے مسافروں کے ساتھ ہم بھی وقت میں پیچھے کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ کوئی لڑکی محبت میں اتنا بدل بھی سکتی ہے،



Affiliated with SBTE
Sindh Board of Technical Education

Modern Montessori Training
is ideal for all females including
Mothers, Teachers, &
Coordinators.
Internationally Recognised

mmt
MODERN
MONTESSORI
TRAINING

A-217, block 13-C, Gulshan-e-Iqbal,
behind KFC & Bank Islami Karachi. Tel 34988847, 34964099
Email: admin.khi@nce.com.pk - Website: www.nce.com.pk

دل سے ممنون ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ کی ہر قاری سے اپنائیت کا ایک رشتہ جڑ جاتا ہے، جیسے آپ سے اور دیگر قارئین سے۔

ج: جی مسرت! صبح لکھا آپ نے جو قارئین ہمارے

شرکت کرتی ہیں، ان سے واقعی ایک انسیت اور لگاؤ کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے اور وہ محفل میں نہ ہوں تو ان کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان قارئین میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ آپ کا تبصرہ ہم بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں۔ تازہ رزاق کی تحریر میں جس کمزوری کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ ہمیں بھی محسوس ہوئی تھی لیکن کہانی اچھے طریقے سے لکھی گئی تھی۔ اس لیے ہم نے اسے شامل کیا۔

سارہ رضا کی کہانی کے بارے میں آپ کے اندازے کافی حد تک درست ہیں۔

راشدہ دلبر، زینب نور..... جہانیاں

ہم سب بہنیں رسالے پڑھنے کی شوقین ہیں مگر پڑھنے پر پابندی ہے۔ امی، ابو کو اگر رسالے نظر آ جائیں تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم جہانیاں کے قریبی گاؤں میں رہائش پذیر ہیں تقریباً پورے گاؤں کی خواتین ہی رسالے پڑھنے کو معیوب سمجھتی ہیں۔ آپ کی شادی سے پہلے پرچا منگوانا کو وہاں کو سر کرنے کے مترادف ہوتا تھا۔ مگر شکر گزار ہیں ہم اپنے بڑے بہنوئی کے..... کردہ ہمیں امی سے چھپ کر پڑھا لیتے ہیں۔ سلسلہ دارناول میں ”حالم“ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، فٹناسٹک۔ عمیرہ احمد کا نام دیکھ کر جو خوشی ہوئی، وہ الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ مکمل ناول ”نسخہ ہائے وفا“ اچھی تھی۔ فاخرہ جمین نے ہمیشہ کی طرح دل خوش کر دیا۔

ج: راشدہ اور زینب ہمیں خوشی ہے گاؤں کے ماحول اور گھر میں پابندی کے باوجود آپ نے تعلیم

حاصل کی اور خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ آپ اپنی امی کو ہمارے پرچوں کی کہانیاں پڑھ کر سنائیں، اپنے والد کو احادیث کے سلسلہ کے بارے میں بتائیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا شمار ہاتھ میں آتے ہی کلرفل ہائیکل دل کو بھا گیا۔ ”الف“ عمیرہ احمد کے کردار کافی منفرد اور انٹریٹنگ ہوتے ہیں جیسے قلب مومن کا کردار

کافی انٹریٹنگ، تجسس سے بھرپور اور منفرد دکھایا گیا ہے۔

قلب مومن کا ماضی اس کے حال سے کافی ڈفرنٹ ہے۔

مومنہ کی بے بسی پر بہت افسوس ہوا۔ ”حالم“ میں اب

فاتح پر بہت غصہ آنے لگا ہے، بہت ایٹی ٹیوڈ ہے اس

میں۔ فاتح اور تالیہ کی جوڑی بالکل پسند نہیں آ رہی ہے۔

فاتح میرڈ ہے۔ ”دشت جنوں“ آخری قسط آؤٹ

اسٹینڈنگ اور سپرڈو پڑھی، اس تحریر نے پہلی قسط سے لے

کر آخری قسط تک اپنے حصار میں قید رکھا۔ یہ تحریر برسوں

ہمارے ذہنوں پر حاوی رہے گی۔ آئے کت اپنے انجام

کو پہنچ گئی، معاویہ نے جیسے کو تیسائی کیا اور منفراسب

سے پیارا اور میرا مومن فورٹ کردار، معاویہ کی زندگی

میں روشنی بن کر آئی اور خوشیوں کا باعث بنی۔ ڈیئر آمنہ

جی ایو آر ٹو گنڈ! جمال زہرا کیا سارہ۔ جی دل دہلا دینی

والی اسٹوری، زہرا پر جی بھر کر ترس آیا۔ فخر کی بھی دال

نہیں مکنے والی، کرم مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دے گا البتہ

عاشق کے کچھ زیادہ ہی چانسز ہیں، وہ بہت ہی ہوشیاری

سے گیم کھیل رہا ہے۔ ”تیرا عہد فراق“ کافی ٹائکس

اسٹوری تھی، تاہم نور کی سائیکو والی آکر کچھ خاص پسند نہیں

آئی، اپنے والدین کے گھر تو شادی سے پہلے بھی بلی بنی

رہی اور اب شادی کے بعد معاذ کے سامنے بغیر کسی ٹھوس

وجہ کی ضد، سمجھ سے بالاتر تھی۔ معاذ کا کردار اچھا تھا۔

”بے اماں مسافیتیں“ راشدہ چچی کا غصہ، ہر وقت

شور و غل، طنز اور چیخ چیخ کرنا کچھ اور لگا۔ آخر کا سین بھی

کافی فلمی سا لگا لیکن اس ساری پچویشن میں ارمان کی

ثابت قدمی پسند آئی، علینہ کا کردار بھی اچھا تھا۔ افسانوں

میں نمبر ون سمیرا حمید کا افسانہ ”محبت رب“ بہت ہی

یونیک اور دلچسپی سے بھرپور رہا۔ تحریر دل میں اترتی ہوئی

محسوس ہوئی، بہت ہی سبق آموز اور متاثر کن تحریر تھی،

مسز انز کر دینے والی۔ ”برکت“ اور ”چشم ماروٹن“ قابل

تعریف تحریریں تھیں۔ ڈیئر نگبہ اکرم آپ کی اپنائیت کی تہ

ہمیں یقین ہے کہ پھر وہ آپ کو مع نہیں کریں گے بلکہ خود پر چالا کر دیں گے۔

مریم فرید.....

جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ نمرہ احمد کا ناول ہے۔ ایک بات انتہائی عجیب سی لگی، تالیہ جب وقت کا دروازہ پار کر کے آئی تھی، ملا کہ میں چار دن گزرے تھے جب کہ اس دنیا میں کتنے سال گزر گئے لیکن وہاں چند ماہ گزار کر آئی ہے تو صرف اس دنیا میں ایک سیکنڈ گزرا ہے۔ جہاں تک وقت کے تصور کا تعلق ہے یہ شعور کی روتو ”قرۃ العین حیدر“ کے ناولوں میں ملتی ہے۔ وقت کی قید کے ساتھ ساتھ تاریخ کا سفر یعنی پرانی تاریخ کو بیان کرنا۔

ج: پیاری مریم! وقت کی قید سے آزاد ہونے کا تصور بہت پرانا ہے اور یہ صوفیائے کرام کی حکایتوں میں اکثر ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جس طرح وقت اور تاریخ کو پیش کیا ہے، وہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے کردار تاریخ کے مختلف ادوار میں سفر کرتے زمانہ حال تک پہنچتے ہیں لیکن وہ نئے رنگ میں ہوتے ہیں اور ماضی سے ان کا شعوری تعلق برقرار نہیں رہتا۔ ان کے مشہور ناول ”آگ کا دریا“ میں یہ تکنیک نظر آتی ہے جب کہ نمرہ احمد کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ان کے کردار زمانہ حال سے پیچھے کی جانب سفر کر کے واپس زمانہ حال میں لوٹے ہیں اور انہیں ماضی کا یہ سفر یاد بھی ہے۔

ہاجرہ عمران خان..... لاہور

ستمبر کا شمارہ کمال کر گیا۔ بے اختیار دل چاہا، قلم اٹھاؤں اور اپنے جذبات سے ادارے کو آگاہ کروں۔ اس بار کہانیوں کے چناؤ نے ہمیں خوشی سے نہال کر دیا۔ کرن کرن روشنی میں صدقہ کے بعد وصیت پر جامع اور مفصل معلومات حاصل ہوئیں۔ اور وہ بھی قرآن پاک اور مستند احادیث کے ذریعے، جزاک اللہ۔ سب۔

پہلے بات کروں گی نمرہ احمد کے ”حالم“ کی۔ کہانی اپنا ججس اور دلچسپی بنائے ہوئی ہے۔ آمنہ ریاض کا ”دشت جنوں“ آخری قسط میں بہت خوبی سے پورے ناول کو وائنڈ اپ کیا گیا۔ آمنہ جی آپ کے لیے بہت دادا۔ اب باری آتی ہے میری پیاری عمیرہ احمد کی۔ عمیرہ! آپ وہ ہیں، جو دیے سے دیا جلا کر روشنی بڑھاتی چلی جا رہی ہیں۔ ”الف“ یقیناً آپ کی ایسی ہی کاوش ہے۔ ڈائجسٹ کی اپنے قارئین کے لیے ایک بہترین کاوش ہے۔ سمیرا حمید نے ”محبت رب“ سمیرا ایک اور خوب

صورت افسانہ تراشنے پر بہت مبارک باد۔ عطیہ خالد کے مہمان کی بہت زیادہ تعریف۔ ”کامیاب وکیل“ سے دل دکھ گیا۔ صدف کا ”چشم مارو شن“ دل — زبان و انداز، اسلوب میں سب کچھ بہترین، مگر انجام تھوڑا جلدی معلوم ہوا۔ تو جناب اب باری آتی ہے ”برکت“ کی قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ ستمبر خواتین کی ایک اور عمدہ پیش کش۔ نازیہ رزاق کا ”تیرا عہد فراق“ دل کو خوب بھایا۔ ماں باپ کے الفاظ تو بیٹیوں کے نصیب لکھ رہے ہوتے ہیں، بہت خوب صورت اور حقیقی جملہ۔ قرۃ العین سکندر کے بے اماں خوب رہا۔

ج: پیاری ہاجرہ! آپ نے جو تحریر بھیجی ہے، وہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ ہم انشائیہ شائع نہیں کرتے بلاشبہ آپ میں بہت صلاحیت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ آپ اس طرح کی کہانی لکھ کر بھجوائیں جیسی ہمارے پرچوں میں شائع ہوتی ہیں۔ آپ کا مفصل تبصرہ بہت اچھا لگا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل جس ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تقابیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

عمیرہ احمد

کلمے

حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے۔

ایک بچہ تو اتر سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا منتظر ہے، ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ یک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے گرد روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ مومنہ سلطان ایک باصلاحیت فنکارہ ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں ملا ہے۔ انڈسٹری میں ہیروئین اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومنہ کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت بڑا



مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومن کی ماں شریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ اب انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومن کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گرد سے جواب دے چکے ہیں۔ وہ ڈانکا اس کے پاس ہے۔ گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومن فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

قلب مومن نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داد مومن کی سفارش کرتا ہے۔ وہ آڈیشن کے لیے قلب مومن کے پاس جاتی ہے۔ قلب مومن اس کا دوپٹا تارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومن انکار کر دیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔ مومن باہر نکل جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیسٹوں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومن اس کے ساتھ بہت جگہ آمیز انداز میں پیش آتا ہے جو اب مومن بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کھری کھری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام چپ اور تم اس سے زیادہ چپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

طاہر عبدالاعلیٰ اپنے باپ کو خط لکھتا ہے اور اس میں معذرت کے ساتھ اپنی تکلیف بھی بیان کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ طاہر کو معاف کریں گے تو ہی اللہ اسے معاف کرے گا۔

قلب مومن کو اس کی ماں ایک خط دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خط اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ خط پڑھنے پر اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خط اللہ نے نہیں اس کے دادا عبدالاعلیٰ نے لکھا ہے وہ اس سے ملنے آرہے ہیں۔

احسن جہاں کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر بھی واپس آ رہا ہے تو وہ خوب سختی سنورتی ہے اور بے تحاشا خوش ہوتی ہے۔ قلب مومن اپنی ماں کو اس طرح دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور ماں سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے۔

مومن کو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ اسے عقل کرنی چاہیے تھی اور یوں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جہانگیر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور سپر اسٹار بنے گی۔ جبکہ مومن اداکارہ نہیں بننا چاہتی۔ اسے خطاطی سے دلچسپی ہے۔

مومن اپنی انا کو مار کر اپنی دوست سے کہتی ہے کہ وہ ایک بار پھر داد سے بات کر لے۔ شاید قلب مومن اسے مومن دے دے، جہانگیر کی دن بدن بگڑتی حالت اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ قلب مومن سے کام مانگے۔

جبکہ دوسری جانب مومن نیہا کو پروپوز کرتا ہے اور ایک بے حد قیمتی انگلیشی اسے پہناتا ہے۔ قلب مومن کے گھر ہونے والی ایک اور پارٹی میں پوری انڈسٹری مدعو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک ملازم کسی نئے مہمان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جسے دیکھ کر

قلب مومن ساکت رہ جاتا ہے۔ اب آگے پڑھیے۔

تیسری قسط

”میرے پیارے اللہ!

آپ کیسے ہیں؟

میرا نام قلب مومن ہے۔ میری عمر آٹھ سال ہے اور میں اپنی مٹی کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں نا کیونکہ آپ نے مجھے پیدا کیا۔ لیکن میں پھر بھی آپ کو اپنی ایک تصویر بھیج رہا ہوں تاکہ میں آپ کو یاد آ جاؤں۔

آپ نے اتنے بہت سارے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ مجھے بھول گئے ہوں حالانکہ میں کہتی

ہیں۔ ہم تو اللہ کو بھول سکتے ہیں، لیکن اللہ ہمیں کبھی نہیں بھولتا۔
 آپ کو بہت سارے لوگ خط لکھتے ہوں گے..... میں سوچتا ہوں آپ اتنے سارے خط کیسے پڑھتے ہوں گے..... پر مئی کہتی ہیں آپ اپنا ہر خط پڑھتے ہیں..... وہ بھی خود.....
 مجھے یہ نہیں پتا کہ آپ کہاں رہتے ہیں لیکن مئی کہتی ہیں آپ وہاں رہتے ہیں جہاں کوئی نہیں رہتا.....
 آسمان پر..... میں تو آسمان تک نہیں جاسکتا لیکن آپ کو خط یہاں سے بھیج رہا ہوں کیونکہ آپ تو اپنی ڈاک ہر جگہ سے لے لیتے ہیں..... یہ بھی مجھے مئی نے ہی بتایا۔
 میرا خط جلدی سے پڑھ لیں اور پھر مجھے خط کا جواب بھیجیں۔ مجھے آپ سے ایک کام ہے..... اور یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ آپ میرے خط کا جواب بھیجیں گے تو پھر اگلے خط میں آپ کو وہ کام بتاؤں گا۔
 میں نے خط پر (ارجنٹ) بھی لکھا ہے تاکہ آپ خط جلدی سے پڑھ لیں لیکن مئی کہتی ہیں، ہر کام صبر سے کرنا چاہیے کیونکہ صبر کرنا نیکی ہے، میں بھی صبر سے آپ کے خط کا انتظار کروں گا، تاکہ ایک نیکی بھی کر لوں کیونکہ مئی نے مجھے بتایا ہے، آپ کو نیکیاں اچھی لگتی ہیں۔ مجھے بھی اچھی لگتی ہیں۔
 میرے پاس ایک ڈائری ہے جس میں، میں ہر روز اپنی ہر نیکی لکھتا ہوں..... اور اُسی ڈائری میں اپنے گناہ بھی لکھتا ہوں۔

مئی کہتی ہیں۔ اس طرح کرنے سے مجھے یاد رہے گا کہ میں ہر روز اچھے کام زیادہ کرتا ہوں کہ بُرے کام۔
 میں روز رات کو اپنی ڈائری چیک کرتا ہوں اور اگر بُرے کام زیادہ کیے ہوں تو پریشان ہوتا ہوں۔
 مئی کہتی ہیں اگر میں توبہ کر لیا کروں تو میرے بُرے کام اور گناہ غائب ہو جائیں گے۔
 میں ہر روز ایسا ہی کرتا ہوں۔ توبہ کر کے سوتا ہوں تو صبح میری ڈائری خالی ہوتی ہے۔ مئی کہتی ہیں وہ آپ کے کہنے پر رہے میرے سارے گناہ مٹا دیتی ہیں۔
 تھینک یو فار دیٹ۔

آپ بہت اچھے ہیں۔ اب آپ تھک گئے ہوں گے۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔ آپ آرام کریں، میں بھی سونے جا رہا ہوں۔

آپ کا قلب مومن!“

☆☆☆

دروازے کے باہر جو شخص کھڑا تھا اُسے مومن نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر کبھی دیکھا بھی تھا تو اپنے باپ کی دکھائی ہوئی کسی تصویر میں اُس کا چہرہ اور اس کے سر داڑھی کے بال ایک جیسے سفید تھے۔ بہت ہلکی داڑھی، بہت گھنے سر کے بال اور بڑھا پے میں بھی ہیرے کی کئی جیسی چمکتی خوب صورت شہد رنگ آنکھیں جو قلب مومن پر جمی تھیں۔ کسی مقناطیس کی طرح۔

”قلب مومن؟“ قلب مومن نے اُس دراز قد بوڑھے آدمی کی زبان سے اپنا نام سنا، ایک اشتیاق بھرے لہجے میں..... لیکن اُس نے جواب دینے کے بجائے اُس بوڑھے آدمی کے عقب میں اپنے باپ کے وجود کو کھوجنے کی کوشش کی۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف وہی بوڑھا شخص تھا اور اُس کا ایک بیگ۔ قلب مومن نے بے اختیار پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اور آنکھوں میں اُسے وہی مایوسی نظر آئی جو اُس کے اپنے چہرے اور آنکھوں میں تھی۔
 ”مومن! تمہارے دادا.....“ اُس نے ماں کو بالآخر کچھ بولتے سنا۔ وہ اب اُس کا ہاتھ پکڑے اُس شخص کی

طرف بڑھا رہی تھی۔ مومن نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا پھر سامنے کھڑے اُس شخص کو جواب بچوں کے بل اُس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے، اُسے دیکھتے ہوئے۔

”میرے بابا کہاں ہیں؟“ اُس نے اُس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھا تھا۔

”وہ میرے پاس نہیں ہے۔“ مومن کے سوال کا جواب اُس نے مومن کو نہیں دیا۔ اُس کے عقب میں

کھڑی حسن جہاں کو دیا تھا۔

”وہ میرے پاس کبھی نہیں آیا.....“ اُس نے اس بار وہ جملہ قلب مومن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ قلب مومن کو لگا اُس کے پیچھے کھڑی حسن جہاں پیچھے ہٹی ہے، بے اختیار گردن موڑ کر اُس نے ماں کو دیکھا۔ وہ واقعی اب اُس کے پیچھے نہیں تھی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے پشت لگائے کھڑی تھی، یوں جیسے اپنے آپ کو سہارا دے رہی ہو۔ مومن نے پلٹ کر اُس بوڑھے شخص کی آنکھوں میں بھرا آنے والے پانی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ کیوں رو رہا تھا اُسے خود سے لپٹا کر..... کیوں.....

اُس کے سینے سے لگے، اُس کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کی نمی کو اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے بھی مومن کو بے تاب کرنے والا واحد خیال اور احساس ماں کا تھا۔ عبدالعلی سے ملنے والا پہلا لمس اُس نے ”محسوس“ ہی نہیں کیا تھا۔

”ڈیڑھ سال ہونے والا ہے اُسے مجھے اور مومن کو چھوڑ کر گئے..... آپ کہتے ہیں، وہ آپ کے پاس نہیں آیا..... پھر وہ کہاں گیا؟“

اُس نے عبدالعلی کے ساتھ اندر کمرے میں آنے کے بعد حسن جہاں کے منہ سے یہ پہلا جملہ سنا۔ اُس نے یہ جملہ عبدالعلی سے کہا تھا پھر اچانک اُسے مومن کا خیال آیا اور اُس نے مومن کو وہاں سے جانے کے لیے کہا۔

”مومن! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اُس نے ماں کی تھکمانہ آواز سنی اور ایک لفظ کہے بغیر وہ وہاں سے اندر کمرے میں آ گیا، مگر دروازے کی جھری کو بند کیے بغیر وہ اُس کمرے میں جھانکتا رہا۔ جہاں عبدالعلی اور حسن جہاں کھڑے تھے۔ وہ دونوں اس وقت اُسے ایک راز کی طرح لگ رہے تھے..... ایک معمہ..... جسے وہ حل کر کے اپنے باپ تک پہنچنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے چپ تھے۔

”آپ بیٹھیں۔“ اُس نے حسن جہاں کو کہتے سنا اور عبدالعلی کو ایک کرسی پر بیٹھتے دیکھا، وہ دیواروں پر لگی طے کی بنائی ہوئی خطاطی دیکھ رہا تھا۔

”آپ کہتے ہیں، وہ آپ کے پاس نہیں آیا پھر وہ کہاں آ گیا؟“ اُس نے بالآخر حسن جہاں کو بولتے دیکھا۔ وہ آگے آئی اور عبدالعلی کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی اُس نے عبدالعلی کے پاؤں کو چھو کر روتے ہوئے کہا۔

”اب بس..... جو بھی سزا ہے..... کاٹ لی میں نے..... اس سے کہیں، معاف کر دے مجھے.....“

دروازے کی جھری سے اندر جھانکتے قلب مومن کا وجود پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اُسے ماں کا کسی کے سامنے جھکنا اچھا نہیں لگا، کسی کے سامنے بھی۔

عبدالعلی بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھتے تھے۔ انہوں نے حسن جہاں کے سر پر ہاتھ رکھا پھر روتی ہوئی حسن جہاں کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔

”تم میرا یقین کرو بیٹا، وہ میرے پاس نہیں آیا..... ڈیڑھ سال وہ میرے پاس رہتا اور میں اُسے تم دونوں کے بغیر رہنے دیتا..... میں بے رحم نہیں ہوں..... اتنا تو نہیں ہوں.....“ اُس نے عبدالعلی کو عجیب بے چارگی کے عالم میں کہتے سنا۔

”پھر کہاں گیا ہے وہ.....؟ میرے پاس نہیں..... آپ کے پاس نہیں تو کہاں ہے وہ.....“ حسن جہاں اب عجیب ہڈیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔

قلب مومن نے دروازے کی جھری کو بند کر دیا۔ اُس سے اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اتنے دن نہیں روئی اور آج رو رہی تھی تو..... آخری جملہ جو اُس نے عبد العلیٰ کو کہتے سنا تھا وہ ایک ہی تھا۔ ”میں اُس کو ڈھونڈوں گا..... شاید وہ قونیہ چلا گیا ہو..... اپنے درویش ساتھیوں کے پاس۔“ یہ وہ آخری جملہ تھا جو مومن نے اُن دونوں کی گفتگو کا سنا تھا۔ وہ اُس وقت بے حد رنجیدہ تھا۔ بے حد ناراض، بہت اُداس..... اور وہ کسی بھی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا..... اُسے بس رونا آرہا تھا بالکل اُسی طرح جیسے اُس نے حسن جہاں کو روتے دیکھا تھا..... ہچکیوں کے ساتھ۔

اپنے بستر پر بیٹھ کر اُسے وہ کھانا یاد آیا جسے بنانے کے لیے اس کی ماں کل سے تیاریاں کر رہی تھی..... وہ خوب صورت کیک جسے اُس نے پوری فیملی کے ساتھ کاٹنے کے لیے بنایا تھا۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے اُس نے سوچا تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو اُس کے بابا کو بھیجنا چاہیے تھا۔ دادا کو کیوں بھیجا انہوں نے۔ دادا کو تو نہیں بلوایا تھا اُس نے۔ وہ حُفلی سے روتے ہوئے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا۔ ”مومن.....“ دروازہ یک دم کھلا اور اُس کی ماں اُس سے کچھ کہتے کہتے رُک گئی پھر بے قراری کے عالم میں اُس کے پاس آئی۔

”تم رو گیوں رہے ہو؟“ اُس نے مومن کے پاس بیٹھ کر اُسے لپٹایا۔ ”بابا کیوں نہیں آئے..... انہیں آنا چاہیے تھا.....“ وہ روتے ہوئے ماں سے لپٹا تھا۔ ”وہ آجائیں گے.....“ اُس نے ماں کی تسلی پر بے ساختہ سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ سرخ ناک، سرخ آنکھوں کے ساتھ بھی وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”انہوں نے آپ کو بتایا ہے کیا؟“ مومن ایک لمحے کے لیے رونا بھولا تھا۔

”ہاں، تم آ جاؤ..... کھانا کھاؤ..... تمہارے دادا تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ اُس نے ماں کو نظریں ملائے بغیر کہتے سنا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔

”میں دادا سے کیوں ملوں.....؟ مجھے اُن کے ساتھ کھانا نہیں کھانا.....“ اُسے اس وقت دادا کے علاوہ کوئی اور بُرا نہیں لگ رہا تھا۔ حسن جہاں ہلکی پھر اُس نے اُس سے کہا۔

”دادا کو تو اللہ نے بھیجا ہے..... تم پھر بھی خفا ہو گے اُن سے؟“ وہ لمحے میں موم ہوا تھا۔ اُس کی ماں بلیک میلر تھی۔ جو کام وہ کسی کے کہنے پر نہیں کرتا تھا، اُس سے اللہ کا نام لے کر کروا لیتی تھی۔

”میں بس کھانا کھاؤں گا، بات نہیں کروں گا۔“ اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے اُس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”اور جب تمہارے بابا آئیں گے اور انہیں پتا چلے گا کہ تم نے دادا سے بات نہیں کی تو وہ تم سے خفا ہوں گے..... تم اُن کو خفا کرنا چاہتے ہو؟“ اُس کی ماں نے اب دوسرا ہتھیارا استعمال کیا۔ مومن چپت ہوا تھا۔ ”بابا کب آئیں گے؟“ اُس نے بے قراری سے ماں سے پوچھا۔

”جلد ہی۔“ اُس نے ماں کی پشت دیکھی۔ وہ اب بیرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی مگر جانے سے پہلے مومن نے اُسے وہ سارا زور اُتار کر ڈرینک ٹیبل پر رکھتے دیکھا جو وہ اُس کے باپ کے لیے پہنے ہوئے تھی..... سب کچھ..... ہار جھمکے، انگوٹھیاں، چوڑیاں، بالوں میں لگائی ہوئی پھول دار چمکتی ہوئی سنہری

سوئیاں..... مومن نم آنکھوں کے ساتھ اُس کو سب کچھ اُتارتے دیکھتا رہا۔ وہ منظر اُس کے ذہن پر جیسے نقش ہو گیا تھا۔

”مئی۔“ اُس نے ماں کو جیسے تکلیف میں مخاطب کیا تھا۔ حسن جہاں نے گردن موڑ کر عجیب خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔

”آپ مجھے ایسے بھی اچھی لگتی ہیں۔“

حسن جہاں کی آنکھیں پانی سے اور ہونٹ مسکراہٹ سے لرز رہے تھے۔ وہ مرہم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے رستے ہوئے زخم پر۔ قلب مومن نے ماں کو سر جھکاتے ہوئے دیکھا۔ اُسے تب بھی یہ اندازہ تھا کہ وہ آنسو چھپانا چاہتی ہے وہ ہمیشہ روتے ہوئے اسی طرح سر جھکا کر اُس سے آنسو چھپایا کرتی تھی۔

”ہم کل تمہارے بابا کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ تم دعا کرنا وہ مل جائیں۔“ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جیسے قلب مومن کے سامنے دل کھول دیا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قلب مومن نے دونوں ہاتھ دعا کی شکل میں جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”مل جائیں..... مل جائیں..... مئی کو بابا جلدی مل جائیں۔“ اُس کے ہونٹوں کی حرکت کو کوئی بھی پڑھ لیتا۔ حسن جہاں کو عجیب احساسِ جرم ہوا۔ وہ کس عمر میں اُس سے کیا کروا رہی تھی..... بے چارگی سی بے چارگی تھی..... بے بسی سی بے بسی۔

”مل جائیں گے.....“ مومن نے اب آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے ماں کو اطلاع دی۔ حسن جہاں بھی مسکرائی اور اُس کے لیے ہاتھیں پھیلائیں۔ وہ آکر لیٹ گیا۔ قلب مومن کی ہر دعا قبول ہوتی تھی۔ ہر بات پوری ہوتی تھی۔ حسن جہاں کو یقین نہیں اعتماد تھا۔ اُس سے لپٹے قلب مومن کو یاد آیا اُس نے ماں کو وہ خواب نہیں سنایا تھا جو اُس نے چھپی رات دیکھا تھا۔

☆☆☆

اگلے کئی دن قلب مومن، عبدالعلی اور حسن جہاں کے ساتھ جگہ جگہ پھرتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے۔ اُس کے باپ کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔ یوں جیسے وہ کہیں غائب ہو گیا ہو۔ حسن جہاں کی انگلی پکڑے مومن زندگی کے ایک نئے چہرے سے روشناس ہو رہا تھا۔ اُمید سے، نا اُمیدی سے آس سے، آس کے ٹوٹنے سے اور کفر سے جو انہیں سرحدوں کے بیچوں بیچ کہیں اڑتا پھرتا ہے۔

☆☆☆

جنگل میں وہ لیٹر باکس ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا..... تنہا..... مومن کی طرح..... اُداس..... وہ بھی مومن کی طرح..... اُس نے سائیکل زمین پر لٹا دی..... وہ ایک بار پھر خط لے کر آیا تھا۔

لیٹر باکس میں خط ڈالنے کے بعد بھی وہ عجیب اُداسی کے عالم میں لیٹر باکس کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ اس خط کو وہاں ڈال دینے کے بعد کیا کرے اُس دن پہلی بار اُس نے سوچا تھا آخر اللہ تعالیٰ کو خط کتنے دن بعد میں ملتا ہے..... اور وہ کتنی دیر میں پڑھتے ہیں اور پھر جواب کے لیے اُنہیں کتنا وقت چاہیے۔ وہاں کھڑا وہ اپنے حساب کتاب کی ساری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے جمع تفریق کرتا رہا۔ حل

کچھ نہیں نکلا تھا۔ اللہ کی مرضی جب چاہے خط لے، جب چاہے پڑھے، جواب دے نہ دے، اُسے کسی نے چہ دوسرے کی شکل میں بتایا تھا۔ قلب مومن وہاں کھڑا جنگل کو دیکھتا رہا اُسے اب وہاں سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ وہاں

اتنی ہار آچکا تھا کہ ہر درخت کو پہچان سکتا تھا۔ ہوں کی سرسراہٹ کو بھی نہ ندوں کی نیچہ ہاٹ کو بھی۔
 ”باقی سارے خطوں کا جواب دیر سے دے دیں۔ اُن سب خطوں کے جو میں آئندہ بھی آپ کو لکھوں گا
 لیکن اس خط کا جواب جلدی دے دیں..... پلیز..... پلیز اللہ۔“
 اُس نے بلند آواز میں یک دم پکارا تھا اُس کی آواز بازگشت کی طرح اُن بلند درختوں کے درمیان گونجتی۔
 بہت دور تک گئی تھی۔ قلب مومن کو یک دم لگا۔ اُس کی دعا پھر قبول ہوئی تھی۔ وہ بے حد مطمئن سائیکل اٹھا کر
 بھاگتا جنگل سے باہر آ کر اُس پر سوار ہوا تھا۔

☆☆☆

اپنے گھر کے باہر اُس نے ایک مجمع دیکھا تھا اور ایک ایسبولینس۔ وہ ابھی گھر سے بہت دور تھا مگر پھر بھی
 اُسے لگا۔ وہ اُسی کا گھر ہے جہاں وہ سب لوگ کھڑے تھے، خاموش..... وہ سمجھ نہیں سکا۔ کیا بابا آئے تھے۔ اُس
 نے سائیکل تیز تیز چلائی شروع کر دی تھی۔ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے..... اُس کے خط کا جواب آ گیا تھا اور
 اتنا جلد..... اتنا ”آئی لو یو اللہ“ اُس نے سائیکل دوڑاتے ہوئے بلند آواز میں کہا اور پھر اُس نے لوگوں کو اپنی
 طرف متوجہ ہوتے ہوئے دیکھا..... بیک وقت..... اور اُس خاموشی کو محسوس کیا جو اُس کے گھر پر چھائی ہوئی تھی
 اور اُس اسٹریچر کو دیکھا جو کسی کو گھر سے باہر لا رہا تھا اور مومن کی سائیکل پھسل گئی تھی۔

☆☆☆

آخری چیز جس کی قلب مومن نے کبھی توقع کی تھی وہ اپنے دادا کے سامنے اس مجمع کے درمیان اس حالت
 میں دیکھا جانا تھا۔ مگر اُس کی زندگی میں اکثر وہ ہوتا تھا جس کی اُسے توقع بھی نہیں ہوتی تھی۔
 اپنے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو بے حد آہستگی سے پاس آتے ہوئے ویٹر کی ٹرے میں رکھتے ہوئے قلب
 مومن اُس ساکت و صامت حیرت زدہ بوڑھے کی طرف گیا تھا جو وہاں یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بچہ راستہ بھول کر کسی
 جنگل میں آ نکلا ہو۔

”آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں اپنے آنے کا۔“ اُن سے لپٹتے ہوئے قلب مومن نے بلند آواز میں اُن کے
 کان میں کہا۔ وہاں میوزک کا شور اتنا تھا کہ اُسے اونچی آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔
 ”میں نے تمہیں خط لکھا تھا..... شاید تمہیں ملا ہی نہیں۔“ اُس کے برعکس اُس کے دادا نے سرگوشی ہی کی تھی
 اور قلب مومن نے اُن کی سرگوشی بھی سن لی تھی۔ اُن سے الگ ہوتے ہوئے اُن سے نظریں ملائے بغیر اُس نے
 شکور کے ہاتھ میں پکڑا اُن کا سامان دیکھا اور پھر اُس سے کہا۔
 ”دادا کو گیسٹ روم میں لے جاؤ میں آتا ہوں۔“

شکور کو بروقت اُس کی مشکل اور صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا۔ ”جی جی..... میں لے کر جاتا
 ہوں..... آئیں دادا جی۔“

شکور اُنہیں لے کر ایک دوسرے کوریڈور کی طرف گیا تھا اور قلب مومن نے عبدالعلی کو کسی اعتراض اور تامل
 کے بغیر شکور کے پیچھے جاتے دیکھا۔ یوں جیسے وہ بھی یہ چاہتے ہوں کہ مومن کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے اُس
 کی مدد کریں۔

وہاں کھڑے قلب مومن نے میوزک کی دھن پر ناچتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گزرتے عبدالعلی کو
 عجیب ندامت اور شرمساری سے دیکھا۔ ندامت اور شرمساری اُسے کس لیے محسوس ہو رہی تھی وہ یہ بوجھ نہیں سکا۔
 گیسٹ روم کے کھلے دروازے سے اندر جانے سے پہلے مومن نے دادا کو بلتے دیکھا۔ یوں جیسے وہ جانتے تھے

کہ وہ انہیں ہی دیکھ رہا ہے وہیں کھڑا ہے۔ دونوں کی نظریں ملیں مومن نے نظریں چرائیں پھر جب اُس نے دوبارہ گیسٹ روم کے دروازے کو دیکھا تو وہ بند ہو چکا تھا۔ دادا اندر جا چکے تھے۔

”یہ کون تھے؟“ ”یہاں لپکتی اُس کی طرف آئی تھی۔“

”میرے دادا۔“ ”قلب مومن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔“

”دادا؟“ ”یہاں کو جیسے کرنٹ لگا۔“ ”تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہارا کوئی فیملی ممبر بھی ہے۔“ وہ بھونپکا ہو کر اُس سے بولی تھی۔

”ہاں بس یہی ہیں۔“ ”مومن نے جیسے خود کو سنبھالا۔“

”ملاؤ مجھے۔“ ”یہاں نے یک دم اصرار کیا۔“

”نہیں آج نہیں، پھر کسی دن ملواتا ہوں..... سفر کر کے آئے ہیں آج، تھکے ہوئے ہوں گے۔“ ”قلب مومن

نے کہا۔“

”میرے بارے میں کچھ تو بتایا ہوگا انہیں؟“ ”یہاں کریدے بغیر نہیں رہ سکی۔“

”بہت کچھ۔“ ”قلب مومن نے مسکرا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کمال اعتماد

سے جھوٹ بولا۔“

اُسے اب اس پارٹی کا کچھ کرنا تھا..... مگر کیا کرنا تھا یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

گیسٹ روم میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا انہیں ہمیشہ ملتا تھا سوائے دیوار پر لگی اُس نیوڈ پینٹنگ کے جو پہلے وہاں نہیں لگی ہوتی تھی۔ عبدالعلی کی نظر اُس کمرے میں آنے کے بعد سب سے پہلے اُس پینٹنگ پر ہی پڑی گی

اور وہ ٹھٹک گئے تھے۔ شکور کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اب اُن کا سامان رکھ رہا تھا۔ اُس نے دادا کو دیوار پر لگی اُس پینٹنگ کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی باہر گونجتا شور یک دم ہلکا ہوا۔

”اس دفعہ آپ بہت دیر بعد آئے دادا جان۔“ ”شکور نے اُن کا بیگ اور وہ فریم رکھتے ہوئے کہا۔ جسے بڑی

حفاظت سے پیک کیا گیا تھا۔“

”ہاں بس دیر ہو گئی اس بار۔“ ”عبدالعلی نے گہرا سانس لے کر اُس پینٹنگ سے نظریں ہٹالیں۔“

”وضو کریں گے آپ؟“ ”شکور کو سامان رکھتے ہی خیال آیا۔“

”ہاں، نماز رہتی ہے ابھی میری۔“ ”دادا نے اپنی آستین کے کف کھولتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ پھر انہوں

نے اُس پینٹنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔“

”پہلے یہاں میری کیلی گرائی لگی ہوئی تھی۔“

”ہاں۔ وہ تو ہر بار آپ کے آنے سے پہلے لگواتے ہیں مومن بھائی..... اسٹور روم سے نکلوا کر..... اس بار

آپ کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں چپل دیکھ لوں..... ہے بھی کہ نہیں۔“ ”شکور کے جواب نے عبدالعلی کو چپل

لحوں کے لیے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ شکور نے اُن کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

ہونقوں والے انداز میں کچھ عجلت کے عالم میں باتھ روم کے باہر ڈریسنگ روم میں گیا پھر بیڑ بڑاتا ہوا باہر آیا۔

”مصلیٰ ڈھونڈ لوں ذرا..... پتا نہیں ہے بھی کہ نہیں۔“ اُسے ایک نئی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

”میرے پاس ہے میرا مصلیٰ۔ تم فکر نہ کرو، جا کر مہمانوں کو دیکھو، انہیں ضرورت ہوگی تمہاری۔“ ”عبدالعلی

نے بے حد نرمی سے اُسے ٹوکا۔ پھر وہ باتھ روم میں چلے گئے۔ شکور اسی طرح بڑی احتیاط سے کمرے کا دروازہ

کھول اور بند کرتا وہاں سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

اپنے آخری مہمان کو رخصت کرنے کے بعد مومن سیدھا دادا کے کمرے میں آیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ سوچے ہوں گے۔ بے حد خاموشی سے دروازہ کھول کر اُس نے کمرے میں جھانکا۔ وہ مصلیٰ بچائے کمرے کے ایک کونے میں اُسے نظر آ گئے۔ وہ اُسی احتیاط سے دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آیا تھا اور کچھ دیر کھڑا دادا کو دیکھتا رہا۔ اُن کی پشت اُس کی طرف تھی۔ شاید وہ اُس کی آمد سے بے خبر تھے۔ اور تب ہی قلب مومن کی نظر دیوار پر لگی اُن پینٹنگز پر پڑی اور وہ بے اختیار ہونٹ بیچ کر رہ گیا۔ اُس نے خواہش کی عبدالعلی کی نظر ان پینٹنگز پر نہ پڑی ہو لیکن وہ جانتا تھا یہ خواہش خوش بھی سے بڑھ کر ہے۔ وہ آرٹسٹ تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا اس کمرے میں آ کر ان دیواروں پر نظر ہی نہ دوڑائی ہوگی انہوں نے۔ کچھ کہے بغیر بے حد خاموشی سے قلب مومن نے دیواروں پر لگی اُن پینٹنگز کو ایک کے بعد ایک اتار کر دیواروں کے ساتھ الٹ کر رکھنا شروع کیا تھا۔

”رہنے دیتے انہیں۔“ وہ عبدالعلی کی آواز پر یک دم چونکا۔ پتا نہیں انہوں نے کس وقت اپنی نماز ختم کی۔ قلب مومن بے حد غیر محسوس انداز میں اُن پینٹنگز کو وہیں چھوڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے پلٹا۔ دادا مصلیٰ سے اُٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے اور اب اُس کی طرف متوجہ تھے۔ اُسی نرم، شفیق اور حلیم انداز میں جس میں وہ انہیں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔

”مجھے بہت افسوس ہے۔“ انہوں نے یک دم قلب مومن سے کہا۔

”کس بات کا؟“ وہ بے اختیار چونکا۔ یہ جملہ وہ بولنا چاہتا تھا اُن سے اور بول رہے تھے۔

”میں غلط وقت پر آ گیا۔ تمہاری پارٹی خراب کر دی میں نے۔“ اُن کے لہجے میں واقعی رنج تھا۔ مومن نظریں نہیں ملا سکا۔ وہ ایسے ہی تھے ہمیشہ سے..... اُسے ہمیشہ عجیب احساس جرم میں مبتلا کر دیتے تھے۔

”نہیں، پارٹی تو ویسے ہی ختم ہو جانا تھی۔ آپ کے آنے نہ آنے سے کچھ فرق نہیں پڑا۔“ وہ کہتا ہوا صوفے پر بیٹھا۔

”میں نے خط لکھا تھا تمہیں، سوچا تھا مل گیا ہوگا لیکن شاید تمہیں نہیں ملا۔“ انہوں نے قلب مومن کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو ڈاک کے سٹم کا تو پتا ہی ہے اسی لیے کہتا ہوں فون کیا کریں۔ خط تو کم ہی ملتے ہیں مجھے آپ کے۔“ اُس نے بے حد ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولا۔

”اور جہاں میں رہتا ہوں وہاں فون کے سگنلز اپنی مرضی سے آتے ہیں۔“ دادا نرمی سے ہنسے تھے۔

”اسی لیے آپ کے اور میرے درمیان رابطہ ٹوٹ گیا۔“ قلب مومن نے بے ساختہ کہا۔

”ٹوٹا تو کچھ بھی نہیں..... یہ خون کا رشتہ ہے قلب مومن..... فاصلہ آ گیا ہے بس اور مصروفیت۔“

”اور فاصلہ اور مصروفیت دونوں تعلق توڑ دیتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”آپ آرام کریں.....“

تھک گئے ہوں گے، صبح بات کرتے ہیں۔“ عبدالعلی اُٹھ کر کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا کر ماتھے پر بوسہ دیا۔ قلب مومن کے حلق میں ہمیشہ کی طرح کوئی چیز اٹکی تھی..... یہ جو جذباتیت تھی اس کا وہ شکار ہونا نہیں چاہتا تھا اور دادا اس دنیا میں وہ واحد شخص تھے جو قلب مومن کے دل میں جو احساسات پیدا کرتے تھے، وہ اُن سے اگلی ملاقات تک چور بنا پھرتا رہتا تھا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ جذباتیت کے اُس اظہار کے جواب میں یہی کہہ سکتا تھا سو یہی کہا۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکلا تو لاؤنج میں اُس کی نظر اُس کنسول پر پڑی تھی جس کی درازوں میں دادا کے خطوں کے علاوہ کچھ

نہیں تھا اور وہیں وہ آخری موصول ہونے والا خط بھی تھا جس کے بارے میں وہ جھوٹ بول کر آیا تھا مگر اس کے علاوہ اُس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اُس کا اور عبدالعلی کا رشتہ بے حد عجیب تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اُس سے بے حد محبت کرتے تھے اور وہ بھی اُن سے ویسی ہی محبت کرتا تھا مگر اظہار نہ وہ کر پاتے تھے نہ قلب مومن..... کر پاتے اگر قلب مومن کی غیر جذباتیت ایک دیوار کی طرح دونوں کے درمیان حائل نہ ہوتی۔

”میں بورڈنگ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔“

اُسے یاد تھا کہ اُس نے پہلی بار دادا سے کون سا بڑا مطالبہ کیا تھا..... اُس کا خیال تھا وہ اُسے سمجھائیں گے، روکیں گے، منائیں گے۔ یہ کہیں گے کہ وہ اُس کے بغیر اکیلے نہیں رہ سکتے وہ اپنے فیصلے کو بدل دے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اُس کا مطالبہ پورا کر دیا تھا..... شاید وہ اُس زخم کو بھرنا چاہتے تھے جو قلب مومن کو لگا تھا یا پھر اپنے اُس احساس جرم کو مٹانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اس جرم کے شریک تھے۔

قلب مومن استنبول کے ایک بہت نامور بورڈنگ اسکول میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اُس نے اُس وقت دادا سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ یہ سب افورڈ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ وہ بورڈنگ اسکول پر ایویوٹ تھا۔ اُن سے دور جا کر مومن کو جیسے عجیب سا قرار ملا تھا۔

اُس کا اگلا مطالبہ امریکہ میں فلم میکنگ پڑھنے کے لیے بھیجا جانا تھا اور عبدالعلی نے وہ مطالبہ بھی خاموشی سے پورا کر دیا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ ایک پاکستانی دوست کے ساتھ بنائی جانے والی کمپنی قلب مومن کو امریکہ سے واپس ترکی لے جانے کے بجائے پاکستان لے آئی تھی اور عبدالعلی نے تب بھی کوئی اعتراض کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ اگر زندگی میں قلب مومن کبھی کسی شخص کی خوبیوں کو سراہتا تھا تو وہ عبدالعلی ہی تھے مگر وہ کبھی اُن کے سامنے یہ سزا نہیں کر سکا تھا۔ اب اتنے سالوں سے وہ پاکستان میں رہ رہا تھا تو وہ بھی اُس کے پاس آنے جانے لگے تھے۔ قلب مومن نے کبھی بھی دادا سے جھوٹ بول کر اپنا لائف اسٹائل اُن سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جس طرح رہنا چاہتا تھا جو کرنا چاہتا تھا، ویسے ہی رہ رہا تھا۔ وہی کر رہا تھا۔ بہت کم عمری میں وہ امریکہ میں مالی طور پر عبدالعلی کا محتاج نہیں رہا تھا اور اس خود مختاری اور مالی آزادی نے اُسے ہر لحاظ سے آزاد کر دیا۔ رہی سہی کسر اُس کی فیلڈ اور اُس فیلڈ میں بہت کم وقت میں اُس کی قابل رشک حد تک حاصل ہو جانے والی کامیابی نے پوری کر دی تھی۔

وہ دادا کے ساتھ جیسی سیدھی اور سادہ زندگی گزارتا آیا تھا وہاں سے نکل کر وہ اتنی ہی ”تیز رفتار“ زندگی گزار رہا تھا..... سب کچھ آج ہی کر جانے کا جنون..... ابھی ہی پالینے کی دوڑ، سب سے بہتر ہونے کا خواب..... قلب مومن کی زندگی اُس بھاگ دوڑ کے علاوہ کچھ نہیں رہی تھی مگر اس سب میں بھی عبدالعلی سے ہونے والے ہر سامنے میں اُس کی رفتار میں جیسے ایک اسپید بریکر آتا تھا۔ اُس کے لائف اسٹائل کے بارے میں اُنہیں کس حد تک خبر تھی۔ قلب مومن نے کبھی اس کا اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اُس کے لائف اسٹائل میں وہ کون سی چیزیں تھیں جو اُنہیں پریشان کر سکتی تھیں۔ قلب مومن کم از کم اُس کا ایک پردہ رکھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا اور وہ پردہ آج بد قسمتی سے رہ نہیں سکا تھا۔

☆☆☆

وہ نیند کی حالت میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور کچھ دیر کے لیے بستر پر پڑے اُسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس طرح جاگنے کی وجہ کیا تھی مگر پھر اُس کے ذہن نے جیسے اُس آواز کی طرف اُسے متوجہ کیا جو بہت دھیمی آواز میں آرہی تھی۔ مگر گونج رہی تھی۔ وہ اذان کی آواز تھی۔ عبدالعلی کی اذان کی۔ انہیں عادت تھی۔ فجر کے وقت وہ اذان دے

کر نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ اُن کی زندگی کا معمول تھا۔ اب یہاں اُس کے امارٹمنٹ میں بھی وہ ہمیشہ کی طرح فجر کی نماز کے لیے اذان دے رہے تھے۔ بستر میں لیٹا، نیم تار یک بیڈروم میں آنکھیں کھولے وہ اُس اذان کے الفاظ کو سنتا رہا جن پر اُس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔

اُس پینٹ ہاؤس میں باہر کی آوازیں نہیں آسکتی تھیں۔ آس پاس موجود مساجد کے اسپیکرز سے آنے والی اذان کی آوازیں کبھی اُس کے گھر کی شیشے کی دیواروں کو پھلانگ کر اندر نہیں آسکتی تھیں۔ اُس کا گلاس ہاؤس تقریباً ساؤنڈ پروف تھا۔ مگر جب بھی عبدالعلی وہاں آتے وہ پینٹ ہاؤس ہر روز صبح فجر کے وقت اللہ کے نام سے اسی طرح گونجتا رہتا اور قلبِ مومن ہر صبح ان کی آواز پر اسی طرح میکانیکی انداز میں بستر پر لیٹے لیٹے الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) تک اذان سنتا اور پھر سو جاتا..... آج بھی یہی ہوا تھا۔ دادا الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ پکار رہے تھے اور قلبِ مومن نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆

”دادا جاگ گئے؟“ اگلی صبح وہ بہت جلدی اٹھا اور اُٹھتے ہی وہ سیدھا شکور کے پاس کچن میں گیا۔ ”سلام مومن بھائی۔ جی کہہ رہے تھے جب آپ جاگ جائیں تو انہیں بتادیں پھر وہ ناشتہ آپ ہی کے ساتھ کریں گے۔“ شکور نے جواباً اُسے اطلاع دی۔ ”اچھا..... کچھ پوچھ تو نہیں رہے تھے؟“ قلبِ مومن کچن سے نکلتے نکلتے کوئی خیال آنے پر واپس پلٹا تھا۔ ”رات کو۔“

”کس چیز کے بارے میں؟“ شکور نے جواباً آلیٹ کے لیے انڈے توڑتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ”میرے بارے میں کہ کون آتا جاتا ہے؟ یا رات کی پارٹی کے بارے میں..... کہ کیا ہو رہا تھا۔“ شکور کے تاثرات سے قلبِ مومن کو اندازہ ہوا کہ اُس کے سوالات کتنے بے ربط اور احمقانہ لگ رہے تھے۔ ”نہیں تو دادا جان کیوں پوچھیں گے۔ جو بھی آتا جاتا ہے دیکھ تو لیا انہوں نے اور جو ہو رہا تھا وہ بھی۔“ شکور نے طنز نہیں کیا تھا۔ سیدھا جواب دیا تھا۔ جیسے جواب وہ دیتا تھا مگر قلبِ مومن کو لمحہ بھر کے لیے لا جواب بھی کیا اور خفا بھی۔

”زبان ذرا کم چلانا، جب تک وہ یہاں ہیں۔“ اُس نے شکور کو تھوڑے سخت لہجے میں گھر کا تھا۔ ”جی۔“ شکور نے زیادہ اثر لیے بغیر کہا۔

انسان مومن بھائی کی مانے تو گونگا ہی ہو جائے۔ اُس نے ساتھ ہی انڈے پھینٹتے ہوئے سوچا۔ ”کب تک رہیں گے وہ یہاں؟“ قلبِ مومن سوال کرنے کے بعد بے ساختہ پچھتا یا تھا۔ شکور نے انڈے پھینٹتے پھینٹتے کہا۔

”پتا نہیں جی..... پوچھ آؤں؟“ وہ قلبِ مومن کا ہر مسئلہ حل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ مستعد رہتا تھا۔ ”میں پوچھ لوں گا اُن سے۔ تم ناشتا بناؤ۔“ وہ اپنی غلطی پر جیسے پچھتا تا ہوا وہاں سے نکلا، جانتا تھا یہ ممکن نہیں کہ شکور اس سوال کا جواب دادا سے اس حوالے کے ساتھ نہ مانگا کہ مومن بھائی پوچھ رہے تھے۔

☆☆☆

”اندرا آ جاؤں؟“ دروازے پر دستک دے کر وہ انہیں سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عبدالعلی ایک فریم کو میز پر رکھے اُس کی پکینگ اُتار رہے تھے۔ چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور بے اختیار مسکرائے۔ ”وعلیکم السلام۔ ابھی تمہارا ہی سوچ رہا تھا میں.....“ مومن مسکرایا اور اُن کے بالمقابل اُس میز کے دوسری

طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔

”نیند ٹھیک سے آئی آپ کو؟“ اُس نے دادا سے کہتے ہوئے ان کا چہرہ بغور دیکھا۔ اُن کے چہرے پر ہر بار کی طرح اس بار بھی کچھ جھرتیوں کا اضافہ ہوا تھا۔

”ہاں، بالکل ٹھیک سے آئی..... فجر کے وقت آنکھ بھی کھل گئی تھی۔“ انہوں نے جیسے خوش ہوتے ہوئے مومن کو بتایا اور مومن نے یہ نہیں کہا کہ یہ بات وہ پہلے ہی جانتا ہے۔

”یہ دیکھو۔“ انہوں نے فریم کی پیننگ اب گھول دی تھی اور اُسے میز پر رکھے انہوں نے مومن کی توجہ اُس خوبصورت خطاطی کی طرف مبذول کروائی۔ قلب مومن بے اختیار مسکرایا۔

”میری سالگرہ کا تحفہ؟“ دادا نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا تھا۔

وہ پچھلے سات سالوں سے ہر سال اُس کی سالگرہ پر اُسے اپنی بنائی ہوئی ایک خطاطی کا تحفہ دیا کرتے تھے..... پچھلے سات سالوں سے یہ ایک روٹین تھی اور اب قلب مومن کو اُن کے تحفے کی نوعیت کا اس حد تک اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بتائے بغیر بھی بوجھ جاتا تھا۔ اُس کی سالگرہ میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور وہ اسی لیے آئے تھے۔

”ہاں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اب اُس محقق انداز میں بنائی ہوئی خطاطی میں لکھی ہوئی آیت پر انگلی پھیر رہے تھے۔

وَاللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى الْمُرْسَلِ (سورۃ الانفال، آیت نمبر 19)

انہوں نے انگلی پھیرتے ہوئے آیت پڑھی۔

”بہت خوب صورت ہے۔“ مومن نے فریم کو بغیر اٹھائے یا ہاتھ لگائے ہوئے کہا۔

”مطلب نہیں پوچھو گے؟“ دادا نے اُس سے پوچھا۔

”پوچھنے کا فائدہ؟..... آپ نے ہر بار جتنی آیات کا مطلب بتایا ہے، میں ہر بار بھول جاتا ہوں۔“ قلب مومن نے جواباً کہا۔ وہ جیسے دانستہ چاہتا تھا کہ وہ اُسے نہ بتائیں۔

”تم یاد رکھا کرو۔“ دادا نے کہا۔

”یاد رہتا ہی نہیں۔“ قلب مومن نے بے ساختہ عذر پیش کیا۔

”اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔“ انہوں نے اس بار اس سے بحث کیے بغیر کہا تھا۔ قلب مومن چند لمحے خاموش ہو کر اُس فریم کو دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

”اور میں مومن نہیں۔ آ میں ناشتہ کرتے ہیں۔“

وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا اور عبدالعلی اُس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں پر جیسے الجھے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔

☆☆☆

”یار! تم کیوں آئی ہو؟“ داؤد اُسے اپنے آفس میں دیکھ کر کراہ کر رہ گیا۔

”تم جانتے ہو۔“ مومنہ نے اپنا بیگ کندھے سے اتار کر زمین پر کرسی کے پاس رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”ہاں اور میں تمہیں اُس کا جواب پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ داؤد بے چارگی سے بولا۔ اُسے مومنہ سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔

”داؤد! تم نے اُس سے بات نہیں کی۔ میں جانتی ہوں۔“ مومنہ نے دو ٹوک انداز میں اُس سے کہا تھا۔

”ہاں..... اور تم قلب مومن کو جانتیں نہیں، اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو۔“ داؤد نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

”میں ایک بار ملنا چاہتی ہوں اُس سے..... ایک بار۔“ مومنہ نے اُس کی بات کاٹی تھی اور اس سے پہلے کہ داؤد اُس سے کچھ کہتا، قلب مومن کچھ کاغذ ہاتھ میں لیے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

”داؤد! یہ پیپر ز ایک بار دیکھ لو پھر ڈسچ کرنا ہے انہیں اور.....“ وہ روانی میں اُن پیپر ز کو تھمانے کے لیے آگے آیا اور اُس وقت پہلی بار مومنہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو کر پٹی تھی۔ وہ اور قلب مومن بالقابل تھے۔ قلب مومن نے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لیا تھا اُسے پہچاننے میں۔ اُس نے وہ ہاتھ پیچھے کر لیا تھا جس سے وہ کاغذات داؤد کی طرف بڑھا رہا تھا پھر اُس نے ایک نظر داؤد کو دیکھا تھا۔ جس کا رنگ اس وقت قہر ہو چکا تھا۔ وہ جس بلا کوٹا لے کی کوشش کر رہا تھا وہ نہیں ٹلی تھی۔

”تم کس لیے آئی ہو یہاں؟“ تمام ادب، لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے قلب مومن نے بے حد تیز آواز میں ڈائریکٹ مومنہ ہی سے کہہ دیا۔

”آپ سے معذرت کرنے..... اُس دن جو ہوا، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ مومنہ نے اُس کے لہجے کی کرسنگی کو نظر انداز کیا اور مدھم آواز میں اُس کو مدعا بتایا تھا۔

”معذرت کرنے؟..... کس چیز کی معذرت کرنے؟..... میڈم..... یہ دروازہ دیکھ رہی ہیں آپ؟ اسے کھولیں۔ اینڈ گیٹ لاسٹ۔ یہ میرا آفس ہے، تمہارے باپ کا آفس نہیں ہے۔“ قلب مومن نے جو جواب دیا تھا مومنہ کو لگا اُس کا چہرہ ضرور سرخ ہوا ہوگا۔ وہ اُس کی تذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

”میں واقعی شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ڈھیٹ نہیں تھی، بے شرم بھی نہیں تھی مگر زندگی تھی اور وہ مجبوری بھی تھی جو اُس کے پیروں اور ہاتھوں کو ایک ہی رسی سے باندھے ہوئے تھی۔ قلب مومن اس بار اُس پر دھاڑا تھا۔

”تمہیں سنائی نہیں دے رہا، میں کیا کہہ رہا ہوں..... گیٹ لاسٹ اور دوبارہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا..... اور تم..... یہ آخری بار ہے کہ یہ میرے آفس میں نظر آرہی ہے۔ یہ تمہاری جو کوئی نجی ہے۔ اس آفس میں نظر نہیں آنا چاہیے۔ اگلی بار یہ آفس میں آئے گی تو پھر صرف یہ نہیں جائے گی، تم بھی جاؤ گے۔“

مومن نے آخری چند جملے داؤد سے کہے۔ بے حد درشت لہجے میں اور پھر کاغذ اُس کی ٹیبل پر پھینکنے والے انداز میں اُچھال کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ مومنہ داؤد سے نظریں نہیں ملا سکی..... نہ ہی داؤد ملا سکا۔ ایک عجیب سا اُترا تھا اُس آفس میں بھی اور مومنہ سلطان پر بھی۔ ذلت اس وقت اُس کے سامنے اتنی چھوٹی چیز ہو گئی تھی کہ اُسے اُس کی پرواہ نہیں رہی تھی..... پرواہ اگر کسی چیز کی رہ گئی تھی تو وہ جہانگیر تھا۔

”میں نے بتایا تھا تمہیں.....“ داؤد نے جیسے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

”ہاں..... اور مجھے افسوس ہے۔ میری وجہ سے تمہیں یہ سب کچھ سننا پڑا۔“ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اُس نے داؤد سے نظریں چرائی تھیں۔ آنکھوں میں پانی تھا اور یہ آنسو وہ کسی کے سامنے بہانا نہیں چاہتی تھی۔

”مجھے اپنی پرواہیں بے مومنہ مگر.....“ داؤد نے اتنا کہہ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ مومنہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”جہانگیر کے لیے آئی تھی۔“ اُس نے عجیب بے ربطی سے یہ جملہ بولا تھا۔

”تم جہانگیر کے لیے پریشان مت ہو۔ جو بھی ہوا، میں کروں گا..... کچھ لوگوں سے کہا ہے میں نے تمہارے لیے..... کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“

وہ یہ نہ بھی بتاتی تو بھی داؤد کو اندازہ تھا، اُسے اس طرح اُس فلم میں کام مانگنے اور اُس کے لیے قلب مومن

جیسے شخص کے سامنے ناک رگڑنے کے لیے کون سی ضرورت مجبور کر رہی تھی۔

مومنہ نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی۔ اُس بے حد مختلف انداز میں ڈیکور ہڈ سٹوڈیو اور آفس سے جس کا مالک اس وقت مومنہ سلطان کی زندگی کا واحد قابل نفرت شخص تھا۔

☆☆☆

کبوتروں والی وہ حویلی ہمیشہ کی طرح پرسکون، خاموش تھی۔۔۔۔۔ سائیکو انالسٹ کے اُس کاؤچ کی طرح جس پر بیٹھ کر انسان اپنا اندر کھوجنے، اپنے بوجھ اُتارنے آتا ہے اور ہلکا پھلکا ہو کر جاتا ہے۔

مومنہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھی کسی سے اجازت لیے بغیر۔ اُس حویلی کا دروازہ اسی طرح کھلا ملا تھا۔ وہاں آنے والے ہر شخص کو۔۔۔۔۔ اور وہاں آنے والے زیادہ تر آرٹ اسکولز کے اسٹوڈنٹس ہوتے تھے۔ جو اپنی فرصت کے چند گھنٹے وہاں اپنی مرضی سے آ کر گزارتے۔ اُس ایک کام میں ماسٹر ابراہیم کے ساتھی اور مددگار بن کر جو ماسٹر ابراہیم نے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

حویلی کا دروازہ کھلتے ہی سامنے وہ فوارے والا چھوٹا سا صحن تھا جو ہر وقت کبوتروں سے بھر رہتا تھا اور اُن کی عجیب خصوصیت یہ تھی کہ وہ وہاں آنے والوں سے ڈر کر نہیں اڑتے تھے۔ اپنی جگہ پر ہی جے بیٹھے رہتے یا چلتے چلتے کچھ آگے سرک جاتے۔ یوں جیسے گزرنے والوں کو راستہ دے رہے ہوں۔ پانی کے اُس چھوٹے سے فوارے کے گرد بنے حوض میں جو اُس صحن کے پیچوں بیچ لگا ہوا تھا، اب بھی پانی موجود تھا۔ بے حد صاف رکھنے کی کوشش کی گئی تھی اُسے۔۔۔۔۔ اس کے باوجود کہ وہ پانی پینے کے لیے اڑ کر اُس حوض کے گرد بنی اُس چار انچ چوڑی دیوار پر بیٹھنے والے کبوتروں کی ہیٹ سے روز گندی ہوتی تھی پھر بھی ماسٹر ابراہیم اُسے روز صاف کرتے تھے تاکہ کبوتروں کو صاف اور شفاف پانی ملے پینے کے لیے۔

دانہ چکنے کے لیے جگہ جگہ بیٹھے ہوئے کبوتروں کے بیچ سے گزرتے ہوئے مومنہ سلطان کو عجیب سا سکون ملا اور ہمیشہ ملا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے شور شرابے سے بھاگتی جب بھی یہاں آتی تھی کچھ دیر کے لیے سارے دکھ جیسے گھبر جاتے تھے۔ وہاں بھری خاموشی اُس کے اندر کا سارا شور کسی اسج کی طرح جذب کر لیتی تھی۔

حویلی کے کھلے برآمدے میں ماسٹر ابراہیم فرش پر پڑی اُس دری پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے حویلی کے کھلنے والے دروازے پر سر اٹھا کر اندر آنے والے کو دیکھا نہ ہی کبوتروں کے پیچوں بیچ سے گزرنے والی مومنہ کے پیروں کی چاپ نے انہیں متوجہ کیا تھا۔ وہ سر جھکائے بے حد انہماک سے قرآن پاک کے اُس نسخے کی جلد سازی کرنے میں مصروف تھے جو اُن کے سامنے رکھا ہوا تھا۔

”السلام علیکم ماسٹر صاحب۔“ مومنہ نے برآمدے کی دو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مدھم آواز میں انہیں سلام کیا اور پھر اپنا بیگ دری پر ایک کونے میں رکھ دیا۔ اپنی مخصوص جگہ پر جہاں فرش پر ہی وہ چھوٹا سا ڈیسک رکھا تھا جس پر وہ کام کیا کرتی تھی۔

”علیکم السلام۔۔۔۔۔ ارے مومنہ! اس بار بڑے دنوں کے بعد آئیں تم۔“ ماسٹر ابراہیم نے بالآخر سر اٹھا کر بے حد خوش دلی سے اُس کا استقبال کیا تھا۔ مومنہ میکاکی انداز میں برآمدے میں جگہ جگہ دیواروں کے ساتھ رکھے بہت سارے کھلے خانوں والی شیلفوں میں سے موجود ایک قرآن پاک نکال رہی تھی۔

”ایک سیریل میں کام مل گیا تھا ماسٹر صاحب۔“ شیلف کے خانے سے اُس قرآن پاک کو بے حد احتیاط سے لا کر اپنی جگہ پر آنے اور زمین پر پڑے اُس فرش ڈیسک پر اُس قرآن پاک کو رکھتے ہوئے مومنہ نے ماسٹر ابراہیم کو جواب دیا۔ اُن کی طرف دیکھے بغیر، اُن سے نظریں ملائے بشیر۔ وہ اس وقت جس ذہنی کیفیت میں وہاں آئی تھی نہیں چاہتی تھی، کوئی اُسے پہچانے۔

”ارے ماشاء اللہ۔ سوپ کا کام مل گیا۔“ ماسٹر ابراہیم نے بے ساختہ اُس سے کہا اور اُن کے ان الفاظ پر وہ

یکدم چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ ”ماسٹر ابراہیم نے جیسے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔ وہ قرآن پاک کے اُس
لئے کام مکمل کر چکے تھے۔

”تمہاری خواہش تھی سیریل میں کام کرنے کی، تم نے دعا کروائی تھی۔“ انہوں نے مومنہ سلطان کا چہرہ
بہت دیکھا جو سر جھکائے اب اُس قرآن پاک کو اپنے ڈیسک پر رکھے بیٹھی تھی۔
”نہیں دعا کروائی تھی مگر آپ ماشاء اللہ کہیں، مجھے شرم آتی ہے۔“
”کس سے؟“ ماسٹر ابراہیم نے جیسے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔

”اللہ کے علاوہ کس سے آئے گی ماسٹر صاحب؟“ اُس نے انہیں دیکھے بغیر سر جھکائے اب وہ کاغذ کھول
لیا جس پر وہ کام کرنے والی تھی۔ اُس کا قلم اور روشنائی کی دوات اُس کے ڈیسک کے پاس پڑی تھی۔ ماسٹر ابراہیم
یکدم کچھ گئے تھے کہ اُس کا اشارہ کس طرف ہے۔

”رزق دیتا ہے یہ کام بھی۔ رزق کے لیے ہی کہا ہے ماشاء اللہ۔“ انہوں نے مدھم آواز میں مومنہ سے
کہا۔ وہ اچھے سالوں سے اُن کے پاس آرہی تھی وہ اُس کی زندگی کے ہر امتحان، ہر آزمائش سے بخوبی واقف
تھے۔

”آپ ٹیک ہیں، آپ جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔“ وہ اُن کی بات پر بے ساختہ بولی اور وہ اُنس بڑے۔
”تم بھی ٹیک ہو بیٹا۔“ اُن کی بات پر مومنہ نے قلم ہاتھ میں پکڑے گہرا سانس لیتے ہوئے پہلی بار سر اٹھا
کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ٹیک ہوتی آپ کی طرح تو یہاں“ یہ“ کر رہی ہوتی۔۔۔ ساری دنیا سے کٹ کر، چھپ کر۔“ اُس
نے ڈیسک پر رکھے اُس کاغذ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا جس پر اُس نے ابھی کام شروع کرنا تھا۔
وہ اُس کی بات پر مسکرائے تھے۔

”یہ بھی تو کر رہی ہو۔“ انہوں نے اُسے جتانے والے انداز میں کہا تھا۔
”مگر“ صرف“ یہ نہیں کر رہی نا۔ اور کر بھی رہی ہوں تو اپنے سکون، اپنے لالچ کے لیے کر رہی ہوں۔“
وہ اب کاغذ پر اُس قرآن پاک کے اُن شروع کے صفحات کو لکھ رہی تھی جس پر اُس بوسیدہ قرآن پاک کی ابتدائی
تحریر تھی۔

وہ وہاں پہلی بار آرٹ اسکول کے کسی اسٹوڈنٹ کے ساتھ آئی تھی جو ماسٹر ابراہیم کی اس حویلی کے بارے
میں جانتا تھا۔ جہاں لوگ اپنے بوسیدہ قرآن پاک کے نسخے دے کر جایا کرتے تھے۔ وہاں ماسٹر ابراہیم آرٹ
اسکول کے بہت سارے اسٹوڈنٹس کی رضا کارانہ مدد کے ساتھ پھٹ جانے والے صفحات اور مٹ جانے والے
الفاظ کو خطاطی کے انداز میں لکھوا کر قرآن پاک کے اُن نسخوں کو دوبارہ جلد کرا کے محفوظ کیا کرتے تھے۔

وہ وہاں یہ کام کئی سالوں سے کر رہے تھے۔ پہلے اکیلے کیا کرتے تھے، اب کئی نوجوان وہاں آ کر شوقیہ اور
جذبے کے ساتھ یہ کام کرتے تھے۔ خاص طور پر خطاطی سے منسلک اسٹوڈنٹس اور مومنہ سلطان کا اس جگہ سے
تعارف بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ اب وہ مسلسل وہاں آنے والے افراد میں شامل تھی جو اپنی سہولت کے اوقات میں
وہاں آ کر ماسٹر ابراہیم کی مدد کیا کرتے تھے۔

یہ مومنہ سلطان کا اپنے اُس ٹوٹے ہوئے خواب کے ساتھ آج بھی بڑے رہنے کا ذریعہ تھا جو آرٹ اسکول
میں آرٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی صورت میں بھی اُس نے دیکھا تھا۔ وہ خطاط بننا چاہتی تھی۔ خطاطی کرنا

چاہتی تھی اور مجھ سے اس کا انگریزی حق بھی تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک فلمی گھرانے سے تھیں، مگر جہاں باپ ایک فلم ایک آپ آرٹسٹ تھا اور ماں ٹریڈر سے منسلک رہنے والی ایک سنگر اور اس اور آرٹسٹ مومن کو ایک سنگ میں دیکھتی تھی نہ گانے میں، نہ فلم سے منسلک کسی اور چیز میں۔ اسے خطاطی کا شوق تھا اور اس شوق کو بڑھا دینے میں سلطان اور ٹریڈروں کا ہاتھ تھا۔ یہ ان کے بھی اچھے وقتوں کا خواب تھا جب وہ مومن کو خطاط بنانا چاہتے تھے۔ آرٹ اسکول میں پڑھا کر پھر باہر کے کسی ملک میں بھیج کر بہت زیادہ پڑھا کھا کر۔ مومن کے لیے انہوں نے یہ بھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ جہانگیر کی طرح فلم کی فیلڈ میں آئی۔ میری فلم اور اس کی وجہ سلطان تھا یا حسن جہاں۔ یہ فیصلہ کرنا بھی کبھی مومن سلطان کے لیے مشکل ہو جاتا۔ مگر زندگی اپنے فیصلوں، اپنے خوابوں اور اپنی خواہشات کے تابع نہیں ہوتی۔ مومن سلطان کی زندگی بھی نہیں تھی۔ وہ جہانگیر کی لڑکیوں کی بیماری کا چھلنے کے بعد اپنی تعلیم چھوڑ کر اس کا علاج کرنے کے جنون میں اداکارہ بنی تھی اور آرٹ اسکول کے خواب کے ساتھ ہی اس نے زندگی میں اور بھی بہت کچھ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے اچانک پتا چل گیا تھا کہ آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ جو بھی اچھے دن انہوں نے بھی گزارے تھے وہ پیچھے رہ گئے تھے اور اب اگر زندگی میں اسے کوئی بڑا کام بھی کرنا تھا تو وہ صرف جہانگیر کا علاج کر دینا تھا۔

”جہانگیر کیسا ہے؟“ ماسٹر ابراہیم نے موضوع گفتگو یک دم بدلا۔

”دوسرا اگر وہ بھی ٹیبل ہو رہا ہے اس کا۔“ وہ ایک لمبی خاموشی کے بعد کام کرتے کرتے بولی۔

”میں ابھی پہلے کے لیے بھی پیسے جمع نہیں کر پائی۔“ ماسٹر صاحب اب مجھے لگتا ہے میں آدمی پاگل ہو گئی ہوں۔ مختصر یہ پوری پاگل ہو جاؤں گی۔ ”اس کے اندر کالا داجیہ پھٹ پڑا تھا آنسوؤں کے سیلاب کے ساتھ۔ ”جو رزق کماری ہوں، وہ کماتا نہیں چاہتی۔ جو کماری ہوں، اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔ جو چاہتی ہوں، وہ ملتا نہیں۔ جو ملتا ہے وہ چاہ نہیں جاتا۔“ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ پھر آستین سے اپنی آنکھیں اور چہرہ رازا۔

”میں کچھ کرتا ہوں تمہارے لیے۔“ ماسٹر ابراہیم بے اختیار پریشان ہوئے تھے۔ انہوں نے مومن کو اب اسٹریپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”آپ بس دعا کریں۔ میں اس آزمائش سے نکل جاؤں۔ یہ ختم ہو جائے۔“ اس نے جواباً اُن سے کہا۔ ”آمین۔“ ماسٹر ابراہیم نے بے ساختہ کہا۔

”میرا گردہ لگ سکتا تو میں اپنے دونوں گردے اُسے دے دیتی۔ وہ جینا چاہتا ہے، میں جینا نہیں چاہتی۔“ اس کے لہجے میں آج کچھ ایسا تھا جو ماسٹر ابراہیم کو نئی طرح پریشان کر رہا تھا۔

”اللہ کی ذات سے اتنی مایوسی ٹھیک نہیں مومن۔“ انہوں نے جیسے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”اللہ سے تو مایوس نہیں ہوں۔ دنیا سے ہوں۔ لوگوں سے ہوں۔“ اس نے جواباً کہا تھا۔

”اللہ کی دنیا ہے بیٹا۔ اللہ کے لوگ ہیں۔“ ماسٹر ابراہیم نے جیسے اُسے ایک بار پھر سمجھایا۔

”ہاں سب اللہ کے ہیں بس ایک مومن اللہ کی نہیں ہے نا۔“

اس نے آنسو صاف کر لیے تھے۔ وہ اب دوبارہ کام شروع کر چکی تھی۔ ماسٹر ابراہیم۔ اس بار کچھ نہیں کہہ سکے تھے۔ وہ خاموشی سے اس کا جھکا ہوا سر دیکھتے رہے۔ وہ اب کام میں مصروف تھی، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں۔ مگر جی ہلکا کرنا تھا، وہ ہو گیا تھا اس کا۔ یہ آنسو وہ نہ ٹریڈر کے سامنے بہا سکتی تھی نہ جہانگیر کے۔

انہی کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔ جب وہ اداکاری کے حوالے سے وہ باتیں کرتی جو وہ ماسٹر ابراہیم کے سامنے کر رہی تھی اور وہ سمجھ رہے تھے۔

”میں نے کبھی نہیں ایسے شکوہ کرتے نہیں دیکھا مومن!“ ماسٹر ابراہیم نے لمبی خاموشی کے بعد اس بار بڑی سنجیدگی سے اُس سے کہا تھا۔
 ”آج اُس رزق کے لیے کسی کے ہاتھوں ذلیل ہو کر آئی ہوں جس کے لیے ماشاء اللہ کہہ رہے تھے۔“
 مومن اُن سے یہ جملہ بولنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں سکی۔ اُس نے سر اٹھا کر ماسٹر ابراہیم کو دیکھا پھر عجیب بے بسی سے مسکرائی۔

”آپ سے کہانا..... میں پاگل ہو رہی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ ماسٹر ابراہیم کچھ کہتے، حویلی کا دروازہ کھول کر ایک اور لڑکی اندر صحن میں داخل ہوئی۔ مومن اور ماسٹر ابراہیم بے اختیار اُس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ وہ بھی وہاں کام کرنے والوں میں سے تھی۔ ایک ہلکی نی شرٹ اور جینز میں ملبوس بے حد ماڈرن حلیے میں لیکن سر کے گرد ایک حجاب اوڑھے..... ماسٹر ابراہیم کے پاس ہر طرح کے اسٹوڈنٹ آتے تھے ہر حلیے میں..... لیکن اس مقصد کے لیے سب کا جذبہ ایک جیسا تھا یا پھر وہ اس جگہ کا اثر تھا۔ اپنے جوتے اتارتے ہوئے وہ لڑکی اب ماسٹر ابراہیم کو سلام کر رہی تھی اور ساتھ ہی مشکل اُس حجاب کو گرہیں لگا لگا کر سنبھال رہی تھی جو اُس نے شاید صرف یہ کام کرتے وقت ہی اوڑھا ہوگا زندگی میں۔ ماسٹر ابراہیم نے موضوع گفتگو وہیں بدل دیا تھا اور مومن نے اپنا جھکا ہوا سر مزید جھکا کر اپنی سرخ آنکھوں کو اُس لڑکی سے چھپایا تھا۔

☆☆☆

”قلب مومن فلمیں نہیں بنانا جیسے اپنے ہاتھوں سے مجسمے تراشتا ہے جو فلم دیکھنے والوں کے دل اور ذہن میں بس جاتے ہیں۔ وہ اپنی ہیروئنز کو نمائشی پٹلی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اور ایک فیمنسٹ ہونے کے ناتے یہ میری اس سے ایک فلم ڈائریکٹر کے طور پر واحد شکایت ہے۔ اس کی Diva اس کی فلم میں ہیرو کے سامنے ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت اور اہمیت نہیں رکھتی۔ اپنے سارے گھیر اور سحر سے سینما بینوں کو سحر زدہ کرنے اور سال کی سب سے بڑی کمرشل ہٹ دینے کے باوجود۔“

یٹنا قلب مومن کے آفس میں میگزین کے ایک آرٹیکل کا آخری پیرا گراف پڑھ رہی تھی جب اپنی آفس چیئر پر جھولتے ہوئے مومن نے اُسے ٹوکا تھا۔

”تبصرہ نگار کون ہے؟“ اس کا لہجہ بے حد تنکھا تھا۔

”صدف سحر۔“ یٹنا نے اس مشہور بلاگر اور فلمی نقاد کا نام لیا جو سوشل میڈیا کی ریویو کوئن مانی جاتی تھی۔

”آخری چند جملوں کے علاوہ تو بہت اچھا ریویو دیا ہے اُس نے ہمیں اور ہماری فلم کو۔“ یٹنا نے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے جو اچھے نظر نہیں آرہے تھے۔

”آخری چند جملے بھی کیوں لکھے ہیں اس آرٹیکل اور ویب سائٹ میں..... جب ہم فائو سٹار ریویو کے لیے بے کر رہے ہیں تو وہ کیسے اس طرح کے منٹس کر سکتی ہے میرے اور میری فلم کے بارے میں۔“ قلب مومن واقعی خفا تھا۔

”میری بات ہوئی تھی صدف سے۔ وہ کہہ رہی تھی بلینس رکھنے کے لیے آخر میں یہ چند لائنز شامل کی ہیں ساری تعریفیں ہی ہوں تو پھر پڑھنے والے شک کرتے ہیں کہ پیسے لے کر ریویو لکھ دیا ہے۔“

یٹنا نے وضاحت کی۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے مختلف میگزینز اور ویب سائٹس پر قلب مومن کی فلم کے بارے میں آنے والے مختلف تبصرے اُسے پڑھ کر سنار ہی تھی اور اس میں بے لاگ اور لفافہ دے کر کرائے گئے دونوں طرح کے تبصرے تھے اور اب صدف سحر کا وہ ریویو قلب مومن کو جیسے لڑ گیا تھا۔

”یہ اُن کا مسئلہ ہے، ہمارا نہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اگر ایک ویب سائٹ کو پیسے دے کر ایک ریویو لکھوا

رہے ہیں تو وہ ہمارے خلاف ایک لائن بھی کیسے لکھ سکتے ہیں۔" قلب مومن نے ہمیشہ کی طرح دو ٹوک انداز میں کہا۔

"میں دوبارہ بات کرتی ہوں صدف سے اور دیکھتی ہوں، اس کا کیا عمل نکالا جاسکتا ہے۔" ٹیٹا نے مدعا اٹھایا۔ انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ قلب مومن اُس سے کچھ کہتا دروازہ کھلا تھا۔

"ہیلو۔" یہاں دروازے میں کھڑے کھڑے اندر جھانکتے ہوئے مومن کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔

"اوہ ہیلو۔" مومن اُسے دیکھ کر جواباً مسکرایا۔ ٹیٹا کرسی سے اٹھ گئی تھی اس نے باہر جاتے ہوئے اٹھا آئی ہوئی یہاں سے ہیلو ہانے کی اور قلب مومن ٹیبل پر پڑا اپنا لپ ٹاپ بند کرنے لگا تھا۔

"میں بس رومٹ میں قارغ ہوتا ہوں پھر چلتے ہیں۔" مومن نے تیزی سے اپنی سکرین پر کھلی ہوئی ففٹ ویڈیو کو بند کرنا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے اصل میں تم سے بڑی ضروری بات کرنا تھی آج۔"

یہاں اُس کی بات کے جواب میں کسی تمہید کے بغیر اپنے مدعا پر آتے ہوئے کہا۔ قلب مومن نے لپ ٹاپ بند کرتے ہوئے چونک کر اُسے دیکھا۔

"ہاں کرو۔"

"تم سے ضوفی کے بارے میں بات کرنی تھی۔"

"کون ضوفی؟" قلب مومن بے اختیار الجھا۔

"یار اوہ دوست جسے میں تمہاری پارٹی میں ساتھ لائی تھی اور تم سے ملوایا تھا۔ وہ اسمارٹ، ہینڈسم، گڈ لکک ماڈل۔" یہاں اُسے تفصیلات دے کر جیسے اُس کی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کی۔ قلب مومن کو یک دم وہ یاد آیا تھا۔

"اوہ اچھا..... وہ لڑکا..... اُس کے بارے میں کیا بات کرنا تھی؟"

مومن نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

"وہ بھی تمہاری فلم کے لیے آڈیشن دینا چاہتا ہے۔" یہاں بے ساختہ کہا۔

"male lead تو میں فاضل کر چکا۔" قلب مومن نے بے ساختہ کہا۔

"تو کسی اور رول کے لیے دیکھ لو اُسے۔" یہاں فوراً سے پیش تر کہا۔ "تمہارے ساتھ کام کرنے کا بہت اشتیاق رکھتا ہے وہ اور میں نے وعدہ بھی کیا ہے اُس سے۔"

"اُس نے بہت زیادہ متاثر نہیں کیا مجھے۔" قلب مومن نے یہاں کو بخور دیکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

"تم کیا بات کر رہے ہو، اتنی آفر آرہی ہیں اس کے پاس۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ وہ کرے اُن آفرز کو قبول۔" مومن نے جواباً کہا تھا۔

"وہ تمہارا فرین ہے اور تمہارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے..... اور مجھے نہیں پتا مومن.....! میں نے وعدہ کیا ہے اس سے۔ تمہیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اب۔"

یہاں بڑے ناز سے اٹھلاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ مومن تب تک اپنا بیگ بند کر کے کھڑا ہو چکا تھا۔

"نی الحال تو گھر چلتے ہیں۔ تمہیں دادا سے ملوانا ہے پھر بعد میں دیکھوں گا، کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں مگر مجھے عورتوں کو سیر می بنا کر آگے بڑھنے والے مرد اچھے نہیں لگتے۔"

اُس نے اٹھتے اٹھتے یہاں سے کہا تھا شاید اُسے ضوئی کے لیے یہاں کی دکالٹ اچھی نہیں لگی تھی۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ بیسٹ فرینڈ ہے وہ میرا۔“ یہاں سے جیسے احتجاج کیا تھا مومن جب تک اپنا بیک اٹھائے اُس سے باہر نکل چکا تھا۔
 وہ کچھ تلملے ہوئے انداز میں اُس کے پیچھے آئی تھی اس کے ہاؤس کے آگے یقین تھا، قلب مومن اُسے انکار نہیں کر سکتا تھا اور اب وہ اُس فلم میں ضوئی کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ ضرور نکالے گا۔

☆☆☆

”انٹریئر چھینج کیا ہے تم نے۔“ اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی یہاں سے جیسے کچھ چونک کر اُس سے کہا تھا۔ اس کے لاؤنج کی دیواروں پر اسے بھی وہ نیوڈ پینٹنگز اور وہ عریاں جیسے غائب تھے جو وہاں چند دن پہلے موجود تھے اور جو قلب مومن کے ذوق جمال کا اظہار تھے۔
 ”کچھ دنوں کے لیے ہٹایا ہے انہیں۔“ قلب مومن نے جواباً اس سے کہتے ہوئے اپنا بیک لاؤنج میں رکھا۔

”کیوں؟“ یہاں سے حیرانی سے پوچھا۔
 ”کچھ زیادہ ہی نیوڈ تھا سب کچھ۔“ مومن نے جواباً مسکرا کر عجیب نام انداز میں کہا۔
 ”تو کیا ہوا؟ آرٹ تھا۔“ یہاں سے اُس کے انداز پر حیران ہوئی۔
 ”دادا ہیں ابھی یہاں تو بس جب تک وہ یہاں ہیں، میں یہ سب ان کے سامنے نہیں رکھ سکتا۔“ مومن نے بالآخر اُسے اصلی وجہ بتائی۔

”کنز روٹیو ہیں وہ؟ برا سمجھتے ہیں؟ برا بھلا کہتے ہیں۔“ یہاں سے بے ساختہ کہا۔
 ”نہیں۔“ مومن نے مختصر کہا۔
 ”تو پھر؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”کیلی گرائی کرتے ہیں وہ قرآن پاک کی آیات تو بس میں نے سوچا، شاید انہیں برا نہ لگے۔“
 مومن نے جیسے وضاحت دی تھی جو وہ دینا نہیں چاہتا تھا اور تب ہی اُس نے دادا کو لاؤنج میں آتے دیکھا۔
 جنہیں شکور بلا نے گیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس سے پہلے کہ وہ اُن سے کچھ کہتا، انہوں نے خوش دلی سے سلام کیا تھا۔ یہاں سے جواباً وعلیکم السلام کہتے ہوئے مومن کو دیکھا یوں جیسے یہ جاننا چاہ رہی ہو کہ اب آگے کیا کہے۔
 ”دادا! یہ یہاں ہے میری کلوز فرینڈ اور یہاں! یہ میرے دادا ہیں۔“ مومن نے دونوں کا تعارف کرایا تھا۔
 عبدالعلی نے اُس لڑکی کو بغور دیکھا جس کا تعارف مومن کروا رہا تھا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جسے مومن نے اُن سے متعارف کروایا تھا۔

”مومن بتا رہا تھا، آپ کیلی گرائی کرتے ہیں۔ بڑی تعریف کر رہا تھا آپ کی۔“ یہاں سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

اس کے جملے پر عبدالعلی اور قلب مومن نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور جیسے دونوں نے ہی بیک وقت نظریں چرائیں پھر عبدالعلی نے یہاں سے کہا۔
 ”مومن بھی تو کرتا ہے کیلی گرائی۔“ یہاں سے جیسے کرنٹ لگا۔

”سیر۔ سلی؟“ اس نے مومن کو یوں دیکھا جیسے اس نے یہ راز نہ بتا کر کوئی گناہ کیا ہو۔ ”کیلی گرائی آنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ میں کیلی گرائی کروں۔“ مومن نے نام

انداز میں کہا یوں جیسے وہ اس انکشاف کے ہونے پر پریشان ہوا تھا۔

”نہیں بھی کرتے تو بھی تم نے سیکھی تو ہے نا۔“ نیہا اب بھی متاثر تھی۔

”ہاں.....“

بے حد خوشیہ انداز میں نیہا کو بتایا تھا ان کے اس انداز سے مومن کی ندامت میں اور اضافہ ہوا تھا۔

”بچپن کا شوق تھا دادا.....“

”اللہ تعالیٰ کا نام لکھنے والے ہاتھ اللہ کا نام لکھنا چھوڑ تو سکتے ہیں، بھول نہیں سکتے۔ تم جب بھی خطاطی کرو گے، بہت اچھی کرو گے۔“

عبدالعلی نے جواباً اس سے کہا تھا۔ نیہا اس ساری گفتگو کے دوران کسی خاموش تماشائی کی طرح کھڑی رہی تھی۔

”میں کپڑے بدل لوں پھر چلتے ہیں۔“ ایک لمحہ کی کچھ عجیب سی خاموشی کے بعد مومن نے ایک دم دادا کے بجائے نیہا سے کہا اور کمرے سے نکلنے ہی والا تھا جب اُس نے نیہا کو کہتے سنا۔

”دادا! وہ اشار ڈائریکٹر ہے۔ کیلی گرافی سٹارڈم تھوڑا دے گی اُسے۔ آپ نے اُس کی فلمیں دیکھی ہیں؟“

مومن بے اختیار پلٹا اور پچھتاہوا تھا۔ جو موضوع گفتگو بدلنے کے لیے وہ وہاں سے جا رہا تھا، وہ بڑا خطرناک موڑ پر آ گیا تھا۔

”نہیں، میں نے نہیں دیکھی۔“ اس نے عبدالعلی کو مدہم آواز میں کہتے سنا۔

”اوہ! آپ کو دیکھنا چاہیے انہیں۔“ نیہا بے حد پر جوش انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”مومن عورت کو جس طرح اسکرین پر پیش کرتا ہے۔ آؤ سمجھو۔ ڈریم ووٹین بنا دیتا ہے وہ اپنی ہیروئن کو..... دیو اشار۔“

نیہا بولتی جا رہی تھی اور عبدالعلی خاموشی سے سن رہے تھے اور پھر انہوں نے گردن موڑ کر اُس دروازے کو دیکھا جس پر ہاتھ رکھے مومن کھڑا تھا۔ یوں جیسے وہ جانتے تھے کہ وہ اب بھی وہیں تھا۔ اُن کی آنکھوں میں کچھ ایسی چیز جھلکی تھی کہ وہ وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ پلٹ کر دروازہ کھول کر وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے سارا سکرپٹ یاد ہو گیا ہے۔“

جہانگیر نے فاتحانہ انداز میں مومن سے کہا، وہ اُس ڈرامہ کا اسکرپٹ پڑھ رہا تھا جو مومنہ کر رہی تھی اور وہ کچھ دیر پہلے بنی چائے اور بسکٹ لیے اس کے پاس آ کر صحن کی چار پائی پر آ کر بیٹھی تھی جس پر وہ نیم دراز تھا۔

”اچھا سناؤ پھر؟“ مومنہ نے مسکرا کر جواباً اُس کے ہاتھ سے اسکرپٹ لیا اور آلتی پالتی مار کر چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”سین نمبر؟“ جہانگیر بھی فوراً تیار ہوا تھا۔

”سین نمبر 13..... نہیں 18 ہیرو نائل اور آگینے کا سین۔“ مومنہ نے چیلنج کرنے والے انداز میں اسکرپٹ کے صفحے اُلٹتے پلٹتے اس سے کہا۔ ایک لمحہ سے بھی پہلے جہانگیر نے کھٹ سے ہیرو نائل کا ڈائیلاگ دہرایا تھا۔

”ارے تم غصہ کیوں کھا رہی ہو؟“ وہ کہہ کر رُک کا پھر اس نے مومنہ سے پوچھا۔

”ہیروئن کے بھی سنا دوں؟“

”چلو، ہیروئن کے میں سناتی ہوں۔ تم بس ہیرو کے بولو۔“ چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے مومنہ نے اُس سے کہا اور ساتھ ہی اگلا ڈائیلاگ دہرایا۔

”غصہ کھانے والی بات ہے۔“

”خوب صورت لگ رہی ہو۔“

”کوئی۔“

”تقریب کروں تو غصہ کروں تو غصہ۔ اب مجھے بھی غصہ آنے لگا ہے تم پر۔“

”تو ٹھیک ہے۔ شمع کرو یہ سب کچھ۔“

”آخر وہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے میرا۔“

”تمہارا نہیں ہے اس کا ہے۔“

”وہ بھی نہیں ہے۔“

”بھائی ہوتا پھر تم اس کے۔“

”وہ تو تمہارا ہوں اس سکرپٹ میں۔“ روانی سے ہیرہ کے ڈائیلاگز تو تھے کی طرح دہراتے ہوئے

جہاں گیارہ والا آخر ڈائیلاگ بھولا اور اس نے اگلا جملہ اپنے پاس سے بولا اور مومن نے ہاتھ میں پکڑا سکرپٹ بے اختیار اس کے کندھے پر دھرتے ہوئے اس سے کہا۔

”بھول گئے تات۔“ جہاں گیارہ والا قاتحانہ انداز میں ہنسا تھا۔ یہ ان دونوں کا بہت پرانا کھیل تھا۔ اسکرپٹ اسکرپٹ کھیلتا۔ جو وہ ایک بار پھر سے کھیل رہے تھے اور اب ڈائیلاگز بھول جانے پر ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے جا رہے تھے۔ بچوں کی طرح۔

”کیا ہوا ہے تم دونوں کو؟ کس بات پر ہنس رہے ہو؟“ ٹریڈا بالکل اسی وقت اندر کمرے سے نکلی تھی اور اب ان دونوں کو بچوں جیسے دیکھ کر ہکا بکا ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ مومن کچھ کہتی، اس کا فون بجنے لگا تھا۔ اپنی ہنسی پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مومن نے فون دیکھا۔ وہ اقصیٰ کی کال تھی۔

”تمہیں تو لگتا ہے داؤد نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔“ اس کی آواز سننے ہی اقصیٰ نے کہا تھا۔

”کیا؟“ مومن حیران ہوئی تھی۔

”تمہارے آڈیشن کا۔“

”کیسے آڈیشن کا؟“ مومن مزید حیران ہوئی تھی۔

”تم ہنس رہی تھیں تو میں بھی تمہاری بات ہوئی ہے اس سے۔ بہت بڑی خوش خبری ہے تمہارے لیے۔ لاہور جا رہی ہو تم۔“ اقصیٰ اب پر جوش انداز میں اسے بتانے لگی تھی۔ ”داؤد نے تمہاری شوریل اور قلب مومن کی فلم کے لیے ہونے والے آڈیشن کی فونج بھیجی تھی کسی کو۔ ہالی ووڈ کی کسی فلم کی کاسٹنگ ہو رہی ہے یہاں اور پاکستان میں ہی شوٹنگ ہوئی ہے اس کے کچھ حصہ کی۔ تمہیں آڈیشن کے لیے بلوایا ہے ان لوگوں نے تمہاری شوریل دیکھ کر۔ تو بس تم تیاری پکڑو لاہور کی۔“

چند لمحوں کے لیے مومن جیسے اس کی بات سمجھ ہی نہیں پائی۔

”تم مذاق کر رہی ہو؟“ اس نے کہا تھا۔

”یار مذاق کروں گی تم سے۔“ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہوں اور خوشی سے بے قابو ہو کر تمہیں فون کر رہی ہوں۔“ اقصیٰ نے اسے ڈانٹا تھا۔

”تم ہالی ووڈ کی فلم کے آڈیشن کی بات کر رہی ہو؟“ مومن کو لگا، اس نے کچھ فلفلا سنا تھا۔

”ہاں یار امریکہ اور پاکستان میں شوٹنگ ہے اس کی اور شوٹنگ ہے بھی جلدی۔ پہلے کچھ انڈین ایکٹرز کو لیا ہوا تھا انہوں نے لیکن ویزا پر اٹھو ہو رہے ہیں انہیں تو اب فوری طور پر یہاں کاسٹنگ کر رہے ہیں۔“

قصی دوسری طرف سے کہہ رہی تھی لیکن مومنہ جہانگیر کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ جو ہالی ووڈ اور آڈیشن کے لفظ اُس کی زبان سے سن کر اس وقت یک دم ہی بے حد پُر جوش ہو گیا تھا۔

”تو اب؟“ مومنہ کو اب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”بس تم تیاری کرو..... داؤد بھی کال کرے گا تمہیں..... ٹکٹ اور قیام کے انتظامات بھی وہی لوگ کریں گے..... اچھا بس سین آگیا ہے میرا، بعد میں بات کرتے ہیں تو تفصیل بتاتی ہوں تمہیں۔“ قصی نے یک دم عجلت میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

”کیا ہوا آپ؟..... ہالی ووڈ کی فلم کے لیے آڈیشن ہو رہا ہے؟“

فون بند کرتے ہی جہانگیر نے اُس سے پوچھا تھا اور صحن میں تار پر کپڑے ڈالتی ہوئی ثریا بھی پاس آ گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے مومنہ کا دل جا ہا، وہ کوئی جھوٹ بول دے۔ وہ انہیں پھر سے اُمید اور نا اُمیدی کے دھاگے سے باندھنا نہیں چاہتی تھی۔ فلم اُس کا جنون نہیں تھا مگر جہانگیر اور اُس کے گھر والوں کا تھا اور وہ قلب مومن کے آڈیشن کی ناکامی کے بعد والی صورت حال کا سامنا دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر جتنی دیر میں وہ کوئی جھوٹ گھڑ پاتی۔ جہانگیر نے اُس کی خاموشی سے خود ہی جواب اخذ کر لیا تھا۔ وہ بڑے پُر جوش انداز میں ثریا کو فون پر ہونے والی گفتگو بتا رہا تھا۔

”آپا کی سلیکشن ہوئی ہے، ہالی ووڈ کی کسی فلم کے آڈیشن کے لیے اور آپالا ہو رہا ہے ہیں۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ مومنہ نے ثریا کو بے اختیار ہاتھ دعا سیہ انداز میں اوپر اٹھاتے دیکھا۔

”آڈیشن کے لیے سلیکشن ہوئی ہے اماں! انہوں نے کاسٹ نہیں کیا مجھے ابھی۔“ مومنہ نے بے اختیار اُن کی توقعات پر بند باندھنے کی کوشش کی تھی۔

”وہ بھی ہو جائے گا ان شاء اللہ..... میں تمہارے ابا کو تو بتاؤں ذرا..... کہاں کھڑے ہیں۔“ ثریا اسی جوش و خروش سے کہتے ہوئے باہر گلی کا دروازہ کھول کر سلطان کو ڈھونڈنے نکل گئی تھی۔

”آپا! تم نے بہت بڑا اشار بن جانا ہے..... بتا رہا ہوں میں تمہیں..... ہالی ووڈ میں کام کرو گی۔ پھر آسکر لینے جاؤ گی..... پھر اسپینج کرنا اور میرا تھینک یو کرنا کہ اگر جہانگیر نہ ہوتا تو.....“ مومنہ نے چائے میں لسکٹ کا بچا ہوا ٹکڑا ڈبوتے ہوئے جہانگیر کی بات کاٹی۔

”پھر تمہاری آنکھ کھل جائے گی اور جب آنکھ کھل جائے تو تم مجھے بھی جگا دینا۔“ وہ کہتے ہوئے چار پائی سے اٹھ گئی تھی۔

”آپا! دیکھ لینا تم.....“ جہانگیر کی آواز اُس کے تعصب میں آئی تھی مگر مومنہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

☆☆☆

وہ ایک جمائی لیتے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ چابی سے کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ شکور اس وقت سوچکا ہوتا تھا اور وہ اُسے نہیں جگاتا تھا۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اُسے ٹیرس پر ٹہلتے دادا دکھائی دے۔ قلب مومن نے بے اختیار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اُس وقت تین بجنے والے تھے۔ عبدالعلی نے بھی لاؤنج کی گلاس وال سے اُسے دیکھ لیا تھا اور وہ اندر آ گئے تھے۔

”آپ اب تک جاگ رہے ہیں؟“ مومن نے اُن کے اندر آتے ہی اُن سے کہا تھا۔

”ہاں تہجد کے لیے اٹھا تھا پھر تمہارا انتظار کرنے لگا۔ تم بہت دیر سے آتے ہو رات کو واپس..... جب آیا ہوں تمہارے ساتھ بیٹھنے کا وقت ہی نہیں مل رہا۔“

ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتے ہوئے۔ مومن بھی دوسرے صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں بس اگلی فلم کی تیاری کر رہا ہوں..... ایسی ہی ہے میری زندگی آج کل۔“ مومن نے گہرا سانس لے کر آنکھیں رگڑیں اور صوفہ سے ٹیک لگائی۔

”ایسی ہونا تو نہیں چاہیے۔“ عبدالعلی نے جواباً اُس سے کہا تھا۔

”آپ کو نیہا کیسی لگی؟“ مومن نے یک دم موضوع بدلا۔

”نیہا؟“ عبدالعلی کو فوری طور پر وہ یاد نہیں آئی تھی۔

”اس دن ایک لڑکی سے ملوایا تھا نا آپ کو، اُس کی بات کر رہا ہوں۔“

مومن کو حیرانی ہوئی، دادا نیہا کو اتنی آسانی سے کیسے بھولے تھے۔ وہ اتنی ”عام“ تو نہیں تھی کہ اُن کی یادداشت کا حصہ بھی نہ بن پاتی۔

”اوہ ہاں..... اچھی لڑکی ہے۔“ عبدالعلی کو یک دم یاد آیا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں اُس سے۔“ مومن نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ اُس کے فیصلے ایسے ہی ہوتے تھے اچانک اور خود کردہ۔

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔“ عبدالعلی نے جواباً مدھم آواز میں کہا۔ مومن دھیمے سے ہنسا۔

”آپ کو ہر بات کا اندازہ پہلے ہی کیسے ہو جاتا ہے؟“

وہ بھی ہنس کر اُسے تھے پھر انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔

”صرف تمہارے بارے میں ہوتا ہے یہ۔“

”نہیں، مجھے لگتا ہے آپ کو ہر چیز کا پہلے سے پتا ہوتا ہے۔ کوئی جن ہے آپ کے پاس۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا اور عبدالعلی اُسے بغور دیکھتے مسکراتے رہے پھر انہوں نے یک دم اُس سے کہا۔

”تم خوش ہو قلب مومن؟“ آواز دھیمی تھی لہجہ نرم لیکن سوال عجیب تھا۔ مومن عجیب طرح سے ہی کھٹکا تھا۔

”آپ نے کیا پوچھا۔“ اُس نے جیسے دوبارہ سوال کی تصدیق چاہی۔

”تم خوش ہو؟“ انہوں نے نظریں اُس کے چہرے پر جمائے ان ہی الفاظ میں اپنا سوال دہرایا۔ مومن بے اختیار ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا لیکن اُس نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”بہت..... بہت زیادہ۔ بلکہ بے تحاشا۔“ اُس نے گہرا سانس لے کر بے حد خوش نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”لگتے کیوں نہیں ہو مجھے؟“ عبدالعلی کے اگلے جملے نے مومن کی مسکراہٹ کو ماند کیا تھا۔

”میرا لائف سائل دیکھیں دادا..... میری شہرت، میری کامیابی..... گھر، کیریئر..... میرے پاس سب کچھ ہے جو میری عمر کے کسی لڑکے کا خواب ہوگا۔ پھر خوش نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

”شاید غلط بات کر گیا ہوں..... بوڑھا ہو گیا ہوں..... بعض دفعہ غلط سوال پوچھ بیٹھتا ہوں..... لیکن میں تمہیں ہمیشہ خوش ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“ عبدالعلی کہہ رہے تھے اور وہ سن رہا تھا۔ ایسی بات انہوں نے پہلی بار کی تھی۔

”سو جاؤ تم اب..... تھکے ہوئے ہو گے۔“

وہ کہتے ہوئے یک دم اُٹھ گئے تھے لیکن مومن وہیں بیٹھا رہا تھا۔ بعض سوال جیسے انسان کو آئینے کے سامنے لا بٹھاتے ہیں اُس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ خوشی کا وہ کون سا پیمانہ تھا جس پر اُس کے دادا نے اُسے پرکھ کر یہ نتیجہ نکالا تھا۔ وہ کچھ دیرو ہیں اُن کے جملوں کی گونج میں بیٹھا رہا تھا۔ پھر اُٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو کنسول

کے آئینے نے ایک بار پھر جیسے اُس کا راستہ روکا تھا۔ وہاں اُس کا عکس نظر آ رہا تھا اور عبدالعلی کے سوال کی گونج..... کیا وہ چہرے سے ناخوش لگ رہا تھا.....؟ لیکن کیوں؟..... وہ تو ناخوش نہیں تھا۔ وہ تو ”خوش“ تھا پھر دادا اُسے ان بھول بھلیوں میں کیوں الجھا کر گئے تھے۔

☆☆☆

وہ سیٹ پر اقصیٰ کے انتظار میں پچھلے ایک گھنٹہ سے بیٹھی ہوئی تھی اور بالآخر وہ اپنے سین سے فارغ ہو کر آگئی تھی اور آتے ہی مومنہ کو دیکھ کر اُس نے بڑی گرم جوشی سے اُسے گلے لگایا تھا۔

”مبارک..... مبارک..... مبارک.....“

”مجھے اب ڈر لگ رہا ہے کہ اگر آڈیشن میں فیل ہوئی تو تم نے ملامت بھی اتنی ہی کرنی ہے جتنی مبارک باد دے رہی ہو۔“ مومنہ نے اُس سے کہا۔

”خواہ مخواہ میں ہی..... ایک منٹ ذرا بیگ میں سے ڈھونڈ لوں میں..... ایک تو پتا نہیں چیزیں جاتی کدھر ہیں میری..... رکھو کہیں ملتی کہیں سے ہیں۔“ وہ اپنے بیگ کی زپ کھولے اُس کے اندر موجود سامان کو کھنگالنے میں مصروف تھی۔

”ہاں، یہ رہا۔“ اُسے بالآخر وہ لفافہ مل گیا تھا جو وہ ڈھونڈ رہی تھی۔

”تمہارے آڈیشن کے لیے کال لیٹر، تمہارا ٹکٹ اور ہوٹل میں بکنگ کا واؤچر..... تینوں چیزیں ہیں اس میں..... پہلے کبھی لاہور گئی ہو؟“ اقصیٰ کو اُسے لفافہ تھمتے ہوئے اچانک خیال آیا۔ مومنہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”کوئی بات نہیں، بس ایئر پورٹ سے ٹیکسی پکڑنا اور اس ہوٹل میں پہنچ جانا..... یہ پی سی لاہور کے قریب ہی ہے اور تمہارا آڈیشن وہاں ہے۔“ وہ بڑی تیز رفتاری سے اُسے بتاتی جا رہی تھی۔

اسٹنٹ دور سے اُسے اگلے سین کے لیے تیاری کی آوازیں لگا رہا تھا اور وہ ایک بات مومنہ سے کرتی پھر اگلا جملہ اسٹنٹ سے کہتی، عجیب ہڑبڑاہٹ میں تھی۔

”بس اب میرا سین آرہا ہے۔ میں ڈراپ کر دیوں گی تمہاری فلائٹ والے دن تمہیں اور واپس پک بھی کر لوں گی۔ بس تم کوئی اچھی خبر لے کر آنا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”تم نے کیوں نہیں کوشش کی اس آڈیشن کے لیے۔“ مومنہ نے یک دم اُس سے کہا۔

”کی تھی، مجھے شارٹ لسٹ نہیں کیا انہوں نے۔“ اقصیٰ نے اُسی طرح کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے زیادہ اُمید بھی نہیں تھی۔“ اُس نے مومنہ کے تاثرات دیکھ کر اُسے جیسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یار بس جا رہی ہوں میں..... دو دن سے میری اور اس اسٹنٹ کی لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ پھر ڈائریکٹر کے کان بھرے گا میرے خلاف اگر ایک بار بھی اور آواز لگانی پڑی تو.....“

وہ کہتے ہوئے تقریباً بھاگتی ہوئی گئی تھی۔ مومنہ اُس لفافے کو کھولتے ہوئے سیٹ سے باہر آگئی تھی۔ ٹکٹ اور واؤچر کے بعد اُس نے بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر کال لیٹر کو کھولا اور جب..... وہ شرائط و ضوابط پر آئی، اس کا دل بری طرح بوجھل ہوا تھا۔ فون نکال کر اُس نے اقصیٰ کو کال کی۔ فون چند لمحے بجتا رہا پھر فوراً ہی کال ریسیو کی گئی۔

”تم مجھے کٹ کر داکر ہی سکون کا سانس لوگی مومنہ!“ اقصیٰ اب اُس پر تقریباً دھاڑی تھی۔

”تم نے کیوں کیا یہ؟“ مومنہ نے بے ساختہ اُس سے کہا۔

”کیا؟“ وہ یک دم دھیمی پڑی تھی۔

”وہ لوگ تو ایر ٹکٹ اور کاموڈلیشن نہیں دے رہے..... شرائط میں لکھا ہے..... یہ تم نے کیا ہے نا۔“ دوسری

طرف اقصی خاموش ہوئی تھی۔

”تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اقصی۔“ مومنہ نے اُس سے کہا۔

”ایک چانس مل رہا تھا اتنا بڑا..... تم نے جانا ہی نہیں تھا یہ پڑھ کر کہ وہ لوگ جہاز کا کرایہ اور اکاموڈیشن نہیں دیں گے..... صرف اس لیے کروایا یہ میں نے۔“ اقصی نے بالآخر اُس سے کہا تھا۔

”میں یہ پیسے واپس کروں گی تمہیں۔“ مومنہ نے جواباً کہا۔

”ہاں ہاں۔ مجھے پتا ہے بہن، بڑی خوددار ہوں..... سب کچھ واپس کر دوں گی تم..... پہلے جاؤ تو۔“ اقصی نے جیسے ہاتھ جوڑ کر اُس سے کہا تھا۔

”تمہاری وجہ سے دنیا مجھے تھوڑی کم کالی لگتی ہے۔“ مومنہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تم ہر چیز دل پر لینا کم کر دو تا تو دنیا اور بھی کم کالی لگے گی۔“ اقصی نے جواباً اُس سے کہا تھا۔

”بس آگئی میری۔“ مومنہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑی تھیں اُس کے لیے وہاں اس وقت بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے اقصی کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں سب کو جو اپنے پر توڑ کر دوسروں کو اڑنے کے لیے دے دیں۔“ مومنہ سلطان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ زندگی میں داؤد اور اقصی کے احسانوں کا بوجھ کیسے اتارے گی..... قرض تو وہ یقیناً اتار ہی دیتی۔

☆☆☆

”سلطان سے میک اپ کروانے کے لیے منتیں کرتے تھے چھوٹے بڑے ایکٹرز، پر میرے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا، حسن جہاں کی فلمیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں پھر اُس کے شوز، پرفارمنسز کتنے تو ملک پھر کر آیا تھا میں اُس کے ساتھ..... انڈیا، جاپان، لندن، دبئی، ترکی..... بس ترکی لڑ گیا۔“

سلطان ہمیشہ کی طرح وہی پرانے قصے لیے بیٹھا ہوا تھا اور ترکی کے نام پر اُس نے ایک اہ بھری تھی۔ اپنے گھر کے برآمدے میں اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے وہ اُس نو جوان لڑکے کا میک اپ کرنے میں مصروف تھا جو فلم میں ملنے والے کسی چھوٹے موٹے رول کے لیے اُس کے پاس بیٹھا میک اپ کروا رہا تھا۔ میک اپ کروانے کے دوران سلطان نے ہمیشہ کی طرح حسن جہاں نامہ کھول لیا تھا۔ اُس کے لیے میک اپ کرتے ہوئے ہر چہرہ جیسے حسن جہاں کے چہرے کا عکس اور بازگشت بن جاتا تھا۔

”بس سلطان بھائی! دُعا کرنا آج ایسی پرفارمنس دے جاؤں کہ چھا جاؤں۔“ اُس لڑکے نے اُس کی باتیں صرف سنی تھیں اُن پر توجہ نہیں دی تھی۔

”ان شاء اللہ..... حسن جہاں بھی سیٹ پر جانے سے پہلے یہی کہتی تھی سلطان سے۔ میں صدقہ دیتا تھا۔ خیرات کی دیگ بنتی تھی پھر حسن جہاں پاؤں رکھتی تھی سیٹ پر اور اگر کبھی مجھے وہم ہو جاتا نا کسی فلم یا پروڈیوسر کے بارے میں تو ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی لیکن حسن جہاں پھر وہ فلم نہیں کرتی تھی۔“

سلطان کے سارے سابقے، سارے لاحقے، سارے حوالے حسن جہاں سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہو جاتے تھے۔ گفتگو کسی بھی زمانے کی کیوں نہ ہوتی۔

”تم کو بھی ایک ایک بات یاد ہے اپنے زمانے کی سلطان بھائی..... اس طرح دہراتے ہو جیسے کل کی بات ہو۔“ وہ لڑکا اب ہنس پڑا تھا اور اُس نے وہ کپڑا اپنی گردن کے گرد سے ہٹا دیا تھا جسے سلطان اُس کے سینے اور کندھوں کے گرد پھیلائے اُس کی پفنگ کر رہا تھا تا کہ میک اپ اُس کی سفید قمیص پر نہ لگے۔

”اپنا زمانہ کل بھی ہو تو بھی سب کو اچھا ہی لگتا ہے اور وہ بھی، وہ کل جو کبھی گزرتا ہی نہیں۔“ سلطان بڑبڑا کر

ہنسا تھا۔

”ہنر تو بڑا ہے سلطان بھائی! تمہارے ہاتھ میں..... پر پیسہ نہیں۔ اتنا نام بنایا تھا تم نے سلطان بھائی! تو تھوڑا پیسہ بھی بنا لیتے۔ میک اپ آرٹسٹ تو سیلون بنا لیتے ہیں اور کچھ نہیں تو گھر کی چھت ہی بنا لیتے۔“ اُس نوجوان کو پتا نہیں کیا خیال آیا تھا کہ سلطان کو چند نوٹ تھماتے ہوئے اُس نے ساتھ میں نصیحت بھی تھما دی تھی۔

”ٹھیک کہتے ہو تم..... سلطان کو پیسہ نہیں جوڑنا آیا۔ سلطان ہی سمجھتا رہا ساری عمر خود کو..... پتا ہی نہیں تھا۔ حسن جہاں کے سورج کی طرح میرا سورج بھی غروب ہو جائے گا۔“ اُس نے جاتے ہوئے گاہک کو دیکھ کر سوچا اور گاہک کے بیرونی دروازے سے باہر جاتے ہی جھومر تالیاں بجا کر اندر آیا تھا۔

”سلطان بھائی! اتنی بڑی بات تم نے جھومر سے چھپالی۔“ اُس نے آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں تالی پیٹتے ہوئے اُس سے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

”کیا چھپالیا تجھ سے جھومر؟“ سلطان نے اپنا میک اپ کا سامان سمیٹتے ہوئے کہا

”لو بھلا جھومر کو نہ پتا چلے گا کہ باجی مومنہ ہالی ووڈ کی فلم میں کام لینے گئی ہے۔“ جھومر نے دو تالیاں اور پیشیں۔

”تجھے کس نے بتایا ہے جھومر؟“ سلطان اُس کی بات پر ہنسا۔

”جھومر کیوں بتائے تجھے جب تو نے نہیں بتایا۔ ارے اس محلے والے کچھ چھپا کر تو دکھائیں جھومر سے۔“ وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ جھومر تھا تو منٹ لیکن محلے کے ہر گھر میں اُس کا آنا جانا تھا اور وہ محلے والوں کی خوشی اور غمی میں سب سے پہلے پہنچتا تھا۔

”بس جھومر! تو دعا کرنا کوئی اچھی خبر لے کر آئے مومنہ۔ ہالی ووڈ میں کام مل جائے تو نصیب بدل جائے گا ہمارا۔ پھر جہانگیر کا علاج ہو جائے گا اور میرا بیٹا کام کرے گا فلموں میں ہیرو بن کر۔“ سلطان نے خوابوں کا چرچہ پھر سے کا تنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

”نیہا آ جاتی ہے تو اُس سے بھی کاسٹیومز اور وارڈروب کا بجٹ ڈسکس کر لو..... پچھلی دفعہ اور بجٹ ہو گیا تھی ہماری وارڈروب۔“ قلب مومن نے ٹینا اور داؤد سے کہا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھے اپنی اگلی فلم کے لیے ایکٹرز کی لگ ٹیسٹ اور وارڈروب کی ڈسکشن کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔

”اس بار ایک دو دوسری ڈائریکٹرز بھی اپروچ کر رہی ہیں وارڈروب کے لیے۔ نیہا مان جائے تو ورائٹی بھی آجائے گی اور وارڈروب کا بجٹ بھی کم ہو جائے گا کیونکہ اُن ڈائریکٹرز کو تو صرف کریڈٹس میں اپنا نام چاہیے۔“ ٹینا نے مومن سے کہا۔ اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرا نہیں خیال کہ نیہا مانے گی کریڈٹس کو شیئر کرنے کے لیے تو ہمیں وہ آپشن سوچنا ہی نہیں چاہیے۔“ بات کرتے کرتے مومن نے گھڑی دیکھی اور اُس نے ٹینا سے کہا۔

”نیہا کو اور کتنا ٹائم لگے گا آنے میں، ذرا چیک کرو..... ہماری تو میٹنگ ختم ہونے والی ہے اور وہ ابھی تک نہیں پہنچی۔“ وہ قدرے ناخوش تھا۔ اس سے پہلے کہ ٹینا کچھ کہتی، کمرے کا دروازہ کھول کر نیہا مسکراتی ہوئی صوفی کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

”ہیلو..... سوری! میں زیادہ لیٹ تو نہیں ہوئی۔“ اُس نے اندر آتے ہی مومن کو مخاطب کیا۔

”بس ایک گھنٹہ۔“ مومن نے جواباً کہا تھا۔ صوفی کو دیکھ کر اُس کے ماتھے پر بل پہلے ہی آ گئے تھے۔

”اچھا۔ پھر تو ٹائم پر ہی ہوں میں۔“ نیہا نے ہنستے ہوئے کندھے اُچکائے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ صوفی

نے بھی یہی کیا تھا۔

”داؤد! جوشہلا کی پریزنٹیشن ہے وہ چلا دیں..... ایکسکوز می۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کچھ دیر کے لے ویٹنگ روم میں بیٹھ جائیں..... ہم لوگ یہ میٹنگ ختم کر لیں۔“ مومن نے پہلا جملہ داؤد سے اور اُس کے بعد ہونے والی ساری بات ضوفی سے مخاطب ہو کر کی تھی۔ جس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرا تھا اور وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن یہاں اُسے روک دیا۔

”تم سے ملوانا تھا میں نے ضوفی کو آج۔ بات ہوئی تھی ناتم سے میری۔“

”آج تو بہت مصروف ہوں میں، اس میٹنگ کے فوراً بعد فنانسرز کے ساتھ میٹنگ لائن اپ ہے میری۔“ مومن نے صاف انکار کیا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس وقت ضوفی پر کیا گزر رہی تھی۔

”صرف دس پندرہ منٹ ہی کی تو بات ہے۔“ یہاں نے اصرار کیا تھا۔

”مجھے اگر پہلے پتا ہوتا تو ضرور، لیکن آج تو پانچ منٹ کے لیے بھی فارغ نہیں ہوں میں۔“ مومن بھی بد لحاظی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔

”یٹنا! تم دو دن بعد ضوفی کے ساتھ میری میٹنگ شیڈول کر دو..... آئی ہوپ اس اوکے دیو ضوفی۔“

اُس نے یہاں کو صاف جواب دے کر پہلے یٹنا اور پھر ضوفی کو مخاطب کیا۔ جس کا رنگ اس وقت اڑا ہوا تھا اور اُس نے قلب مومن کی اس آفر کو بے حد خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے جیسے گھٹنے ٹیکے۔

”نو پرابلم ایٹ آل۔ ڈیٹس اوکے۔“

یٹنا نے اپنے سامنے پڑے لیپ ٹاپ میں ضوفی کی اپائنمنٹ نوٹ کرنا شروع کی ہی تھی کہ یک دم یہاں اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”ایسا کرو، تم میری اپائنمنٹ بھی دو دن بعد ہی کی کر دو کیونکہ آج تو میں بھی اس میٹنگ میں نہیں بیٹھ سکوں گی۔ مجھے بھی کہیں جانا ہے۔“ یہاں نے ضوفی کے اٹھتے ہی اپنے تپور دکھائے تھے۔

”بائے۔“ وہ کہہ کر سیکنڈوں میں کمرے سے باہر گئی تھی۔ ضوفی اُس سے پہلے ہی کمرے سے نکل چکا تھا۔

”یہا..... یہا۔“ مومن نے اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نکلتی چلی گئی۔ مومن اٹھ کر اُس کے پیچھے گیا

تھا۔

وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکلی ہی تھی جب مومن نے اُس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”یہ کیا Childish Behaviour (بچکانہ رویہ) ہے؟“ مومن نے بڑی خفگی سے دبی آواز میں کہا۔

یہاں نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا بازو اُس سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

”بی ہیو پور سیلف۔ اگر تمہیں دوسروں کا احساس نہیں ہے تو دوسرے کیوں تمہارا احساس کریں۔“ اُس کے

لہجے میں بے حد خنجی اور غصہ تھا۔

”تم اُس لڑکے کی وجہ سے مجھ سے جھگڑا کر رہی ہو؟“ قلب مومن کو جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ہاں کر رہی ہوں..... تو؟“ اُس نے بڑی بدتمیزی سے کہا اور تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی۔

زندگی میں پہلی بار مومن کو ایسے رویے کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ کوئی اُس پر کسی دوسرے کو ترجیح دیتا اور وہ بھی وہ

جو اُس کی منگیت تھی۔ گلاس وال سے اُس نے یہاں کو ضوفی کے ساتھ دور جاتے دیکھا تھا، ماؤف ذہن کے ساتھ۔

☆☆☆

میز کے دوسری طرف بیٹھے اُن دونوں افراد نے آپس میں چند سرگوشیاں کی تھیں پھر اُس انڈین نژاد

امریکن عورت نے مومنہ سے انگلش میں کہا۔

”تم گونگی اور بہری ہو اور تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دوست کو قتل ہوتے دیکھا ہے اور تم چھپ کر اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

مومنہ نے بغور اُس عورت کی ہدایات کو سنا تھا اور اُس کا دل ڈوبا۔ تو اُس کے کوئی ڈائیلاگزی نہیں تھے اور وہ اُسے بغیر ڈائیلاگز کے پرفارم کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

”لگتا ہے وقت ہی ضائع کیا یہاں آڈیشن کے لیے آکر..... تین سینز کارول ہے اور بغیر ڈائیلاگ کے میں کروں گی کیا۔“ اُس نے اُلجھے ہوئے انداز میں سوچا تھا۔ وہ عورت اب اُسے سچویشن سمجھا رہی تھی۔

”گونگی اور بہری لڑکی..... مومنہ اب ذہنی طور پر اُس کردار کے اندر اتر رہی تھی جس کو کرنے کی اُسے اس وقت کوئی خواہش تھی نہ مل جانے کی اُمید.....“

پھر بھی وہ پہلا سین پرفارم کرنے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا آڈیشن بہت طویل ہو گیا تھا اور جب وہ آڈیشن کے بعد باہر نکلی تھی تو پھر موجود آڈیشن کے لیے منتظر دوسری فنکاروں نے اُس سے سوال جواب کرنے شروع کر دیے تھے۔ سب کو یہ عجیب تھا کہ اُس کا آڈیشن اتنا لمبا کیوں ہوا تھا۔

اُسے باہر آئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے جب اندر سے ایک لڑکے نے باہر آ کر اُس کے بہت قریب مدھم آواز میں اُس سے ایک دوسرے کمرے میں چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اُس کے ساتھ اُس دوسرے کمرے میں آگئی تھی۔ وہاں وہ انڈین امریکن عورت پہلے سے موجود تھی جو آڈیشن لینے والی ٹیم میں بھی شامل تھی۔ وہاں بیٹھے اُس نے اس بار مومنہ سے بڑے دوستانہ انداز میں بات کرتے ہوئے اُس سے اپنا تعارف کروایا اور پھر اُس سے پوچھا۔

”آپ کچھ دن اور لاہور میں رہ سکتی ہیں؟“ مومنہ اس بار چونکی تھی۔

”ہاں مگر کیا میں اس آڈیشن کے نتیجے کے بارے میں پوچھ سکتی ہوں؟“

وہ عورت جواباً مسکرائی اور اُس نے کہا۔ ”کاسٹنگ ایجنٹ ہی اس سلسلے میں آپ سے بات کرے گا مگر فی الحال ہم آپ کا یہاں قیام بڑھا رہے ہیں اور آپ کو یہیں پی سی میں ٹھہرا رہے ہیں۔“

وہ خوشی کی ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوئی تھی، دل کی تیز رفتار دھڑکن کے ساتھ۔ تو کیا وہ کاسٹ کر لی گئی تھی؟ اُس نے آڈیشن پاس کر لیا تھا؟ وہاں بیٹھے مومنہ سلطان کا دل خوشی سے اُچھلا تھا اور پھر جیسے بے یقینی سے رُکا تھا۔ جہانگیر کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔ کیا واقعی ایک معجزہ ہو گیا تھا..... ہالی ووڈ کی فلم؟

آدھ گھنٹہ کے بعد اُسی کمرے میں کاسٹنگ ایجنٹ موجود تھا۔ وہ ایک پاکستانی تھا اور اُس نے مومنہ کو یہ خوش خبری سنا دی تھی کہ وہ آڈیشن میں منتخب ہو چکی ہے۔ پہلی کال جو مومنہ سلطان نے وہاں سے کی تھی وہ اقصیٰ کو کی تھی جو یہ خبر سن کر دوسری طرف شاید خوشی سے چھلانگیں لگانے لگی تھی۔

”میں نے کہا تھا تمہیں..... دیکھو میں نے کہا تھا نا۔ آئی ایم سوپراؤڈ آف یو۔“ وہ فون پر چلا رہی تھی اور مومنہ ہنس رہی تھی۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے اقصیٰ! صرف تمہاری وجہ سے آج میں یہاں کھڑی ہوں۔“ مومنہ اُس سے اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”بس بس کوئی ضرورت نہیں ان فضول باتوں کی..... کانٹریکٹ سائن ہو گیا کیا؟“

”کل ہوگا۔“

”آئی ٹی اور جہانگیر کو بتایا ہے؟“

مومنہ ہنسی اور اُس نے کہا۔

”نہیں۔ ابھی نہیں بتایا، انہیں کراچی جا کر خود بتاؤں گی، سر پرانزدوں گی۔“
 ”زندگی بدلنے والی ہے مس مومنہ سلطان! تمہاری..... اب مجھے پہچانا مت بھولنا۔“ اقصیٰ نے اُسے جیسے تنک کیا تھا اور وہ ہنس پڑی تھی۔

اور زندگی بدلنے کا یقین اسے تب تک نہیں آیا تھا جب تک اگلے دن اس نے اپنے سامنے پڑا وہ کانٹریکٹ نہیں دیکھا تھا جس پر دس ہزار ڈالر کی سائننگ اماؤنٹ کا اندراج تھا۔ اس کانٹریکٹ پر سائن کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاپٹنے لگا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا اب تک ملنے والا سب سے بڑا معاوضہ تھا اور یہ معاوضہ نہیں تھا۔ یہ اس کی زندگی کے سب مسئلوں کا حل تھا۔ زندگی واقعی اب بدلنے جا رہی تھی۔ وہ اس رقم سے بڑے آرام سے جہانگیر کے گردے ٹرانسپلانٹ کروا لیتی۔ اتنے آرام سے کہ..... اسے بے اختیار رونا آیا تھا اور کاسٹنگ ایجنٹ پریشان ہوا تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ بس میں کچھ جذباتی ہو گئی تھی۔“

وہ آنسوؤں کے درمیان ہنسی تھی۔ دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں اور گال کسی بچے کی طرح رگڑتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اڑ کر واپس کراچی جا پہنچے اور خوشی کے اس لمحے کو ثریا، سلطان اور جہانگیر کے ساتھ منائے اور اسی جذباتیت میں اس نے اس خبر کو سر پرانز رکھنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔

اس نے جہانگیر کے سیل فون پر کال ملانی شروع کی۔ نمبر آف تھا۔ پھر باری باری اس نے سلطان اور ثریا کے نمبر ملانے شروع کیے، کسی نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔

اس نے اقصیٰ کو فون کیا اور کانٹریکٹ سائن کرنے کی خبر بریک کی۔ اسے اس بار اقصیٰ کا رد عمل بے حد عجیب سا لگا تھا۔

”تم واپس کب آ رہی ہو؟“ اقصیٰ نے اس سے پوچھا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



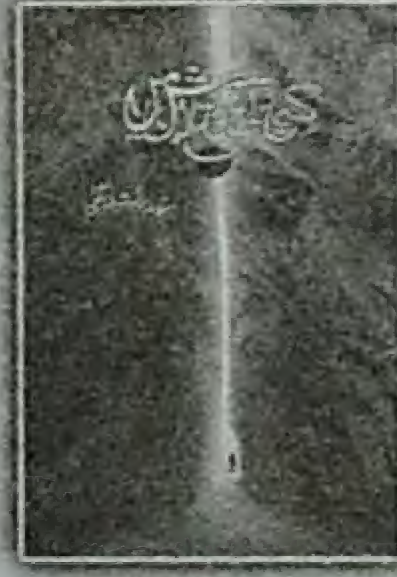
تنزیلہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جبیں
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

”کل رات فلائٹ ہے میری۔“ مومنہ نے اسے بتایا۔
 ”بس ٹھیک ہے پھر کل بات کرتے ہیں مل کر۔“ قصی نے جواباً اس سے کہا۔

”سنو! قصی! تم پریشان ہو کیا؟ سب خیریت تو ہے؟“ مومنہ اُس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
 ”ہاں ہاں..... بالکل خیریت ہے، بس ایک سیٹ پر لڑائی ہو گئی تھی میری تو اس لیے۔“ اُس نے فوراً
 بیشتر مومنہ سے کہا۔

”تم آرام سے اپنا کام کرو۔ ٹینشن مت لو۔“ مومنہ کچھ مطمئن ہوئی۔
 ”میں اماں اور ابا کو فون کر رہی ہوں، وہ کال ریسیو نہیں کر رہے۔ جہانگیر کا فون بھی آف ہے۔“ اُس
 قصی سے کہا۔

”اچھا۔ میں صبح کوشش کرتی ہوں کہ تمہاری بات کرواؤں۔ میری تو آج ہی بات ہوئی تھی ثریا آنٹی سے
 قصی نے جواباً کہا۔

”تم نے اُنہیں بتا دیا؟“ مومنہ نے بے اختیار کہا۔
 ”نہیں بالکل بھی نہیں۔ بس تم آ جاؤ تو بتا دینا۔“
 قصی کے لہجے میں عجیب بے ربطی سی محسوس ہوئی تھی اُسے مگر وہ اُس سے زیادہ دیر بات نہیں کر سکی۔ اُسے
 فلم کی ٹیم کے ساتھ بیٹھنا تھا اور اگلے دن رات تک یہ مصروفیت اسی طرح چلتی رہی اور بالآخر جب وہ کراچی ایئر
 پورٹ پر اترتی تھی تو اُس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

ایئر پورٹ پر داؤد اور قصی نے اُسے ریسیو کیا تھا۔ قصی اُسے دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گئی تھی اور اُس نے
 رونا شروع کر دیا تھا۔ مومنہ نے ہنس کر اُسے خود سے الگ کیا۔

”اچھا اچھا۔ اب اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت خوش ہو مگر یہ سب
 تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے اور اب رونا بند کرو ورنہ میں بھی رو پڑوں گی۔“

اُس نے قصی سے کہا تھا اور داؤد نے آگے بڑھ کر قصی کو اُس سے الگ کیا تھا۔
 گاڑی میں بیٹھے داؤد اُس سے چھوٹے چھوٹے سوال کرتا رہا اور وہ اُسے بڑے پرجوش انداز میں تفصیلات
 بتاتی رہی مگر اس نے نوٹس کیا تھا، قصی مسلسل خاموش ہی تھی۔ وہ بول نہیں رہی تھی۔
 ”تم نے غلط ٹرن لے لیا داؤد..... اس طرف سے تو گھر نہیں آئے گا۔“

ایک غلط موڑ مڑنے پر اُس نے داؤد کو ٹوکا تھا اور داؤد نے جواباً اُس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ مومنہ کو لگا شاید
 اُسے وہاں کچھ کام تھا۔ وہ اب ایک ہاسپٹل کے اندر چلا آیا تھا۔ مومنہ تب بھی کچھ نہیں بولی لیکن اُس کی چھٹی حس
 نے اچانک اُسے الارم دینا شروع کیا تھا۔ اماں اب اتنی دن سے فون نہیں اُٹھا رہے۔ جہانگیر کا فون بند تھا اور داؤد
 اُسے ہاسپٹل کیوں لایا تھا۔ کیا جہانگیر کی طبیعت خراب تھی۔ اُس کا دل جیسے حلق میں آیا تھا۔ پھر داؤد نے گاڑی
 ایک جگہ کھڑی کر دی تھی۔

مومنہ نے اُس عمارت کے اوپر لگی عبارت پڑھی۔ وہ مردہ خانہ تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

تھی۔ میں پانچ چھ سال کی ہوں گی جب بھاگ
بھاگ کر بھابھی کی نومولود منی کے کام کیا کرتی
تھی۔ گڑیا منی کو پکڑ لو۔

”گڑیا منی کو کھلاؤ۔ منی کو گود میں لے کر بیٹھ جاؤ۔
منی کوتالیاں بجا کر ہنساؤ۔ منی کافیڈر لے جاؤ۔“

اماں میرے پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئی تھیں۔
ان کے جانے کے تین سال بعد ابا جی داغ مفارقت
دے گئے تھے۔ میں سب سے چھوٹی تھی، بھائی کی نئی
نئی شادی ہوئی تھی۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں۔
بھابھی اور میری بہنوں کی آپس میں کچھ زیادہیں بنتی

عطیہ خالد

رشتوں کی چال



میرا سونا جاگنا سب منی کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ وہ سوتی تھی تو میں بھی سو سکتی تھی۔ وہ جاگ جاتی تھی تو مجھے بھی جاگنا پڑتا تھا۔ منی بھی مجھ سے بہت مانوس ہو چکی تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔ میرے ہاتھ سے ہی فیڈر پیتی تھی۔ مجھے دیکھتی تھی تو روتے روتے چپ ہو جاتی تھی۔ میری گود میں اسے نیند آ جاتی تھی۔ میں اسے تھکیاں دیتی تو وہ آنکھیں موند لیتی تھی۔ دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی۔ بھابھی بھی تین اور بچوں کی ماں بن گئی تھیں۔ منی کے بعد ایک ایک کر کے سب بچے مجھ سے ہی مانوس ہونے لگے تھے۔ میں نے ہی انہیں پالا پوسا تھا۔ پھر بہنوں کے گھر بچے آئے تو وہ مجھے اپنے گھر بلا کر رکھنے لگی تھیں۔ میں بچوں کو سنبھالتی، ان کے ساتھ کھیلتی۔ انہیں پڑھنے لکھنے میں مدد دیتی۔ بہنوں کے گھر بار بھی دیکھ لیتی تھی۔ کبھی آپا سدرہ بلا لیتی تھیں۔ کبھی آپا سعدیہ۔ خاندان کے لوگ کہتے تھے کہ ”میری صورت میں میرے بہن بھائیوں کو نوکرائی ملی ہوئی ہے۔ کام کروا کروا کر مجھے ہلکان کر دیتے ہیں۔“

مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ دو گھنٹے بھی پڑھ لیتی تھی تو اچھے نمبر لے لیتی تھی۔ ابھی میں اسکول میں ہی تھی کہ میری بہنوں اور بھابھی نے میرے کان میں ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ زیادہ پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میٹرک کر لو کافی ہے۔ میں بھی ہاں میں سر ہلا دیتی تھی۔ مجھے پڑھنے کا شوق تو تھا

لیکن اتنی سمجھ نہیں تھی کہ کرنا کیا ہے۔ میٹرک کے سپرینڈنٹ کے دوران ایک لڑکی میری دوست بن گئی۔ اس کے فادر بینک میں منیجر تھے۔ وہ کہتی تھی کہ وہ بھی بینک میں نوکری کرے گی۔ اسے بہت شوق تھا جاب کا۔ اس نے بینک میں جاب کی کچھ ایسی باتیں بتائیں کہ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ کامرس پڑھوں گی اور بینک میں نوکری کروں گی۔

میٹرک میں میرے نمبرز اچھے آئے تھے۔ بھائی جان سے بات کر کے میں نے اپنا ایڈمیشن

کامرس کالج میں کروا لیا تھا۔ بھابھی اور میری بہنوں کا کافی دنوں تک موڈ خراب رہا کہ میں نے کالج میں ایڈمیشن کیوں لیا۔ اتنا پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں میری بہنوں اور بھابھی کی آپس میں بہت بحثیں لگتی تھیں۔ ورنہ وہ ہر وقت ایک دوسرے کی چغلیاں کرتی رہتی تھیں۔

☆☆☆

سدرہ آپا کی نند اور دیور کی شادی تھی۔ چاہتی تھیں کہ میں ان کے گھر آ کر رہوں۔ گھر اور بچے دیکھوں تاکہ وہ جہیز اور بری کی شاپنگ آرام سے کر سکیں۔ میں ان کے گھر رہنے لگی اور وہیں سے کالج جانے لگی۔ پیچھے بھابھی فون کرنے لگیں کہ اپنے گھر آؤ، کیوں یہاں وہاں بیٹھی ہوئی ہو۔ ”میں نے سدرہ آپا سے گھر جانے کی بات کی تو انہوں نے بھابھی کی چالاکی پر دانت پیستے ہوئے بھائی جان کو فون کیا۔

اگر دودن کے لیے گڑیا کو گھر روک ہی لیا ہے تو تمہاری بیوی کو موت کیوں پڑ رہی ہے۔ ہماری بیوی سی بہن کو نوکرائی بنایا ہوا ہے۔ دودن بہنوں کے گھر رہ لے گی تو کیا آفت آ جائے گی۔“ ”بہنیں کون سا مہارانی بنا کر رکھتی ہیں اپنے گھر۔ گھر کے سب کام کروانی ہیں گڑیا سے۔ جیسے میں جانتی ہی نہیں۔ ہونہہ۔“ بھائی کی جگہ بھابھی نے منہ توڑ جواب دیا تھا۔

کرتے کرتے آپا اور بھابھی کے درمیان بات اڑا بڑھ گئی تھی کہ ایک طرف بھابھی ہو گئیں، ایک طرف دونوں بہنیں۔ آپس میں تینوں کی خوب لڑائی ہو رہی تھی۔ گرمی سردی میں دو ڈھنگ کے جوڑے لے کر دینے کی توفیق تو ہے نہیں بہنوں کو۔ لگی ہیں حق جتانے۔“ بھابھی کو کون روک سکتا تھا۔

”آپ کون سا اسے ہیرے موتیوں میں تول کر رکھتی ہیں۔“ کم آپا بھی نہیں تھیں۔

یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ بھائی جان نے میرا کسی

بھی بہن کے گھر جا کر رہنا بند کر دیا۔ بھابھی کو بھی منع کر دیا تھا کہ مجھ سے کوئی کام نہ لیں۔ جو بہن مجھے گھر رکھنے کے لیے بلائے گی، وہ مجھے جیب خرچ بھی دے گی۔ کالج کی فیس بھی بھرے گی۔ کالج آنے جانے کا خرچہ بھی دے گی۔

اس کے بعد مجھے کسی بہن نے اپنے گھر رہنے کے لیے نہیں بلایا۔ میں خود ہی ان سے ملنے کے لیے چلی جاتی تھی۔ اپنی مرضی سے ایک دو دن رہ لیتی تھی۔ وہ بھی مجھے رکنے کے لیے نہیں کہتیں۔ البتہ مجھے کرپتی رہتی تھیں کہ بھابھی مجھ سے گھر کے کام تو نہیں لیتیں؟

بی کام کرتے ہی مجھے عظمیٰ کے والد کے توسط سے بینک میں نوکری مل گئی تھی۔ عظمیٰ کی شادی ہو چکی تھی مگر اس کے سسرال والوں نے اسے جاب کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے اس کے والد نے اپنی بیٹی کی جگہ مجھے نوکری دلوا دی تھی۔ بینک میں نوکری کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ اگر میں ساتھ ساتھ پڑھتی رہوں گی تو میرا گریڈ بڑھتا رہے گا۔ میری سیکری بھی زیادہ ہو جائے گی۔ میں نے شام کی کلاسز میں ایم بی اے کرنا شروع کر دیا۔

بھابھی اور بہنوں کا تو پتا نہیں لیکن اس جاب سے میں بہت خوش تھی۔ صبح نو بجے سے چار بجے تک بینک میں رہتی تھی۔ ہفتے میں دو دن آف ہوتا۔ پک اینڈ ڈراپ بھی تھا اور سیکری بھی اچھی تھی۔ اب بھائی بھابھی کے منہ کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا تھا۔ جو چاہتی تھی لیتی۔ اچھے اچھے کپڑے بنوائی تھی۔ اپنے چھوٹے سے

کمرے میں پینٹ بھی کروا لیا تھا۔ ایک نیا بیڈ اور رائٹنگ ٹیبل بھی لا کر رکھ دی تھی۔ بد حال سے کمرے کی حالت ہی بدل کر رکھ دی تھی میں نے۔

کمرے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر بھابھی نے منی یعنی منیزہ کو میرے کمرے میں شفٹ کر دیا کہ دونوں پھوپھو بیٹی اب ایک ہی کمرہ شیئر کریں۔ گھر کا سب سے اچھا اور گنڈا ماکرا بھابھی نے

مجھے دیا ہوا تھا۔ اب وہی کمرہ انہیں اپنی بیٹی کے لیے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ بھابھی کے اکسانے پر منیزہ میرے نئے کپڑے کالج پہن کر جانے لگی تھی۔ پرفیوم کی بوتل مجھے بھی اپنی ڈرائنگ پر نہیں ملتی تھی۔ کبھی بھابھی کے کمرے سے، کبھی بچوں کے کمروں سے۔ میرا لایا ہر بیگ بھابھی کو اچھا لگتا تھا اور وہ ملتا بھی ان ہی کے کمرے سے تھا۔ صبح جلدی اٹھنے پر بھی میں سارے گھر سے اپنی چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھی کرتی پھرتی تھی۔ بینک کی گاڑی باہر ہارن دیتی رہتی تھی۔

میری نوکری کی ڈیمانڈ تھی کہ میں ویل ڈریس رہوں۔ میرا کوئی بھی ڈریس وارڈ روب میں پورا ملتا ہی نہیں تھا۔ دوپٹا بھابھی نے اپنے کسی سوٹ کے ساتھ میچ کر کے کہیں رکھ لیا ہوتا تھا۔ پوچھتی تھی تو کہتی تھیں یاد نہیں کہاں گیا۔ ملے گا تو دے دوں گی۔

”نیا سوٹ منیزہ پہن کر کالج جا چکی ہوتی تھی۔ کچھ ڈریس دھلنے والے ہوتے تھے۔ کچھ پرداغ لگے ہوتے تھے۔ منیزہ اتنی لاپرواہی سے کپڑے پہنتی تھی کہ ہر ڈریس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوتا تھا۔ زیادہ تر تو ادھیڑے ہوئے اور پٹھے ہوئے ملتے تھے۔ ایک بار میں نے وارڈ روب ہی لاگ کر دی۔ بھابھی نے وہ ہنگامہ کیا کہ میں شرمندگی سے رونے لگی۔

”تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ ہم نے تو کبھی تالے نہیں لگائے۔ چار دن ہوئے ہیں تمہیں جاب کرتے ہوئے۔ تم اتنی مغرور ہو گئی ہو کہ چار روپوں کی چیزوں پر اترا نہ لگی ہو۔ تمہیں کھلایا، پلایا، جیسا خود پہنا دیا تمہیں پہنایا۔ اب تم تالے لگانے لگیں۔“

چارونا چار میں نے صورتحال سے سمجھوتہ کر لیا۔ کبھی

کسی ضروری میٹنگ میں جانا ہوتا تو رونا آ جاتا تھا۔ کبھی بیگ کم ہوتے، کبھی جوتے۔ جیسا تیار ہو کر چلی جاتی تھی۔ بہنوں کو کچھ کہتی تو وہ الٹا مجھے ہی کوستی تھیں۔

”اور کرو اپنی چیتتی بھابھی کی حمایت۔ کہا تھا

ہمارے ساتھ آ کر رہ لو۔ پر نہیں۔“

بہنوں کے اپنے شکوے شکایتیں ختم نہیں

ہوتے تھے۔ انہیں یہ لگتا تھا کہ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ سب میرا ہی قصور ہے۔

☆☆☆

ایم بی اے کے بعد میں ایم فل کرنے لگی تو اس دوران مجھے ایک دوسرے بڑے بینک سے نوکری کی آفر آئی۔ وہ میرے ایم فل کی ہاف فیس دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ بینک کی طرف سے مجھے کار بھی مل چکی تھی۔ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے میں نے ایک ملازمہ رکھ لی۔ وہ میرے کپڑے وغیرہ دھو کر، پرلیس کر کے، میرا کمرہ صاف کر دیتی تھی۔

بھابھی نے اس ملازمہ سے اتنا کام لینا شروع کر دیا تھا کہ میں نے جو اسے بارہ سوما ہوار پر رکھا تھا اب اسے چار ہزار دینے لگی تھی۔ بھابھی سے بات کی تو انہوں نے بس اتنا کہا۔ ”میری کام والی تو گاؤں چلی گئی ہے۔ کہہ رہی تھی اب واپس نہیں آؤں گی۔ سوچا تمہاری ملازمہ کو ہی سب کام سونپ دوں۔ تمہارے کام کرتی ہے، ہمارے بھی کر دے گی۔“

بھابھی کام کرواتی رہتی تھیں لیکن اسے سیلری نہیں دے رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ یہ کام اب مجھے ہی کرنا ہوگا۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے گھر کے بہت سے خرچے میرے ذمے لگانے شروع کر دیے تھے۔ بجلی گیس کے بل۔ دودھ اور دھوبی کا خرچا۔ سودا سلف کے لیے الگ سے ہر مہینے پیسے۔ مجھے خود بھی پتا نہیں چلتا تھا اور میری سیلری مہینے کے اینڈ سے پہلے ختم ہو جاتی تھی۔ گاہے بگا ہے وہ مجھے سنا دیتی تھیں کہ اتنے سال انہوں نے بھی تو میرے خرچے اٹھائے ہیں۔ چار دن میں اٹھالوں کی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ بینک سے ایک کار بھائی جان کو نکلا کر دی۔ جس

کی قسطیں میری سیلری میں سے جاتی تھیں۔ منیزہ سے چھوٹا جبران بہت لائق فائق تھا۔ وہ پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔ بھابھی نے چھ لاکھ مجھ سے ادھار پائے کہ ان کے بیٹے کا مستقبل بن جائے گا۔ میں جانتی تھی کہ یہ ادھار مجھے بھی واپس نہیں ملے گا۔ بھابھی کہتی

رہیں کہ اپنا زیور بیچ دوں گی، لیکن انہوں نے نہیں۔ آہستہ آہستہ کر کے گھر کا اوپر والا پورشن بھی رہا۔ پہلے ایک کمرہ بنا، پھر کچن بنا، پھر لاونج بنا۔ سارا پورشن تیار ہو گیا تو بھابھی نے کرائے پر دے دیا۔ ”اسے کھلائے جاؤ۔ ہم تو تمہیں نظر نہیں آتے۔ حمدان کی میڈیکل کی فیس کے لیے کوشش پریشان رہی تھی میں۔ پر تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بہن کی مدد کروں۔“ سیدہ آیا گا ہے بگا ہے مجھ پر طنز کے تیروں کی بارش کرتی رہتی تھیں۔

”آپ کو پورے بیس ہزار دیے تو تھے آیا۔“

”اپنی بھابھی کو تو تم لاکھوں میں دیتی ہو جبران کے لیے چھ لاکھ نہیں دیے تھے؟ بیس اور چھ میں فرق نہیں پتا تمہیں۔“

میں گہرا سانس بھر کر رہ جاتی تھی۔ عجب مصیبت میں پھنس چکی تھی میں۔ جس سے بات کرتی تھی وہ الٹا مجھ سے شکوے کرنے لگتا تھا۔ نہ دیتی تو مسئلہ ہوتا۔ دے دیتی تو مسئلہ ہوتا۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے اپنے پیاروں سے زیادہ پیسہ عزیز تھا۔ لیکن اتنا کچھ دے دینے پر بھی ان کا رویہ نہیں بدلتا تھا۔

☆☆☆

منیزہ کی پچپن سے ہی اپنے خالہ زاد سے بات طے تھی۔ لڑکا ڈاکٹر بن چکا تھا۔ انہوں نے ایک دم سے شادی کی اتنی جلدی مچا دی تھی کہ ہم سب کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ وہ لوگ امیر بھی بہت تھے۔ ٹینشن سے بھابھی کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ بار بار کہتی تھیں کہ بہن تو رشتہ توڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ اگر یہ کہا کہ ابھی تیاری نہیں ہے، کچھ وقت دے دو تو فوراً رشتہ توڑ دے گی۔ اس کے ڈاکٹر بیٹے کو رشتوں کی کمی ہے بھلا۔

کچھ روکر، کچھ منت کر کے، کچھ بہنوں جیسی بھتیجی کے اچھے مستقبل کے واسطے دے کر، میرے اکاؤنٹ میں جتنا کچھ تھا بھابھی نے لے لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب میری شادی ہوگی تب وہ مجھے یہ سب ڈبل کر کے

گلا میں ان سب کی وجہ سے گھونٹ دیتی تھی۔

☆☆☆

میرے لیے جو پروپوزل آتا تھا کوئی نہ کوئی نقص نکال کر انکار کر دیا جاتا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں نوکری چھوڑ دوں۔ آرام سے گھر بیٹھوں اور گھر کے کام کروں۔ ایسی نوکری اور ایسے پیسے کا میں نے کیا کرنا تھا جب مجھے سکون ہی نصیب نہیں تھا۔ سب بس ایک ہی بات کرتے رہتے تھے۔

”پیسہ بہت ہے اس کے پاس۔ اتنی بڑی پوسٹ پر کام کرتی ہے۔ لیکن ہوا نہیں لگنے دیتی بھی۔“

ایسی باتیں سن کر مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ اتنے سالوں سے میں نوکری کر رہی تھی، میرے پاس تو دھیلا بھی نہیں بچا تھا۔ کوئی نہ کوئی اپنا خرچا لے کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں پیسہ بچتا ہی نہیں تھا۔ میری کولیکز نے اپنے اپنے پلاٹ تک لے لیے تھے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتی تھیں کہ اتنی بڑی پوسٹ پر ہونے کے باوجود نہ میرے پاس ڈائمنڈ کی جیولری ہے۔ نہ کوئی پلاٹ وغیرہ۔

بینک کے میرے کولیک عماد نے میرے لیے اپنا پروپوزل بھیجا تو پھر سے بھابھی نے ناک بھوں چڑھا کر انکار کر دیا۔

”تم اتنی بڑی آفیسر ہو اور وہ کیشئر۔ چار بہن بھائی پال رہا ہے۔ اب تم بالوگی۔ لالچی ہے لالچی۔“

میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ سدرہ آپا سے بات کی اور عماد کے پروپوزل کے لیے ہاں کر وادی۔ میں جانتی تھی کہ یہ سلسلہ کبھی نہیں رکے گا۔ کیا شادی سے پہلے، کیا شادی کے بعد۔ میری کولیکز کا بھی کہنا تھا کہ ”عماد مجھ سے میری اچھی پوسٹ کی وجہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی فیملی کی کفالت کے لئے مجھے سٹر بھی بنانا چاہتا ہے۔ میں گہری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔ کسی سے کیا کہتی کہ میرے اپنے گھر میں میرے

ساتھ یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ شوہر اور اس کے گھر والے بھی کر لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔

دے دیں گی۔ اماں میرے لیے کچھ جہیز کی چیزیں چھوڑ گئی تھیں۔ ان کے کچھ زیورات تھے۔ بھابھی نے وہ سب بھی لے لیے تھے۔

جب منیزہ رخصت ہو کر گئی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں بالکل کنگال ہو گئی ہوں۔ میرے بینک میں کل ملا کر یہی کوئی گیارہ سو روپے بچے ہوں گے۔ پانچ لاکھ روپے میں بینک سے لون لے چکی تھی۔ میرا اپنا اکاؤنٹ پورا خالی ہو چکا تھا۔ سیلری سے جو میں نے سونے کی چین اور دو انگٹھیاں بنوائی تھیں وہ تک بک چکی تھیں۔

اب میرے سر پر پانچ لاکھ کالون تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ لون بھائی دیں گے۔ لیکن بھائی جان خود بیٹی کی شادی کر کے کنگال ہو چکے تھے۔ وہ قسط کہاں سے بھرتے۔ ہر ماہ میری سیلری سے قسط کٹنے لگی۔ جب بھائی بھابھی سے قسط کی بات کرتی وہ دوسرے خرچے گنوا کر رونے لگتے تھے۔ بہنوں کو بتا نہیں سکتی تھی۔ وہ پہلے ہی بار بار مجھ سے پوچھتی رہتی تھیں کہ منیزہ کی شادی میں کچھ دیا تو نہیں۔ میں چپ ہو جاتی تھی کہ اور کہہ دیتی کچھ نہیں دیا۔ پھر بھی سدرہ آپا کو معلوم ہو ہی گیا کہ میں نے منیزہ کی شادی میں کیا کچھ دیا ہے۔ وہ تو رونے پینے لگیں۔ ان کی بڑی بیٹی افشاں کا بھی نکاح ہو چکا تھا۔ وہ اس کی رخصتی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ منیزہ کو اتنا کچھ دیا تھا تو افشاں کو بھی دینا تھا۔

بینک سے تو لون نہیں لے سکتی تھی۔ ایک فرینڈ سے ادھار پیسے لیے۔ آپا کو جہیز کی تیاری کے لیے دیے۔ پھر بھی ساری شادی میں ان کا منہ بنا رہا تھا کہ ”منیزہ کو تو اتنا کچھ دیا تھا۔ اپنی سگی بھانجی کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں دے سکی۔“

میں بہنوں اور بھابھی کے درمیان پسے لگی تھی۔ میرا جینا محال ہو گیا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کی

پڑتال کی زد میں رہتی تھی۔ میری ہر اچھائی پرانی کو پیسے میں تولا جاتا تھا۔ ایک بار کسی کو انکار کر دیتی تھی تو سو بار کا دیا بھی بھاڑ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ اپنی کتنی خواہشوں کا

عماد کا گھرانہ مالی مشکلات کا شکار تھا۔ گھر بھی چھوٹا سا تھا۔ ہم دونوں کو کئی سال لگے تھے گھر کے حالات بدلنے میں۔ دیوروں اور نندوں کی شادیاں کی۔ چھوٹے گھر کو سیل کر کے اچھے سے علاقے میں بڑا گھر لیا۔ میری سہیلی ان سب حالات کو بدلنے میں پیش پیش رہی تھی۔ جیسا بھابھی اور بہنوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا..... میری ایک ایک پائی اس گھر میں لگ گئی تھی۔ لیکن کچھ باتیں الٹ بھی ہوئی تھیں۔

میری نند فوزیہ اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ کویت سے پانچ سال بعد پاکستان واپس آئی تھی۔ شام کی چائے پیتے ہوئے فوزیہ کا شوہر مسلسل میرے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا۔

”آپ نہ ہوتیں تو یہ گھرانہ کبھی اتنی ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ فوزیہ تو بار بار کہتی ہے ہماری بھابھی نہ ہوتیں تو پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا ہوتا۔ ہماری شادیاں بھی ہوتی یا نہیں۔“

میں حیرت سے فوزیہ کے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ میری ساس اور سر بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ ایسی ہی بات منیزہ کی سولہ سالہ بیٹی بھی کر کے گئی تھی۔ وہ امریکا سے یہاں عید کرنے کے لیے آئی تھی۔ جب وہ مجھ سے ملی تو ماں کی طرح گلے سے جھول کر چمکنے لگی۔

”تو آپ ہیں وہ جس کی وجہ سے ماما اتنی اپ ٹو ڈیٹ رہا کرتی تھیں۔ نئے نئے فیشن کے کپڑے پہن کر کالج جاتی تھیں۔ اپنی فرینڈز کو جلیس کیا کرتی تھیں۔ ماما بتاتی ہیں کہ آپ کی وجہ سے ان کی پاپا سے شادی ہوئی تھی۔ ورنہ دادو سمجھتی توڑ کر کہیں اور شادی کر رہی تھیں۔ بہت باتیں کرتی ہیں ماما آپ کی، کہتی ہیں میری پھوپھو نے میری بہت دیکھ بھال کی ہے۔ اپنے بچوں کی طرح رکھا ہے مجھے۔“

پھر جبران..... جب وہ مجھے اپنی پاکستانی نژاد انگریز

بیوی سے ملو رہا تھا تو ساتھ ساتھ اسے بتا بھی رہا تھا۔

”یہ ہیں میری وہ پھوپھو جن کی وجہ سے میں نے گھر کے لیے باہر گیا تھا۔ یہ نہ ہوتیں تو میں اتنی بڑی لڑکی میں ایڈمیشن نہیں لے سکتا تھا۔ بس پھوپھو اپنے ایک ایک کر کے پڑھنے کے لیے میرے پاس رہیں۔ میں انہیں اچھی سے اچھی یونیورسٹی میں لے کر دوں گا۔ بے فکر ہو جائیں۔ اب آپ کے اس کی باری ہے کہ وہ اپنا فرض پورا کرے۔“

میرے دیور نے بزنس کرنے کے لیے سے پیسے ادھار لیے تھے۔ پانچ چھ سال دو چار چپ بزنس کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ تھوڑے بہت بھی واپس کر دیتا تھا۔ خاندان کے کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس کا بزنس بہت منافع میں جا رہا ہے۔ وہ اتنا رہا ہے تو صرف اپنی گڑیا پھابھی کی وجہ سے۔ پھابھی ہے جو بھابھی کو کوئی قیمتی تحفہ ہی لے کر دے دے۔ احسان مانے گڑیا کا۔ اپنا سب کچھ ان پر دیا۔ ان کی زندگیاں سنوار دیں۔ بدلے میں اس چاری کو کیا ملا۔ میرے دل میں بھی شکوے تو تھے میں چپ رہنا سیکھ چکی تھی۔

ایک دن شام کو وہ مجھے بینک سے پک کر آیا۔ بہت خوش تھا۔ جب میں اس کے نئے گھر کے پاس اتری تو سب گیٹ کے باہر کھڑے میرا انتظار رہے تھے۔ اس کے بیوی بچے، میرے ساس، سر، دیور، نندیں۔ عماد اور میرے بچے بھی وہیں موجود تھے۔

”ہمارے نئے گھر کا دروازہ سب سے پہلے آپ ہی کھولیں گی بھابھی!“ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ بولے۔

میں نے سب کی طرف دیکھا۔ چابی لے کر میں گیٹ کا تالا کھولنے لگی۔ جیسے ہی تالا کھلا، مجھے میرے ہر شکوے کی گہرہ کھل گئی۔ مجھے سب کچھ مل گیا۔ میں خالی ہاتھ نہیں رہی تھی۔



سید طارق

دلِ عشق

اس نے جھک کر اپنے دونوں پیروں کو باری
باری کو میٹ بوٹ یعنی فوجی بوٹ میں جکڑا پھر
سیدھی ہوئی۔ اسے تمام بالوں کا نفاست سے جوڑا
بنا کر اس نے سر پر تیفٹی ہیلمٹ پہنا۔ شرٹ کے اوپر
بلٹ پروف ویسٹ پہنی اور ہاتھ میں تین فٹ لمبی
کلاشکوف پکڑ کر وہ مکمل طور پر ایک کمانڈو کا روپ



دھار چکی تھی۔

آج اسے ایک بے حد مشکل مشن پر جانا ہے..... آج یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ ایک اچھی ڈیفینڈر (بچانے والی) ہے بھی یا نہیں۔ دل میں خوف بھی تھا۔ امید بھی اور بلند حوصلے بھی۔ اپنے سراپے پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

”دشمنوں کا قلع قمع کرنے کے لیے..... میں ہوں بالکل تیار“

کہہ کر اس نے دایاں پاؤں پورے جوش سے زمین پر مارتے ہوئے خود کو سیلوٹ کیا۔ اور اپنی لوکیشن پر پہنچنے کے لیے روانہ ہو گئی۔

کلاشکوف سے فار کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اپنے دشمنوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے دشمن کو حراست میں لیتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک..... ٹھاہہہہ..... وقت کی گھڑیاں تھم سی گئیں۔ ہر سوسناٹا چھا گیا۔ ہر چیز سلوموشن میں حرکت کرنے لگی۔ وہ اپنے حواس کھودینے والی تھی کہ جنرل صاحب سر پر آن پہنچے.....

”ہائے تیرا بیڑا غرق..... پھر سے توڑ دیے برتن۔“ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے وہ بھی زمین پر پڑی شیشے کے گلاس کی کرچیوں کو دیکھتی تو کبھی اماں کو جو خوفناک تاثر لیے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

”وہ..... سوری امی..... ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔“ ماں کے خوفناک تیور دیکھتے ہوئے وہ بے چاری شکل بنا کر بولی۔ جس پر اماں کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

”ہاتھ سے پھسل گیا تھا؟؟؟..... ابھی بتاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے انہوں نے دشمنوں میں سے

یعنی برتنوں میں سے ایک بڑا سا لکڑی کا چھج اٹھایا اور اس کی جانب لپکیں۔ مگر وہ اپنا دفاع کرتی کچن سے یعنی لوکیشن سے فرار ہو گئی۔

”پتا نہیں کس دن اس لڑکی کو عقل آئے گی۔“

کہہ کر اماں نے چمچہ واپس دشمنوں میں..... آں

ہاں..... برتنوں میں پنخ دیا۔

وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی اور دوبارہ شیشے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے سر کو اس نے سیلوٹ کیا۔ ہیلیمٹ یعنی دوپٹے سے آزاد کیا جو وہ عموماً کام کرنے سے پہلے سر کے گرد لپیٹ کر پلو آگے کو گراں کرتی تھی۔ پھر اس نے بلٹ پروف ویسٹ یعنی ایپرن اتار کر دور پھینکا اور پیروں سے کو میٹ بوٹ یعنی ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی جوتی جو اس نے گھریلو کاموں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اتار کر ایک طرف کی اور خود برا سامنہ بناتے ہوئے بیڈ پر آلتی پالتی بنا کر بیٹھ گئی۔

اور ہاں..... جوتین فٹ لمبا کلاشکوف تھی وہ دراصل کلاشکوف نہیں بلکہ پانی صاف کرنے والا واپر تھا۔ اب اس میں اس بے چاری کا بھی کیا قصور تھا بھلا..... لڑکیوں کے پاس کمانڈو بننے کے لیے فقط یہی سہولیات دستیاب ہوتی ہیں۔

وہ یوہی بیڈ پر بیٹھی منہ بسور رہی تھی کہ اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

”محترمہ حرم صاحبہ! آپ کوئی کام بھی کریں گی یا آپ کے حصے کے کام بھی اب مجھے ہی کرنا پڑیں گے؟“ خلاف توقع اماں قدرے شائستگی سے بولیں۔

”اف اماں! ہر وقت آپ کو کام کی ہی پڑی رہتی ہے۔ کتنا کام کرواتی ہیں آپ مجھ سے۔“ وہ خفگی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! کام ہر لڑکی کو کرنا پڑتا ہے۔ اگر تم کام نہیں کرو گی تو کل کو ہم نے تمہاری شادی بھی تو کرنی ہے نا پھر تمہیں سسرال میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ اماں حرم کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”کوئی شادی وادی نہیں کرنی مجھے۔ میں تو

فوج میں بھرتی ہوں گی اور ایس ایس جی (SSG)

کمانڈو بنوں گی۔“ حرم کی بات پر اماں نے سر تھام لیا۔

”اچھا چلو بن جانا کمانڈو، پہلے خالہ بی کو کھانا دے کر آؤ۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کھانا نکال رہی ہوں تم جلدی باہر آ جاؤ۔“ حرم نے اثبات میں سر ہلایا تو اماں کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے وہ کچن میں داخل ہوئی اماں پیالے میں سالن نکال رہی تھیں۔ ”کھانا تیار ہے؟“ حرم اماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں کھانا تو تیار ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ان کی خیریت پوچھ آؤں گی۔“

”جی بہتر ہوگا۔“ حرم نے کہا۔

”میں بس روٹیاں پکالوں پھر چلتے ہیں۔“ اماں چولہے پر تو اچڑھاتے ہوئے بولیں۔ پاس پڑی پھلوں والی ٹوکری سے حرم نے ایک سیب اٹھایا اور چھری کی مدد سے اسے کاٹنے لگی۔

اماں کی روٹیوں کی تھپ تھپ کی آواز کچن میں گونجنے لگی۔

”اماں! یہ خالہ آپ کی سگی خالہ ہیں؟“ سیب کے چھلکے اتارے ہوئے وہ اماں سے مخاطب ہوئی۔ ”ہوں۔“ روٹی توے پر ڈالتے ہوئے اماں نے مصروف سے انداز میں مختصر سا جواب دیا۔

”نانی اماں کی کتنی بہنیں تھیں؟“ کہہ کر اس نے سیب کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

”میری اماں اور خالہ بی بس دو ہی بہنیں تھیں۔“ اماں دوسرے پیڑے کو ہاتھوں کی مدد سے گول کرتے ہوئے بولیں۔

”نانی اماں بڑی تھیں یا خالہ بی؟“ حرم نے ایک اور سوال جھاڑا۔

”خالہ بی۔“ روٹی آگ پر سینکتے ہوئے اماں نے جواب دیا۔ سیب کا دوسرا ٹکڑا سوچنے کے سے انداز میں کھاتے ہوئے وہ ابھی ایک اور سوال کرنے

ہی والی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن ہادیہ کچن میں داخل ہوئی۔

”امی مجھے بھوک لگی ہے۔“

”کھانا تیار ہے کھالینا۔ میں اور حرم خالہ بی کے پاس جا رہے ہیں۔ تمہارے ابا آئیں تو انہیں بتا دینا۔“ اماں نے ہادیہ سے کہا۔

”جی امی۔“ کہہ کر وہ حرم کے ہاتھ سے سیب کا ٹکڑا چھین کر واپس بھاگ گئی۔ حرم کی ٹیکھی نگاہوں نے منظر سے غائب ہونے تک اس کا تعاقب کیا۔

”چلو حرم! یہ برتن اٹھالو۔“ کہہ کر اماں نے دوپٹے کا پلو درست کیا اور پھر وہ ماں بیٹی برابر والے گھر میں جا پہنچیں۔ دونوں لوہے کا گیٹ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں تو سامنے خالہ بی اپنے لاغر وجود کو چھری کے سہارے کھسیٹی ہوئی کچن میں جا رہی تھیں مگر ان دونوں کو دیکھ کر وہیں رُک گئیں۔

”خالہ بی! کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ اماں دونوں ہاتھوں سے انہیں سہارا دیتے ہوئے بولیں۔

”وہ..... میں پانی لینے جا رہی تھی۔“

”آپ اندر چلیں، حرم لے آئے گی پانی۔“ کہتے ہوئے اماں خالہ بی کو کمرے میں لے گئیں اور حرم کچن کی جانب بڑھ گئی۔ کھانے کے برتن شیلف پر رکھ کر وہ کولر سے گلاس میں پانی بھرنے لگی۔ پانی کا گلاس اور برتن تھامے وہ بھی کمرے میں آ گئی۔

خالہ بی بیڈ کی پانٹی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں جب کہ اماں ان کے پاس کرسی پر براجمان تھیں۔ حرم نے پانی کا گلاس خالہ بی کو تھمایا اور کھانے کے برتن اماں کے حوالے کر دیئے۔

اماں روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے بنا کر خالہ بی کے منہ میں ڈالنے لگیں۔

”ابھی تم لوگوں کو یہاں شفٹ ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور میری خدمتوں میں لگ گئی ہو۔“

خالہ بی اماں کا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ہوئے بولیں۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ بی.....“ اماں

نے اپنا دوسرا ہاتھ خالہ بی کے جھریوں زدہ ہاتھ پر رکھا۔

”آپ کی خدمت کر کے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنی اماں کی خدمت کر رہی ہوں۔“ خالہ بی کے جھریوں زدہ چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ کتنی ہی دیر اماں اور خالہ بی نے باتیں کرتی رہیں۔ حرم بھی پاس بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ جب رونی اور باتیں ختم ہو گئیں تو اماں کھڑی ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے خالہ بی میں اب چلتی ہوں۔ حرم کے ابا آنے والے ہیں۔“ اماں نے کہا تو حرم بھی چلنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”خالہ بی! آپ اس بیماری کی حالت میں گھر میں اکیلی رہیں گی کیا؟ کام والی کدھر ہے؟“

”کام والی کچھ دنوں کے لیے چھٹیوں پر گئی ہے۔“ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ لیکن تم پریشان مت ہو۔ میں رہ لوں گی۔“ اماں کی پریشانی دیکھتے ہوئے خالہ بی نے انہیں تسلی دلائی۔

”نہیں خالہ بی..... اس حالت میں آپ کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“ کہہ کر اماں حرم کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

”حرم! تم خالہ بی کے پاس ہی رک جاؤ۔ ان کا خیال رکھنا۔ اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔“ تحکمانہ انداز میں کہہ کر اماں وہاں سے چلی گئیں۔

اماں کے جانے کے بعد وہ پہلے تو خالہ بی کی ٹانگیں دبائی رہی۔ مگر جب خالہ بی سو گئیں تو وہ کمرے سے باہر آئی۔ اس نے ابھی تک مکمل طور پر یہ گھر نہیں دیکھا تھا۔ جدید طرز کا بنایا چھوٹا سا گھر جس کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا گیراج تھا۔ دائیں ہاتھ پر کچن، سامنے خالہ بی کا کمرہ اور بائیں ہاتھ پر بھی ایک کمرہ تھا۔ جس کا

دروازہ بند تھا۔

اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ یقیناً وہ لاک تھا۔ گیٹ کے بالکل ساتھ دائیں جانب سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ ڈرتے ڈرتے وہ سیڑھیاں اوپر چڑھی۔ بالائی منزل اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ سامنے دو کمروں کے دروازے تھے۔ وہ زیادہ کچھ نہ دیکھ پائی اور اندھیرے سے گھبرا کر واپس نیچے بھاگ آئی۔

وقت گزارنے کے لئے اس نے خالہ بی کی الماری سے ایک کتاب نکالی اور صوفے پر نیم دراز ہو کر کتاب کا مطالعہ کرنے لگی۔

اس دوران جانے کب وہ نیند کی وادی میں اتر گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ خالہ بی قبلہ رو کرسی پر بیٹھی نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے سے قاصر تھیں۔ بیڈ کے بائیں جانب چھوٹے سے اسٹینڈ پر پڑے ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس کی گھنٹی سے خالہ بی کی نماز میں خلل نہ پڑے۔ اس لیے وہ اٹھی اور ٹیلی فون کا ریسیور کان سے لگالیا۔

”ہیلو..... جی کون؟“ ریسیور کان سے لگا کر اس نے فون کرنے والے کا تعارف چاہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک بھاری بھر کم آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”میں آپ کا خاوند بات کر رہا ہوں۔“ حرم کی نیند سے بوجھل آنکھیں یک لخت پھیل گئیں۔

”کک..... کون بات کر رہے ہیں آپ؟“ اس نے دوبارہ وضاحت طلب کی کہ شاید اس نے غلط سنا ہے۔

”میں آپ کا خاوند بات کر رہا ہوں۔“ دوبارہ پھر وہی جملہ سنائی دیا۔ اس نے کھٹاک سے ریسیور

واپس کریڈل پر پٹخ دیا۔ ابھی وہ ساکت کھڑی اسی کال کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ خالہ بی نے اسے مخاطب کیا۔
”کس کا فون تھا؟“

”میرے خاوند..... پپ..... پتا نہیں کون تھا۔“
بے دھیانی میں اس کے منہ سے ”خاوند“ نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے حواسوں پر قابو پا لیا۔
☆☆☆

وہ ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی آف پاکستان آرمی کا آفس تھا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں آمنے سامنے دو بڑی اور لمبی میزیں تھیں۔ جن کے آگے آفس چیئرز پڑی تھیں۔ ہر چیئر کے سامنے جدید کمپیوٹرز پڑے تھے اور ان کمپیوٹرز کو آپریٹ کرنے کے لیے مخصوص وردیوں میں ملبوس آفیسرز براجمان تھے۔ جنہوں نے سر پر ہیڈ فونز پہن رکھے تھے۔ ان ہی میں سے ایک سیکٹر میجر وقار کا تھا۔

کرسی پر بیٹھا وہ تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا کہ وردی میں ملبوس ایک سپاہی اس کے پاس آیا اور سیلوٹ کر کے بولا۔
”سر! لیفٹیننٹ کمانڈر ذوریز حیدر صاحب آئے ہیں۔“

”انہیں اندر بھیج دو۔“ وہ نظریں کمپیوٹر سے ہٹائے بغیر بولا۔ کچھ ہی دیر میں کمانڈنگ آفیسر کی وردی پہننے ایک خوبصورت نوجوان اندر داخل ہوا۔
”کیسے ہو یار..... کافی عرصہ بعد شکل دکھا رہے ہو۔“ میجر وقار لیفٹیننٹ ذوریز کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

”بس یار اللہ کا کرم ہے۔ تم سناؤ..... کیا مصروفیات ہیں آج کل اور گھر میں سب کیسے ہیں؟“ لیفٹیننٹ ذوریز اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اللہ کا شکر سب ٹھیک ہیں۔ سائرہ اور امی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ کسی دن چکر لگاؤ گھر پہ دادی کے ساتھ۔“

میجر وقار نے کہا۔

”ہاں ان شاء اللہ آؤں گا کسی دن۔ فی الحال تو میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں چند دن کی چھٹیوں پر لاہور جا رہا ہوں۔ کافی عرصہ ہو گیا دادی سے ملے۔ کچھلی بار جب آیا تھا تو ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔“

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“ میجر وقار لیفٹیننٹ ذوریز کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ جواباً لیفٹیننٹ ذوریز مسکرا دیا۔

”میرے بھائی میری بات مانو..... گھر میں ایک عدد بیوی لے آؤ، کم از کم دادی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی تو ہو گا نا گھر پہ۔“

”فرصت ملے گی تو سوچوں گا اس بارے میں بھی۔“ لیفٹیننٹ ذوریز فرمانبرداری ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ میجر وقار لیفٹیننٹ ذوریز کا فیملی کزن تھا اور اچھا دوست بھی۔

”اچھا بتاؤ تم کیا بولو گے؟ چائے یا کافی!“ میجر وقار نے ذوریز کو آفر کی۔

”نہیں کچھ نہیں۔ مجھے اب نکلنا چاہیے۔ بلکہ یاد آیا میں نے دادی کو تو اطلاع ہی نہیں دی اپنے آنے کی۔“ کہتے ہوئے ذوریز کی نظر سامنے ٹیبل پر پڑے ہیڈ فون پر پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ ابھر آئی۔

”سنو..... دادی کو تنگ کریں۔“ چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ لیے لیفٹیننٹ ذوریز میجر وقار کی طرف دیکھتے بولا۔

”تم باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے..... کسی دن میں دادی کو سب بتا دوں گا۔“ میجر وقار ذوریز کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”ہاں تو بتا دینا۔ عرصہ دراز ہو دادی کی ڈانٹ سنے۔“ لیفٹیننٹ ذوریز ہیڈ فون سر پر پہنتے ہوئے بولا۔ اور پھر تیزی سے بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔

دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔ تین چار منٹ تک مسلسل بیل بجتی رہی پھر کال انڈینڈ کر لی گئی۔

”ہیلو..... جی کون؟“ دوسری جانب سے نیند میں ڈوبی ایک نہایت خوبصورت نسوانی آواز لیفٹیننٹ ذوریز کے کانوں میں پڑی۔ اس نے میوٹ کا بٹن پریس کیا اور میجر وقاص کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ دادی کی آواز کو کیا ہو گیا ہے؟“ اگلے ہی لمحے اس نے کال انمیونٹ کی اور نہایت سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

”میں آپ کا خاوند بات کر رہا ہوں۔“ دوسری جانب کچھ دیر گہری خاموشی چھا گئی۔

”کک..... کون بات کر رہے ہیں آپ؟“ دوسری جانب سے آئی آواز کی لرزش اور اس میں چھپی کیفیت وہ بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

”میں آپ کا خاوند بات کر رہا ہوں۔“ مسکراہٹ دباتے ہوئے اس نے دوبارہ وہی جواب دیا تو رابطہ منقطع ہو گیا۔ دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

”کون تھا؟“ میجر وقاص لیفٹیننٹ ذوریز سے مخاطب ہوا۔

”پتا نہیں کوئی لڑکی تھی..... جو بھی تھی اس کی آواز بڑی خوبصورت تھی۔“ لیفٹیننٹ ذوریز کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

”ہاں..... دادی نے اب شباب پی لیا ہوگا۔“ میجر وقاص نے کہا تو لیفٹیننٹ ذوریز تہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

فجر کی نماز ادا کر کے وہ خالہ بی کے گھر کی صفائی میں جت گئی تھی۔ پہلے ان کے کمرے کی صفائی کی پھر کچن صاف کیا، پھر خالہ بی کے کپڑے استری کیے اور اب وہ گھر جانے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پرکشش دراز قد نوجوان کھڑا تھا جس نے بلیک جینز کے ساتھ

لائٹ براؤن کلر کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور کندھے پر بھاری بھر کم سائیک لٹکا رکھا تھا۔

”جی..... کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ وہ جو سامنے کھڑا اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا اس کے اس سوال پر خاصا حیران ہوا۔

”یہ میرا گھر ہے۔ مجھے جس سے ملنا ہوگا میں خود ہی مل لوں گا۔“ کہتے ہوئے وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا اور حرم کھڑی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

”ذوریز..... میرا بچہ..... کتنے عرصے بعد مجھ سے ملنے آیا ہے۔“

اس نوجوان کو دیکھ کر خالہ بی چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے کمرے سے باہر آئیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر چومنے لگیں۔ حرم کچھ دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی پھر وہیں سے گھر چلی گئی۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ وہ کچن میں آئی۔ اماں چولہے پر رکھی دیتی میں چمچہ چلا رہی تھیں۔ ”امی! آپ ابھی خالہ بی کے گھر گئی تھیں نا؟“ وہ اماں کے قریب کھڑی ہو کر بولی۔

”ہوں..... کیوں؟“

”ان کے گھر کوئی مہمان آیا ہے کیا؟“

”مہمان؟..... نہیں تو..... ارے وہ تو ذوریز

ہے۔ خالہ بی کا پوتا۔ میں ابھی مل کے آئی ہوں اس سے بہت ہی فرماں بردار اور کمزور بچہ ہے۔“ چمچہ چلاتی ہوئی اماں چند لمحے کورک کر مسکراتے ہوئے بولیں۔

”فوج میں افسر ہے۔ تم جو کہتی ہونا کمانڈنگ آفیسر، وہ والا افسر ہے۔“ اماں نے کہا تو حرم نے چونک کر اماں کو دیکھا۔

”اچھا؟“

”ہا دیہ! خالہ بی کو کھیر دے آؤ۔“ اماں نے بلند آواز لگائی۔

”خالہ بی کو کھیر دے کر آئی ہے؟“ حرم نے

سوال کیا۔

”ہاں۔“

”میں دے آؤں؟“

”ہاں چلو تم دے آؤ..... کہیں گرانہ دے۔“

کہہ کر اماں نے کھیر والا ڈونگا حرم کو تھما دیا۔ حرم وہ ڈونگا لے کر کچن سے نکل گئی۔

”اے کاش کہ مجھے ذوریز جیسا داماد ملے۔ کتنا اچھا لڑکا ہے۔“ حرم کو جاتا دیکھ کر اماں نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے سوچا۔

کھیر کا برتن ہاتھ میں پکڑے وہ ابھی خالہ بی کی دہلیز تک پہنچی ہی تھی کہ دروازے کے اسٹیپ میں اس کا پاؤں الٹا اور وہ دھڑام سے زمین پر جا گری۔ کھیر کا برتن بھی زمین بوس ہو گیا۔ گویا اماں کے خدشے کو حرم نے حقیقت کا رنگ دے ڈالا۔

اسے شاید اتنی شرمندگی محسوس نہ ہوتی اگر سامنے وہ نہ ہوتا۔ خالہ بی کے کمرے کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بیڈ پر لیپ ٹاپ اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا اور باہر کا منظر با آسانی دیکھ سکتا تھا۔

دروازے میں گری حرم پر ایک نظر ڈال کر وہ بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلانے لگا۔ حرم زمین پر بت سی بیٹھی چہرے پر شرمندگی کے آثار لیے اسے گھورنے لگی۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور حرم کی جانب بڑھا۔ حرم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کہ اب وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھائے گا۔ مگر یہ کیا.....

وہ آیا اور زمین پر پڑے برتن اٹھا کر واپس کچن کی جانب بڑھ گیا۔ حرم کو نئے سرے سے شرمندگی نے آگھیرا۔ وہ کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے کچن میں چل دی وہ سنک پر جھکا برتن دھو رہا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ یہ جیسے برتن۔ اپنی امی کو شکریہ کہیے گا اور ان

سے کہیے گا کھیر بہت مزیدار تھی۔“ حرم کو برتن تھماتے ہوئے ذوریز نے کہا۔ وہ فرماں برداری سے سر ہلاتی ہوئی مڑی مگر اگلے ہی پل کسی خیال کے تحت واپس پلٹی۔

”آپ کو کیسے پتا کہ کھیر مزے دار تھی۔ جبکہ وہ تو گر گئی۔“ معصومیت سے کہتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے ذوریز کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

”آپ کی جوشیلی آمد سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔“ ذوریز نے کہا تو حرم کے چہرے پر ایک شرمیلی سے دبی دبی مسکراہٹ ابھر آئی۔ برتن لیے وہ ابھی کچن سے باہر آئی تھی اس نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ وہ مڑی۔

”یہ صاف کون کرے گا؟“ وہ دروازے میں گری کھیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں کر دیتی ہوں۔“ وہ شرمندہ لہجے میں بولی۔

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں کھڑی بال سنوار رہی تھی کہ ہادیہ کمرے میں آئی۔

”آپی! خالہ بی اور ذوریز بھائی آئے ہیں۔ امی کہہ رہی ہیں چائے بنا دیں۔“ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔ دوپٹہ سر پر ٹکا کر وہ تیزی سے باہر آئی اور کچن میں گھس گئی۔ جلدی جلدی چائے بنا کر وہ چائے اور دیگر لوازمات ٹرے میں سجا کر لاؤنج میں آئی جہاں سب بیٹھے تھے۔

لاؤنج میں خالہ بی، ذوریز اور اماں بیٹھے تھے۔ با آواز بلند سلام کر کے اس نے سب کے آگے چائے کے کپ رکھے اور اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”ذوریز تو بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔“ اماں ذوریز کو شفقت بھری نگاہوں سے نوازتے ہوئے بولیں۔

جواباً وہ مسکرا دیا۔

”جب یہ وردی پہنتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میجر حیدر علی میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔“
خالہ بی زوریز کو دیکھتے ہوئے بیٹے کو یاد کر کے قدرے افسردگی سے بولیں۔ کچھ دیر لاؤنج میں خاموشی چھائی رہی۔ خالہ بی کے چہرے کی افسردگی دیکھتے ہوئے اماں نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

”اچھا خالہ بی! آپ یہ بتائیں کہ کل کھیر کیسی بنی تھی؟ میں نے خاص طور پر آپ کے لیے بنائی تھی۔ اماں بتایا کرتی تھیں کہ آپ کو کھیر بہت پسند ہے۔“ اماں نے کہا تو حرم کی سائیس اٹک گئیں۔ اس نے گھر آکر اماں کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کھیر گر گئی تھی۔ بے اختیار اس کی نگاہ زوریز کی جانب اٹھی۔ وہ بھی اسے انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کھیر؟..... کون سی کھیر؟.....“ خالہ بی نا سمجھی سے بولیں۔

”وہ..... پھپھو نے کل کھیر بھجوائی تھی۔ آپ سو رہی تھیں تو میں نے کھالی۔“ زوریز فوراً بولا۔ خالہ بی مسکرا دیں۔

”چلو کوئی بات نہیں۔“

”میں معذرت چاہتا ہوں آپ نے دادی ماں کے لیے کھیر بھجوائی تھی اور میں نے کھالی۔“ زوریز اماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں بیٹا کوئی بات نہیں۔ آپ کھائیں یا خالہ بی ایک ہی تو بات ہے..... میں خالہ بی کے لیے اور کھیر بنالوں گی۔“ اماں نے اس کی شرمندگی زائل کرنے کے لیے کہا۔

”ویسے..... کھیر کافی مزے کی تھی۔“ کہہ کر زوریز نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہی اس نے ایک بار پھر حرم کو دیکھا۔ حرم نے شرم کے مارے نظریں جھکا لیں۔

”آپ کی بیٹی چائے کافی اچھی بنا لیتی ہے۔“ حرم نے بے یقینی کی سی کیفیت میں زوریز کو دیکھا۔ کیا وہ واقعی اس کی تعریف کر رہا تھا؟

”جی بالکل۔ میں نے تو اپنی بیٹی کو گھر کے سارے کام سکھائے ہیں۔ کوئنگ تو مجھے بھی اتنی اچھی نہیں آتی جتنی حرم کو آتی ہے۔ الحمد للہ بہت ذمہ دار بچی ہے میری۔“ اور اب کی بار حرم نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی اماں کو دیکھا جو ہر وقت اسے کام چوری اور غیر ذمہ داری کا طعنہ دیتی رہتی تھیں اور اب اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔

ایک ہی سانس میں چائے ختم کر کے زوریز نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور سکٹ والی پلیٹ سے سکٹ اٹھالیا۔

”خالہ بی! آپ بھی پیسے نا چائے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ اماں نے خالہ بی کے سامنے پڑے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں دادی یہ چائے نہیں پی سکتیں..... ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔“ زوریز فوراً بول پڑا۔
”لیکن بلڈ پریشر کا چائے سے کیا تعلق؟“ اماں نا سمجھی سے بولیں۔

”وہ..... ایچو نیکی یہاں آنے سے کچھ دیر پہلے ہی دادی نے چائے کے ساتھ میڈیسن لی تھی۔ میڈیسن کافی ہیوی تھی اس لیے ابھی ان کے لیے چائے پینا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“ زوریز نے وضاحت دی۔

”ہاں زوریز ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ خالی بی نے بھی زوریز کی تائید کی تو اماں نے مزید اصرار نہیں کیا۔ کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

انہیں رخصت کرنے کے بعد اماں نے دوبارہ اپنی نشست سنبھالی۔

”ماشاء اللہ! بہت اچھا لڑکا ہے زوریز۔“ کہتے ہوئے اماں نے چائے کا کپ اٹھالیا۔

”حیدر بھائی بھی بہت اچھے انسان تھے۔ بچپن میں ہمیں ٹافیاں دیا کرتے تھے۔“

اماں کی بات سنتے ہوئے حرم نے چائے کا گھونٹ بھرا اور اچانک ٹھٹھک گئی۔ غلت میں چائے

بناتے ہوئے وہ چائے میں چینی کی جگہ نمک گھول بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا کپ فوراً اترے میں رکھا۔
”شہادت کا رتبہ بھی تو قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔“ کہہ کر اماں چائے کا کپ ہونٹوں سے لگانے ہی والی تھیں کہ حرم نے ان کے ہاتھ سے کپ چھین لیا۔

”اماں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مہمانوں کے جانے کے بعد چائے نہیں پیتے، گھر سے چائے پتی ختم ہو جاتی ہے۔“

کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی سارے کپ اترے میں رکھ کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ اور اماں ہکا بکا اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

کچن میں آکر اس نے اترے شیلف پر پٹنی اور دائیں ہتھیلی سے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔

”پتا نہیں کس طرح بی ہوگی اس بیچارے نے یہ زہر آلود چائے..... امی کو بھی کیا ضرورت تھی میری اتنی تعریفیں کرنے کی..... پتا نہیں کیا سوچ رہا ہوگا وہ میرے بارے میں کہ ایک چائے تک ڈھنگ سے بنانی نہیں آتی۔“ پریشانی کے عالم میں وہ خود سے مخاطب ہوئی۔ پھر ایک ایک کر کے ساری چائے سنک میں بہانے لگی۔

☆☆☆

وہ دادی کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھا لیپ ٹاپ پر مصروف تھا، جب دادی نے اسے پکارا۔

”ذوریز بیٹا.....! ایک بات بتاؤ..... تمہیں حرم کیسی لگی؟“

”مجھے تو..... نارمل لڑکیوں جیسی لگی ہے..... کیوں کوئی بات ہے؟“ ذوریز نے سنجیدگی سے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

”ذوریز! میں مذاق نہیں کر رہی۔“ خالہ بی نے خفگی سے اسے گھورا۔ ذوریز مسکرا دیا۔

”اب آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے؟..... میں اس لڑکی کی تعریفیں کروں؟“ ذوریز لیپ ٹاپ

بند کر کے مکمل طور پر ان کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ خالہ بی نے کہا۔

”اچھی ہے بس..... ذرا غیر ذمہ دار ہے۔“

ذوریز صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔

”نہیں..... ایسا تمہیں لگتا ہے۔ درحقیقت وہ

بہت ذمہ دار بچی ہے۔“ خالہ بی نے کہا تو مسکرا ہٹ

دباتے ہوئے ذوریز نے بھی تائیدی انداز میں

سر ہلا دیا جیسے ان کی ہر بات سے متفق ہو۔

”ذوریز!.....“ خالہ بی سنجیدگی سے مخاطب

ہوئیں۔

”مجھے حرم بہت اچھی لگتی ہے..... میں اسے

اس گھر کی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ تمہارا کیا خیال

ہے؟“ خالہ بی نے کہا تو ایک زوردار قہقہہ مخالف

سمت سے سنائی دیا۔

”یہ آپ میرا فائدہ سوچ رہی ہیں یا اپنا؟“

ذوریز شرارت بھرے انداز میں بولا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے معاملے میں اتنی

خود غرض ہو سکتی ہوں؟“ خالہ بی خفا ہوئیں۔ ذوریز

کے چہرے سے شرارت اور ہنسی کے بادل چھٹ

گئے۔

”دادی جان!.....“ متانت سے کہتے ہوئے

اس نے خالہ بی کا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے پورا بھروسہ ہے کہ..... آپ میرے

لیے جو بھی لڑکی پسند کریں گی..... وہ خالصتاً پھا پھا

کنٹنی ہوگی۔ لیکن آپ کا فیصلہ پھر بھی سر آنکھوں پر

ہوگا۔“ کہہ کر ذوریز آخر میں مسکرا دیا۔ خالہ بی نے

بھی مسکراتے ہوئے اسے پیار سے چپت لگا دی۔

”میں جانتی ہوں تم میرے فرماں بردار

بیٹے ہو۔ لیکن میں اپنا فیصلہ تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتی۔

تم جتنے دن یہاں ہو اچھی طرح سوچ سمجھ لو پھر

جواب دینا۔ اور تب ہی میں بات آگے بڑھاؤں

گی۔“ خالہ بی نے کہا تو ذوریز نے فرمانبرداری سے

سر ہلا دیا۔

☆☆☆

پچھلے پہر حرم اپنی اماں اور ہادیہ سمیت خالہ بی کے گھر پر موجود تھی۔ خالہ بی اور اماں باتوں میں مصروف تھیں۔ حرم نے جلدی سے چائے ختم کی اور کپ سامنے ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر آتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر تسلی کی کہ خالہ بی اور اماں اسے دیکھ تو نہیں رہیں۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے وہ اسے نہیں دیکھ سکتیں تو جیکے سے قدم اٹھاتی زوریز کے کمرے کے قریب آئی اور ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بھی دروازہ نہ کھلا۔ وہ دوسری بار دستک دینے ہی والی تھی کہ اس کے عقب سے آواز آئی۔

”وہ اندر نہیں ہیں آپ۔“ حرم گھبرا کر پیچھے مڑی۔ سامنے ہادیہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ حرم دو قدم چل کر اس کے قریب آئی۔ ”ہادیہ! مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک موقع دیا ہے میں اسے گنوا یا نہیں چاہتی۔“ وہ منت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ہادیہ نے مسکراتے ہوئے آنکھ کی مدد سے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ حرم پہلے تو نا سمجھی سے چھت کو گھورنے لگی کہ شاید وہ چھپکلی کی مانند چھت سے چپکے ہوں۔ پھر اچانک اسے بالائی منزل کا خیال آیا۔

”وہ اوپر ہیں؟“ حرم نے اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جواباً ہادیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بھنویں اچکا دیں۔ حرم خوشی سے مسکراتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی مگر پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی رک گئی اور ہادیہ کو دیکھنے لگی۔ ”تم بھی چلو گی میرے ساتھ؟“ حرم نے الجھے ہوئے انداز میں کہا تو ہادیہ نے شانے اچکا دیے۔

”شیور“ کہہ کر وہ بھی حرم کے ساتھ ہولی وہ دونوں چپکے چپکے اوپر چڑھ رہی تھیں۔ جیسے

ڈاکہ مارنے جارہی ہوں۔ بالائی منزل واضح ہوئی تو وہ سامنے والے کمرے میں کھڑا نظر آیا۔ اس کی پشت سیڑھیوں کی جانب تھی اور رخ سامنے دیوار کی جانب جہاں ایک ادھیڑ عمر جوڑے کی تصویر لٹک رہی تھی۔

وہ بالکل سیدھا کھڑا ہاتھ پیچھے کی جانب باندھے اسی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے تصویر میں قید انسانوں سے باتیں کر رہا ہو۔ ہادیہ اور حرم آہستہ سے چلتی ہوئی کمرے کی بائیں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں جیسے ابھی وہ باہر آئے گا تو وہ دونوں کوئی چیز اس کے سر پر دے ماریں گی۔ حرم نے دیوار کی اوٹ میں چھپ کر ذرا سا سر آگے کر کے اس کی حرکات کا جائزہ لینا چاہا وہ ابھی بھی اسی انداز میں کھڑا تھا۔

”آپ اندر آ سکتی ہیں۔“ بنا مڑے زوریز نے کہا تو حرم سر پیچھے کر کے دوبارہ دیوار کے ساتھ چپک گئی۔

وہ دونوں اب تک سمجھ رہی تھیں کہ وہ انکی موجودگی سے لاعلم ہے۔ حلق کو تر کرتی ہوئی حرم گھبراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی وہ ابھی تک اسی انداز میں کھڑا تھا۔

”یہ میرے والد صاحب اور والدہ محترمہ ہیں۔“ سامنے تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پیارے ہیں.....“ حرم نے گھبراہٹ میں جواب دیا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے اپنا سر جھکایا لیکن پھر دوبارہ اسی طرح سر اٹھا کر تصویر کو دیکھنے لگا۔ درحقیقت اسے حرم کے غیر رسمی اور معصومانہ جواب پر ہنسی آگئی تھی مگر وہ ضبط کر گیا۔

”وہ..... مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے.....“ دوپٹے کا پلو انگلی پر مروڑتے ہوئے حرم نے کہا۔ وہ پلٹا اور خالص فوجیوں کے سے انداز میں عین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب

باندھے ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ گردن بالکل سیدھی
اور سر ذرا اوپر کی جانب اٹھا تھا۔
”میں سن رہا ہوں۔“ کہہ کر وہ سنجیدگی سے حرم
کو دیکھنے لگا۔ وہ یوں اس کی جانب متوجہ ہوا تھا جیسے
وہ اسے کوئی راز کی بات بتانے والی ہو۔
حرم تھوڑا سٹپٹا گئی۔ بڑے بڑے لوگوں کی تو
باتیں بھی بڑی بڑی ہوتی ہیں مگر اسے بڑی بڑی
باتیں کرنا کہاں آتی تھیں۔
”وہ..... مجھے آپ سے معافی مانگنی تھی.....“

اس دن چائے میں.....
”کوئی بات نہیں۔ مجھے عادت ہے ایسی
چیزوں کی لیکن ہر کسی کو نہیں ہوتی اس لیے آئندہ
احتیاط کیجئے گا۔“

حرم کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے اس نے اس
کی بات کاٹ کر اس کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ حرم
فرناں برداری سے سر ہلاتی ہوئی مڑ گئی لیکن پھر واپس
پلی اور اسے دیکھنے لگی۔

”کچھ اور بھی کہنا ہے آپ کو؟“ اس کی ابھی
ہوئی کیفیت محسوس کرتے ہوئے ذوریز نے کہا۔
جواباً حرم نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

”میں سن رہا ہوں۔“ وہ دوبارہ اسی توجہ سے
مخاطب ہوا تھا۔

”وہ..... میں فوج میں بھرتی ہونا چاہتی
ہوں۔“ حرم نے بامشکل لب کھولے۔

”چڑیوں کی فوج میں؟“ جواباً ذوریز نے کہا تو
باہر کھڑی ہادیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”نہیں جی..... پاکستانی فوج میں۔“

”اوہ..... تو اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا
ہوں؟“ ذوریز نے کہا۔

”وہ..... آپ اپنے کسی سینئر آفیسر سے سفارش
کرا کے مجھے کمانڈنگ آفیسر کا عہدہ دلا دیجئے پلیز“
حرم نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہوں..... اس کے لیے تو آپ کو بڑی محنت
کرنی پڑے گی۔“ خلاف توقع جواب آنے پر حرم کا

چہرہ کھل اٹھا۔

”میں ہر طرح کی محنت کرنے کے لیے تیار
ہوں۔“ چمکتے ہوئے کہہ کر حرم سوالیہ نظروں سے
ذوریز کو دیکھنے لگی۔

کچھ دیر کھڑا وہ کچھ سوچتا رہا پھر مخاطب ہوا۔
”تو ٹھیک ہے پھر آج ہی سے شروع کرتے ہیں۔“

نمبر ایک، روزانہ بیس کلو آٹے کی بوری اکیلے
اٹھانا ہوگی۔، نمبر دو، روزانہ سیڑھیوں سے اوپر نیچے سو
چکر لگانے ہوں گے۔، نمبر تین، روزانہ کھانے میں
پچی بھنڈی کھا کر گزارا کرنا ہوگا۔، نمبر چار، روزانہ گھر
کا ہر کام خود کرنا ہوگا مثلاً برتن دھونا، کھانا پکانا، صفائی
ستھرائی اور وہ بھی صرف تین گھنٹے کے اندر اندر نمبر
پانچ، ہر کام بھاگتے ہوئے کرنا ہوگا۔“ وہ ایک ہی
سانس میں بنار کے بولے جارہا تھا اور حرم دیدے
پھاڑے اسے تکے جارہی تھی۔

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظروں سے
حرم کی جانب دیکھا۔ ”ہو جائے گا؟“ حرم نے
دیدے سیٹھے اور نظریں جھکا کر سر ہلاتی ہوئی
کمرے سے نکلنے لگی۔

”اور ہاں.....“ ذوریز نے دوبارہ اسے
پکارا۔ شاید کچھ اور بھی باقی رہ گیا تھا۔

”نمازیں پانچوں وقت ادا کرنی ہوں گی۔ اور
نماز کسی ایجنسی ادارے یا عہدے کے لیے نہیں
صرف اللہ کے لیے پڑھنی ہے۔“

ذوریز نے کہا تو حرم فرمانبرداری سے سر ہلاتی
ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ ذوریز نے مسکرا کر
سر جھٹک دیا۔

☆☆☆

دو دن گزر چکے تھے۔ نہ حرم کے گھر سے کوئی
خالہ بی کے ہاں آیا اور نہ ہی خالہ بی اور ذوریز ان
کے گھر گئے۔ اس دن کی گفتگو ذوریز بھلا چکا تھا اور
اپنے کام میں مصروف تھا۔

آج بھی وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھا
کاغذوں سے الجھ رہا تھا کہ خالہ بی چھڑی کا سہارا

لینے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔
 ”ذوریز بیٹا! میرے ساتھ چلو حرم کی خیریت
 پوچھ آتے ہیں۔“ خالہ بی دیوار کے ساتھ لگے
 صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔
 ”کیوں؟..... اسے کیا ہوا؟“ ذوریز حیران
 ہوتے ہوئے بولا۔

”آج صبح ہادیہ آئی تھی۔ بتا رہی تھی کہ حرم
 سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ اس کے پیر میں موج آئی
 ہے۔“ خالہ بی نے کہا تو ذوریز حیرت سے انہیں
 دیکھنے لگا۔

”اوہ مائی گاڈ! اس نے زیر لب کہا۔

ازراہ مذاق حرم کو دی گئی اپنی ہدایات اسے یاد
 آ گئیں۔ اسے ہر گز توقع نہیں تھی کہ حرم اس کی
 ہدایات پر عمل کر بیٹھے گی۔ اسے ہنسی بھی آئی لیکن
 دادی کے سامنے ضبط کر گیا۔ کچھ دیر بعد خالہ بی اور
 ذوریز حرم کے گھر پر موجود تھے۔

”حرم اٹھ کر بیٹھو اور سر پر دوپٹا لو..... خالہ بی
 آئی ہیں۔“ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی اماں کہہ کر
 پلٹ گئیں۔ حرم جو بڑے اطمینان سے بیڈ پر لیٹی
 لحاف اوڑھے رسالہ پڑھ رہی تھی جھٹ سے سیدھی
 ہوئی۔ رسالہ لحاف میں چھپایا اور سر پر نفاست سے
 دوپٹا نکالیا۔

کچھ ہی دیر میں خالہ بی، ذوریز اور اماں کمرے
 میں داخل ہوئے۔ خالہ بی نے آگے بڑھ کر شفقت
 سے حرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ماتھے پر بوسہ دیا۔
 وہ تینوں سامنے پڑے صوفے پر براجمان ہو گئے۔

کتنی ہی دیر ان کے درمیان حرم کے سیڑھیوں
 سے گر جانے کا واقعہ زیر گفتگو رہا اس دوران حرم نے
 ایک بار بھی نظر اٹھا کر ذوریز کو نہیں دیکھا۔ مگر خود پر
 پڑی ذوریز کی نظریں وہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔ اس
 کا خیال تھا کہ شاید وہ اس کے بارے میں سوچ رہا
 ہوگا کہ میری دی گئی ہدایات پر یہ دودن بھی ڈٹ کر
 عمل نہ کر سکی۔ وہ کسی بھی طرح اسے یہ باور نہیں کرانا
 چاہتی تھی کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں۔

کچھ دیر یونہی باتیں کرنے کے بعد خالہ بی اور
 ذوریز اٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں بھی ان کے ہمراہ
 کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”تم پریشان مت ہو۔ ان شاء اللہ حرم جلدی
 ٹھیک ہو جائے گی۔“ صحن سے گزر کر دروازے تک
 آتے ہوئے خالہ بی نے اماں کو دلاسا دیتے ہوئے
 کہا۔

”خالہ بی! مجھے اس کے گرنے کی اتنی فکر نہیں
 ہے جتنی پریشانی اس بات کی ہے کہ آج کل حرم بہت
 عجیب عجیب سی حرکتیں کر رہی ہے۔“

”عجیب عجیب حرکتیں؟“ اماں کی بات سن کر
 خالہ بی نا سمجھی سے بولیں۔

”جی خالہ بی! پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے گھر
 کے سارے کام بھاگ دوڑ کر کرنے لگی ہے۔ کھانا
 بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھاتی۔ کچی بھنڈیاں کھانے
 کی فرمائش کرتی ہے اور بار بار بھاگ کر چھت پر
 چڑھ جاتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ہماری چھت پر کسی
 بھوت کا بسیرا ہے۔“ کہتے ہوئے اماں کے چہرے
 پر پریشانی بالکل واضح تھی۔ ان کی پریشانی دیکھ کر
 ذوریز کو ہنسی بھی آرہی تھی اور خود پر غصہ بھی۔

”ارے تم خواخوہ کے وہم پال رہی ہو۔ اللہ
 کا نام لے کر پھونکتی رہا کرو حرم پر۔ ان شاء اللہ سب
 ٹھیک ہوگا۔“ خالہ بی اماں کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے
 انہیں تسلی دینے لگیں۔ اور پھر خالہ بی اور ذوریز
 الوداعی کلمات کہتے ہوئے دروازہ عبور کر گئے۔

☆☆☆

ذوریز کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ کچھ ہی دیر
 میں وہ روانہ ہونے والا تھا۔ ان کے کمرے میں کھڑا
 وہ پیکنگ کر رہا تھا دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس کم ان۔“ ٹی شرٹ کی تہ لگاتے ہوئے
 ذوریز نے مصروف سے انداز میں کہا۔ دروازہ
 ہولے سے کھلا۔

”ارے آپ..... تشریف لے آئے۔“
 چوکھٹ میں کھڑی لڑکی کو دیکھ کر ذوریز نے کہا۔

دھیرے چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔
 ”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ بیک میں
 کپڑے رکھتے ہوئے ذوریز نے کہا۔
 ”جی ٹھیک ہوں۔“ حرم نے جواب دیا۔

”ویسے..... میں نے سیڑھیاں چڑھنے
 اترنے کا کہا تھا۔ ڈائریکٹ چھلانگ لگانے کا نہیں
 کہا تھا۔“

ذوریز کا موڈ آج خاصا خوشگوار لگ رہا تھا۔ وہ
 مسکراتی نہیں رہا تھا مگر چہرے پر سنجیدگی بھی نہیں تھی۔
 ”میں نے چھلانگ نہیں لگائی تھی..... وہ تو بس
 میرا پیر مڑ گیا تھا۔“ جواباً حرم نے کہا۔

”اوہ.....“ ذوریز نے متاسف نظروں سے
 حرم کو دیکھا۔

”آپ جا رہے ہیں؟“ حرم نے چھوٹے ہی
 سوال کر ڈالا۔

”کیوں؟..... نہ جاؤں؟“ حرم کے سوال پر
 ذوریز ٹھہر کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے
 بولا۔

”نہیں..... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ حرم نے
 کہا تو ذوریز دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”وہ..... آپ نے اپنے باس سے بات کی
 میرے بارے میں؟“ حرم نے اپنا مدعا بیان کیا تو

ذوریز مسکرا دیا۔ اس نے تہ شدہ کپڑوں کو سلیقے سے
 بیک میں رکھ کر بیک کی زپ بند کی اور حرم کے

سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔
 ”ایکچو نیکی..... میں نے ان سے بات کی تھی

مگر..... انہوں نے کہا کہ کمانڈنگ آفیسر کے
 عہدے پر لڑکیوں کو فائز نہیں کیا جاتا..... لیکن چونکہ

آپ کی ٹریننگ ہو چکی ہے اس لیے آپ کمانڈنگ
 آفیسر تو نہیں مگر..... کمانڈنگ آفیسر کی بیوی ضرور بن

سکتی ہیں۔“ کہہ کر ذوریز نے گہری سوالیہ نظروں
 سے حرم کو دیکھا۔ حرم آنکھیں پھاڑے ذوریز کو

دیکھنے لگی۔
 ”اضل میں..... یہ بات مجھ سے دادی نے کی۔“

تھی۔

اگر آپ کو اعتراض ہے تو آپ مجھے بتا سکتی
 ہیں..... میں خود انکار کر دوں گا یہ کہہ کر ذوریز نے
 جواب طلب نگاہوں سے حرم کو دیکھا۔

وہ جو کھڑی مبہوت سی اسے دیکھے جا رہی تھی
 سنتے ہی شکست خوردہ انداز میں چہرہ جھکا کر چھوٹے
 چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ذوریز
 نے ایک گہری سانس خارج کی۔

اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ کال لیس کر کے
 موبائل کان سے لگاتا ہوا وہ واپس پلٹ آیا۔ اور
 ڈرینگ ٹیبل سے اپنا سامان اٹھانے لگا۔

”ہاں یار..... فائل تیار ہے..... میں کچھ ہی
 دیر میں نکل رہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے شیشے میں
 دیکھا تو فوراً کال کاٹ دی اور پیچھے مڑا۔

وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر ذرا سا چہرہ
 نکال کر اسے دیکھ رہی تھی۔ ذوریز بھی حیران کھڑا

اسے دیکھنے لگا۔ حرم نے نظریں جھکالیں اور مسکرا کر
 وہاں سے بھاگ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ذوریز

بھی مسکرا دیا۔ اسے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔
 اور پھر فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش لیے حرم کا دل

☆

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے
 بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں یہ چوہا بارے

فائزہ افتخار

قیمت - 400/- روپے

منگوانے کا پتہ:
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 فون نمبر: 32735021
 37، اردو بازار، کراچی

دلہا کی لہجہ

سنہری بال پونی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ایک شرارتی لٹ بار بار اس کے چہرے پر آ جاتی تھی جسے وہ اپنے مہندی کی کون پکڑے ہاتھ سے کان کے پیچھے اڑیں لیتی تھی۔ شریر لٹ اپنی حرکت سے باز نہیں آتی تھی۔ کچھ ہی بل کے بعد دوبارہ اس کے چہرے پر جھونے لگتی تھی لیکن نساء کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا اور لبوں پر دھیمی مسکان۔

منظر ٹی وی لاؤنج کا تھا۔ ایک ابراہیم صوفے پر دراز سامنے لگی ایل ای ڈی پر پاکستان اور انڈیا کا پرانا میچ دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں بڑا سا چپس کا پیکٹ تھا اور نظریں تھوڑی تھوڑی دیر بعد نساء کریم کا جائزہ لے رہی تھیں جو کچھ ہی دور قالین پر کشن رکھے بیٹھی تھی۔ سامنے پڑے موبائل فون کی اسکرین پر مہندی کا ایک دلکش ڈیزائن نظر آ رہا تھا جس کو ہو بہو وہ اپنے ہاتھ پر اتار رہی تھی۔ اس کے گھنگھریالے

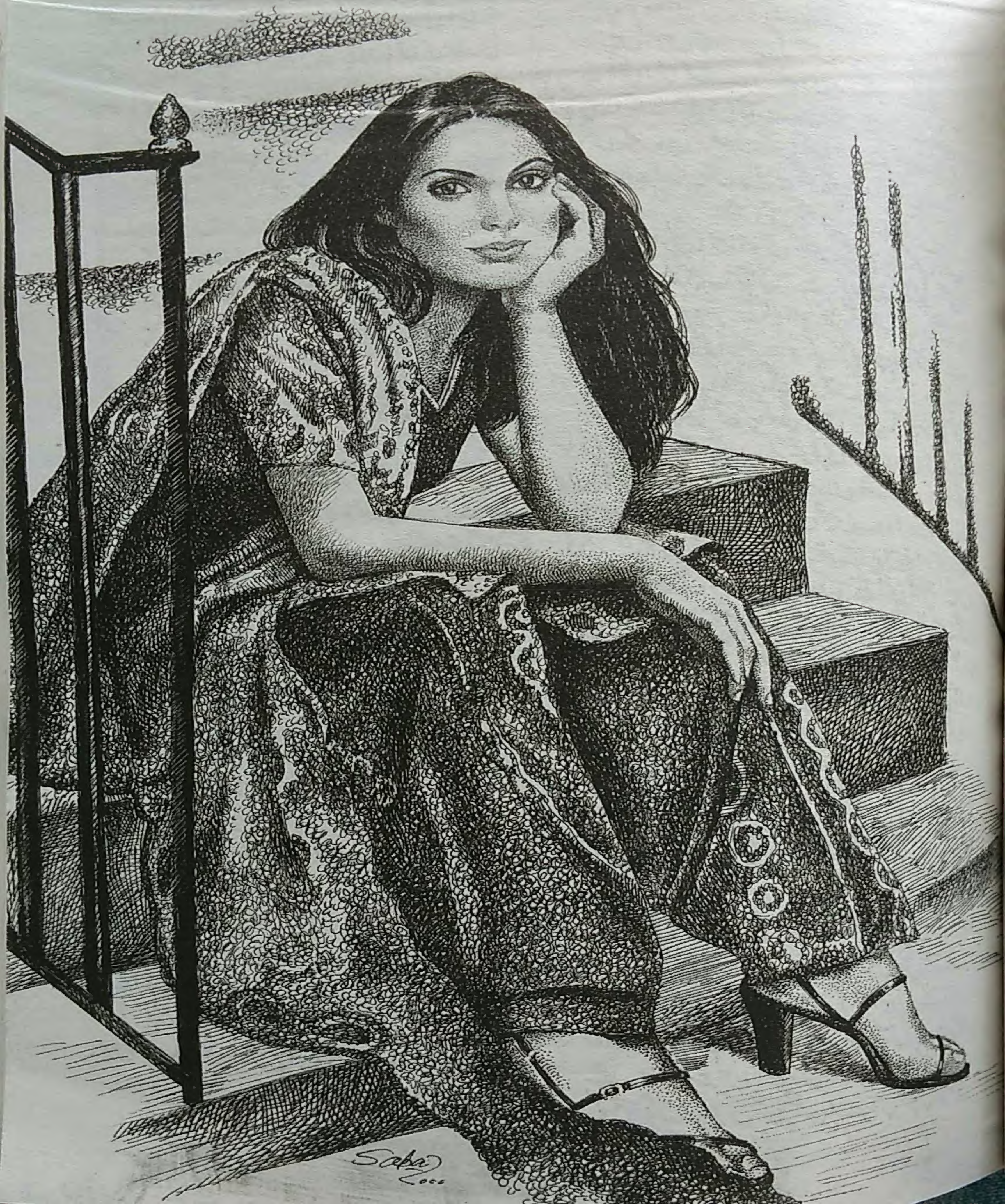
ناولٹ

مہندی کا ڈیزائن انتہائی نفاست سے اس کے خوب صورت ہاتھ کو مزید خوب صورت بنا رہا تھا اور وہ اپنی اس کارکردگی پر بے حد مطمئن تھی لیکن اس کا یہی اطمینان ایک کو ایک آنکھ نہیں بھار رہا تھا۔ اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر آ ہی گئی۔ اس نے اپنا پاؤں تھوڑا سا آگے بڑھا کر گیند کو اپنی طرف دھکیلا۔

اپنی شرارت سے چمکتی آنکھوں سے نساء کو دکھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے تاک کر نشانہ لگایا۔ گیند نساء کے مہندی سے سجے ہاتھ کو چھوتی ہوئی اچھل کر دور چلی گئی۔ اس اچانک افتاد پر نساء کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ دیکھا جہاں مہندی کے ڈیزائن کی جگہ صرف مہندی رہ گئی تھی۔

دوسری چیخ ارادی تھی۔ زیادہ بلند اور درد ناک۔ وہ بھڑک کر اٹھی اور جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ ایک اس کی چیخوں سے بے نیاز انتہائی شرافت اور معصومیت سے ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھا۔ آلہ قتل یعنی گیند جس نے نہایت بے دردی سے اس کی خوب





صورت مہندی کا خون کیا تھا۔ مہندی سے تھپی ہوئی کچھ فاصلے پر پڑی تھی۔ وہ پاؤں پختی ہوئی ایک کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ مہندی والا ہاتھ اس کے منہ پر جمادے۔ بامشکل اپنی خواہش کا گلا گھونٹتے ہوئے وہ طیش سے چلائی تھی۔

”تم انتہائی گھٹیا اور کمینے انسان ہو۔“ ایک نے اس کی طرف دیکھا اور نہ سمجھنے والے انداز میں بھنویں اچکائیں۔

”خیریت۔ اتنے غصے میں کیوں ہو؟“

نباء کا دل چاہا اس کا چہرہ نوچ لے۔ غصے سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے کے آگے نہایا۔

”یہ دیکھو۔ تم نے میری ساری مہندی خراب کر دی ہے۔“

”خدا کا خوف کرو نباء! میں تو ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ خوا مخوا پریشان نہ کرو مجھے۔“ اس نے دوبارہ اپنی توجہ ٹی وی کی طرف مرکوز کر لی۔

”تم نے وہ بال میرے ہاتھ پر ماری ہے اور اب ایسے معصوم بن رہے ہو جیسے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔“ نباء نے بھنا کر کہا۔

”میں ابھی خالہ کو بتاتی ہوں۔ وہی پوچھیں گی تمہیں، خالہ..... خالہ!“ وہ چلائی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ جانتی تھی طاہرہ اس وقت کچن میں مصروف ہوں گی۔

”یہ دیکھیں، اس ایک کے بچے نے کیا کیا ہے، میری مہندی کے ساتھ۔“ اس نے روہانسی ہو کر اپنا متاثرہ ہاتھ انہیں دکھایا۔

”دنیا میں کچھ بھی ہو جائے اس کا الزام بے چارے ایک پر ہی کیوں ہے آخر۔“ وہ اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔

”ایک! تم آخر باز کیوں نہیں آتے۔“ طاہرہ نے اسے ڈپٹا۔

”مام آپ بھی۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر کہا یوں جیسے ان کی بات پر اسے بہت بڑا شاک لگا ہو۔

”تم جا کر ہاتھ دھو لو ورنہ یوں ہی پکا ہو جائے

گا۔“ اب وہ نباء سے مخاطب تھیں۔

”پکا تو ہو بھی گیا۔“ ایک ہنسا۔

”میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں ایک ابراہیم!“ نباء نے انگلی اٹھا کر اسے دھمکی دی اور کچن سے باہر نکل گئی۔ ایک نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے سیٹی بجائی تھی پھر ماں کو گھورتے یا کر اس نے بھی وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

☆☆☆

طاہرہ اور سائرہ دو ہی بہنیں تھیں۔ آپس میں بے تحاشا محبت تھی۔ اتفاق سے دیورانی جٹھانی بھی بن گئیں۔ ایک دوسرے کی ہم راز، غم گسار۔ دونوں میں بے حد دوستی تھی۔ محبت تو کریم کو بھی سائرہ سے بہت تھی لیکن محبتوں کو نظر لگتے دیر نہیں لگتی۔

نباء کی پیدائش پر کوئی ایسی پیچیدگی ہوئی کہ سائرہ جانبر نہ ہو سکیں۔ کریم اپنی محبوب بیوی کے یوں بچھڑ جانے پر غم سے نڈھال ہو گئے۔ نباء کی طرف تو انہوں نے دیکھا بھی نہیں۔ وہ اسے سائرہ کی موت کا ذمہ دار گردانتے تھے۔ یوں نو مولود نباء طاہرہ کی گود میں آ گئی اور انہوں نے کسی قیمتی متاع کی طرح اس ذمہ داری کو سنبھالا تھا۔ وہ ان کی بھانجی بھی تھی اور بہن کی آخری نشانی بھی۔

ایک اس وقت دو سال کا تھا۔ اسے اپنی ماں کی نباء کے ساتھ شراکت بے حد ناگوار گزری تھی۔ وہ اس سے چڑنے لگا تھا۔ اسے وہ غاصب لگتی تھی جس نے اس کی ماں پر قبضہ کر لیا تھا اور باپ کی محبت کو بانٹ لیا تھا اور یہ چڑ آج تک برقرار تھی اس لیے وہ اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

گزرتے وقت نے کریم کو بھی اپنے دھارے میں شامل کر لیا تھا۔ وہ آسٹریلیا سیٹل ہو چکے تھے۔ کافی عرصہ تنہا رہنے کے بعد آخر انہوں نے وہاں شادی بھی کر لی تھی اور بیوی بچوں میں مکن ہو چکے تھے۔ نباء البتہ ان کے دل اور زندگی میں آج تک کوئی جگہ نہ بنا سکی تھی لیکن اسے اس محرومی کا بھی

احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ ابراہیم صاحب کی وہ لاڈلی تھی اور طاہرہ کی جان کا ٹکڑا۔ حتیٰ کہ دعا اور احمد جو بہت بعد میں پیدا ہوئے تھے وہ بھی اس کے نام کی مالا جیتے تھے۔

☆☆☆

”مام! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس ہٹلر کے ساتھ ساری زندگی گزار کیسے لی۔“ ایک غصے میں تن فن کرتا کچن میں داخل ہوا جہاں طاہرہ ٹیبل پر ڈھیر ساری سبزی رکھے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے غور سے اپنے بے حد ہینڈسم بیٹے کو دیکھا۔ بلو جینز اور ڈارک بلیو شرٹ میں ملبوس ناراض سا وہ اب فریج کھول کے اندر دیکھ رہا تھا۔

”بیٹے! باہر سے آ کر پہلے سلام کرتے ہیں۔“ انہوں نے ایک ٹوکری میں ٹماٹر نکال کر رکھے۔ ”یہ ذرا فریج میں رکھ دو۔“

”یہ سراسر آپ کی غلطی ہے۔“ ٹماٹر فریج میں رکھ کر وہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ ”آپ نے ان کی ہر بات مان کر انہیں ڈکٹیٹر بنا دیا ہے۔“ اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔

”کتنی دفعہ منع کیا ہے بوتل کو منہ مت لگایا کرو۔ گلاس میں پانی نکال کر پیو۔“ طاہرہ نے ایک دفعہ پھر اس کی بات نظر انداز کی۔ ”بام!“ ایک نے بھنا کر فریج بند کیا۔

”آپ کے شوہر کے بارے میں بات کرتا ہوں ناں تو آپ اسی طرح انجان بن جاتی ہیں۔ سنتی ہی نہیں ہیں۔“

”سن رہی ہوں۔“ وہ سبزی بناتے ہوئے مصروف لہجے میں بولیں۔ ”تمہاری یہ باتیں میں تمہارے بچپن سے سن رہی ہوں۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔“

وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”مجھے ایک بات بتائیں۔ ڈیڈ مجھ پر ایسے پابندیاں کیوں لگاتے ہیں جیسے میں کوئی لڑکی ہوں۔“

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- ✿ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✿ نئے بال اگاتا ہے۔
- ✿ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✿ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ✿ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ----- 350/- روپے

3 بوتلوں کے لئے ----- 500/- روپے

6 بوتلوں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

اب کیا ہوا ہے؟“

”میرے سارے دوست پورا پورا دن گھر سے باہر رہتے ہیں۔ لیٹ نائٹ بھی باہر انجوائے کرتے ہیں لیکن میرے ڈیڈ ہیں کہ یونیورسٹی میں بھی مجھے فالٹو نہیں رہنے دیتے۔ فون پر فون آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ کام ختم ہو گیا ہے تو گھر پہنچو۔“

”بس کچھ دنوں کی بات ہے۔“ طاہرہ نے تسلی دی۔ ”تمہارا ایم بی اے مکمل ہو جائے تو پھر تم پر اتنی پابندی نہیں رہے گی۔“

”جی ہاں۔“ ایک نے طنزاً کہا۔ ”اس کے بعد ان کے آفس میں پورا پورا دن ان کی نظروں کے سامنے جو رہنا پڑے گا۔ اسٹوڈنٹ لائف میں جس نے انجوائے نہ کیا اس نے بعد میں کیا خاک کرنا ہے۔“

”میں مانتی ہوں کہ تمہارے ڈیڈ کچھ زیادہ ہی سختی کرتے ہیں لیکن بیٹے! حالات آج کل بہت خراب ہیں اور تمہاری عمر ایسی ہے کہ جس میں برائی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آج کل لڑکوں کی حفاظت بھی لڑکیوں کی طرح کرنی پڑتی ہے۔ ہم بس ڈرتے ہیں اور تمہیں ہر قسم کی برائی اور برے ماحول سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔“ طاہرہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مام! مجھے اچھے برے کی تمیز ہے۔“ ایک نے مزہ پھلایا۔ ”میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔“

”جانتی ہوں۔ میرا بیٹا بہت سمجھ دار ہے۔“ طاہرہ مسکرائیں۔

”بس کچھ ہماری احتیاط پسندی سمجھ لو۔ پھر ایک وقت آئے گا جب ماں رہے گی نہ باپ، مکمل طور پر آزاد ہو گے تم۔“

”ہاں اب ایموشنلی بلیک میل کرنا شروع کر دیں مجھے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

یہ سچ تھا کہ ابراہیم صاحب نے اپنی اولاد پر بہت سختی کر رکھی تھی۔ وہ اس مقولے پر عمل کرتے تھے کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ لیکن دیکھو شیر کی نظر سے۔ ان

کے اپنے ہی اصول تھے جن کی پابندی گھر کے ہر فرد پر لازم تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے سامنے کچھ بول سکے یا ان کے کسی فیصلے کو تبدیل کروا سکے۔

☆☆☆

”کیا مصیبت ہے یار!“ نباء نے پین پٹھا۔ وہ لان میں تازہ ہوا انجوائے کرنے آئی تھی۔ موسم بے حد اچھا ہو رہا تھا۔ ڈھیر ساری خوب صورت سیلفیاں لینے کا موڈ ہو رہا تھا لیکن بھلیا ہوا احمد کا جس نے اپنی حساب کی بک اسے پکڑا دی تھی اور اب وہ کوئی گھنٹہ بھر سے ایک سوال حل کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”چھوڑیں نباء آپ!“ احمد نے ایک کو آتے دیکھ کر اس کی مشکل آسان کی۔

”ایک بھائی آگئے ہیں، میں ان سے کروالیتا ہوں۔“

اس نے سکون کا سانس لیا لیکن ایک کی تیر نظر آتے ہی معاملہ بھانپ چکی تھی اور اب وہ اس کی جان چھوڑنے والا ہرگز نہیں تھا۔

”احمد! تم بھی کس جاہل سے ہیلپ لینے بیٹھ جاتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ تمہاری نباء آپ پڑھائی لکھائی میں بس ایورس ہی ہیں۔“ جتنی تیزی سے وہ سوال حل کر رہا تھا اس سے زیادہ تیز اس کی زبان چل رہی تھی۔

”جاہل نہیں ہوں میں۔“ نباء کو بھڑکنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ ”بی اے کے ایگزامز ہونے والے ہیں میرے۔“

”ہا۔۔۔۔۔ بی اے۔“ ایک نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”آج کل جب گاؤں دیہاتوں کی لڑکیاں بھی میتھس اور فزکس پڑھ رہی ہیں۔ ہماری نباء صاحبہ سیمپل بی اے کر رہی ہیں، کیا بات ہے۔“

”تو میں نے کون سا نوکری کرنی ہے۔“ نباء نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔

”تعلیم حاصل کرنے کا مقصد صرف نوکری کرنا نہیں

ہوتا۔“ ایک نے سوال حل کر کے کاپی احمد کو واپس کی۔

”اچھا تو پھر کیا ہوتا ہے، تعلیم حاصل کرنے کا مقصد۔“ نباء نے جوابی وار کیا۔ ”تہذیب اور اچھے اخلاق کا حصول، تو ان سے تو تم بھی فارغ ہو۔“

”باس..... بس۔“ احمد نے درمیان میں آ کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ”کچھ دیر کے لیے سیز فائر کریں۔ مام آرہی ہیں۔“

طاہرہ سیدھی ادھر ہی آئی تھیں۔

”نباء رات کا کھانا تیار ہے، سلا د اور راستہ بنا کر کھانا تم نے سرو کرنا ہے۔“ لان چیئر سنبھالتے ہوئے انہوں نے نباء کے لیے ہدایت نامہ جاری کیا۔

”ہونہہ..... آپ نے کہا اور اس نے کر لیا۔“ ایک باز نہیں آیا تھا۔

”نباء! تمہارے ایگزامز ہو جائیں تو کوکنگ سیکھو۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ کہیں خالہ نے کچھ سکھایا ہی نہیں ہے۔“

”سکھایا تو آپ نے واقعی کچھ نہیں ہے مام!“ ایک کی زبان پر پھر کھجلی ہوئی تھی۔

”ایک۔“ طاہرہ نے اسے گھورا۔

”خالہ پلینز، مجھ سے نہیں ہوتی یہ کوکنگ ووکنگ۔“ نباء نے منہ بنایا۔

”اچھا، تو پھر کیا کرو گی شادی کے بعد تم۔“ طاہرہ نے استفسار کیا۔

رومانس۔“ نباء کی زبان بے ساختہ پھسلی تھی۔

ایک نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ طاہرہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

”خالہ! آپ میری شادی ایسے لڑکے سے کیجیے گا جو بہت امیر ہو۔ ہر کام کے لیے نوکر چاکر ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہ کرنا پڑے۔“ اس نے جھینپ کر اپنی بات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

”آپی آئیں، کرکٹ کھیلتے ہیں۔“ احمد اور دعا اس کے سر پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

”چلو۔“ وہ فوراً اٹھی۔

”میں بھی کھیلوں گا۔“ ایک بھی شامل ہو گیا۔

”نہیں، تم چیٹنگ کرتے ہو۔“

”اگر میں نہیں کھیلا تو تمہیں بھی نہیں کھیلنے دوں گا۔“ ان کی نوک جھونک پھر شروع ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وقت یوں ہی گزر رہا تھا لڑتے جھگڑتے، شام دن کو دھکا دے کر زبردستی گھس آتی۔ ابھی بے چاری کچھ دیر سکون سے بیٹھ بھی نہیں پاتی تھی کہ رات آ کر اسے نکال باہر کرتی۔ یہی سب کچھ اگلی صبح رات کے ساتھ ہوتا۔ دن کو اپنے پورے طمطراق کے ساتھ آتا دیکھ کر اسے اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑتا۔ ایک نے ابراہیم صاحب کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا اور نباء نے طاہرہ کے ساتھ کچن۔ زندگی دھیمے سروں میں بہہ رہی تھی جب ابراہیم صاحب نے اس میں پتھر پھینک کر بھونچال پیدا کر دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ طاہرہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ابراہیم صاحب نے ان کے سر پر کوئی بم پھاڑ دیا ہو۔ بات ہی ایسی تھی سن کر ہی ان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

نباء اور ایک کا رشتہ..... یہ تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔

”کیا ہوا، پریشان کیوں ہو گئیں آپ؟“ ابراہیم صاحب نے استفسار کیا۔

”بچے نہیں مانیں گے ابراہیم! ان کی آپس میں بالکل نہیں بنتی۔“ طاہرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”ان کو بتائیے گا کہ یہ میرا فیصلہ ہے اور میں اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتا۔“ ابراہیم صاحب کا لہجہ رعب دار تھا۔ ہمیشہ کی طرح دو ٹوک۔

”اچھا، آپ نے کریم بھائی سے بات کی۔“ آخر نباء ان کی سگی اولاد ہے۔ ان کا حق ہے اس پر۔“

طاہرہ کو خیال آیا۔

”کرچکا ہوں۔“ ابراہیم صاحب نے چشمہ

اتار کر میز پر رکھا۔

”اسے کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی وہ اعتراض کا کوئی حق رکھتا ہے۔ بناء ہماری بچی ہے، ہم نے اسے پالا ہے۔ اس کا اچھا برا ہم ہی نے دیکھنا ہے۔“

”ہوں۔“ طاہرہ خاموش ہو گئیں۔ بناء اور ایک کے متوقع رد عمل کے بارے میں سوچ کر ہی ان کا بی پی ہائی ہونے لگا تھا، وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ ابراہیم صاحب نے دوبارہ چشمہ لگا لیا اور میز سے کتاب اٹھائی۔

”بلڈ پریشر کی ٹیمپلٹ لے لوں۔“

”آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پر سوار کر لیتی ہیں طاہرہ بیگم!“ انہوں نے عینک کے اوپر سے طاہرہ کو دیکھا۔

”آپ کا کام تو ہے صرف ٹینشن دینا۔ جھیلنا تو مجھے پڑتا ہے ناں۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

ایک غصے سے پورے کمرے میں چکر لگاتا پھر رہا تھا یوں جیسے پھلجڑی کو کسی نے تیلی لگا دی ہو۔ یہ خیال آتے ہی دعائے بے ساختہ اٹھ آنے والی ہنسی کو فوراً دبایا کیونکہ اس وقت ایک کے سامنے ہنسنے یا مسکرانے کا مطلب تھا آئیل مجھے مار۔

”مام آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔ آپ نے سوچا بھی کیسے۔ بناء اور میرا تو کوئی میچ ہی نہیں بنتا۔“ وہ ہتھیلی پر مکا مارتا ماں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”بیٹے تمہارے ڈیڈ کا فیصلہ ہے یہ۔“ طاہرہ نے رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، بناء بہت اچھی ہے۔“

”یہ میں کیا سن رہی ہوں خالہ۔“ بناء بھی پاؤں پٹختی آدھمکی تھی۔ ”احمد بتا رہا ہے کہ آپ لوگ میرا اور ایک کا.....“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ایک اس کے سر پر کھڑا کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ یعنی احمد کی دی گئی خبر درست تھی،

ایک جسے وہ دو گھڑی برداشت نہیں کر سکتی تھی، پوری زندگی کے لیے اسے اس کے سر پر مسلط کیا جا رہا تھا۔

”خالہ ٹھیک ہے، آپ نے مجھے پالا ہے لیکن آپ اپنے احسانوں کا بدلہ مجھ سے یوں نہیں لے سکتیں۔ آپ اپنے آوارہ اور لفنگے بیٹے کو میرے سر پر یوں نہیں تھوپ سکتیں۔“ شدت جذبات میں وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی۔

”کیا..... کیا.....“ بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ایک پھٹا۔ ”میں آوارہ اور لفنگا۔ تمہیں کہنے کی ہمت بھی کیسے ہوئی۔ تم خود کیا چیز ہو، آئینے میں کبھی شکل دیکھی ہے اپنی۔“

”بہت دفعہ، تم سے ہزار گنا اچھی ہوں۔ تم تو جتنے زیادہ لمبے ہو تمہاری عقل اتنی ہی ٹخنوں میں ہے۔“ بناء نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر استہزائیہ کہا۔

”مام!“ ایک رو ہانسا ہو گیا۔

”دیکھ رہی ہیں آپ اس لڑکی کی گز بھر کی زبان۔ میں نے نہیں کرنی اس سے شادی۔“

”اور خالہ میری طرف سے بھی انکار ہے، ورنہ میں خود کشی کر لوں گی۔ یاد رکھیے گا۔“ بناء نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

طاہرہ سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

”تم دونوں۔“ انہوں نے باری باری دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اپنا اپنا انکار اپنے باپ اور تایا تک پہنچاؤ، جو ٹھیک دس دن بعد تمہاری باقاعدہ منگنی کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ میرے سامنے شور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ بالا آخر بلی تھیلے سے پوزی کی پوری باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

گھر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ ایک کی تیوری پر اگر مستقل بل پڑے تھے تو بناء بھی ہر ایک کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ دعا اور احمد کی تو شامت آئی ہوئی تھی۔

ایک ابھی آفس سے آیا ہی تھا کہ نباء نے اس کے کمرے کا دروازہ بجایا۔

”ذرا باہر آ کر میری بات سنو۔“

”آرڈر تو ایسے دیتی ہے جیسے میں اس کا غلام ہوں۔“ بڑبڑاتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکلا۔ نباء ڈائنگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”چائے ہی بنا لیتیں۔“ ایک نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ جواباً نباء نے اس سے بھی برا منہ بنا کر دعا کو چائے کا آرڈر دیا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم بتایا ابو کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ تمہیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔“

”واہ واہ کیا بات ہے آپ کی مس نباء کریم!“ ایک نے سر ہلا کر طنز یہ کہا۔ ”اس طرح ڈیڈ کی نظر میں آپ بن جائیں گی معصوم اور مظلوم جو کہ آپ سرگز نہیں ہیں اور میں بے چارہ..... جو پہلے ہی ان کی گڈ بک میں نہیں ہوں مزید برا بن جاؤں گا۔ سوری۔ میں تو ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ تم خود جا کر ان کے سامنے انکار کیوں نہیں کر دیتیں بلکہ یہ زیادہ بہتر رہے گا۔“

”نہیں۔“ نباء نے نفی میں سر ہلایا۔

”بتایا ابو نے کبھی بھی اپنی مرضی مجھ پر مسلط نہیں کی۔ زندگی میں ہمیشہ جو میں نے چاہا وہی کیا۔ یہ پہلا فیصلہ ہے جو انہوں نے میرے بارے میں خود کیا ہے۔ میں اگر اس کے خلاف گئی تو وہ بہت ہرٹ ہوں گے۔“

”میں بھی انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی اور حل سوچو۔“ ایک نے صاف جواب دے دیا۔

”تم سے تو وہ ویسے بھی اکثر ناراض ہی رہتے ہیں۔ تھوڑا سا اور ہو جائیں گے، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ کم از کم اس مصیبت سے تو جان چھوٹے گی۔“

”تم میرے کندھے پر بندوق رکھ کر مت چلاؤ۔ انکار تمہیں ہی کرنا پڑے گا۔“

”میں نہیں۔ تم کرو گے انکار۔“ نباء نے میز پر

مکا مارا۔

”میں کچھ کہوں۔“ یہ احمد تھا۔

”بڑوں کے بیچ میں تم مت بولو۔“ ایک نے ہاتھ ہلا کر اسے منع کیا۔

”بولنے دوا سے۔ بتاؤ احمد! تم کیا کہتے ہو۔“ ایک کی مخالفت تو نباء پر فرض تھی۔ ایک نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھیں بے شک آپ دونوں کی دشمنی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔“ احمد نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ”لیکن اب جو مسئلہ درپیش ہے وہ دونوں کا ہے۔ یہ اس طرح لڑ جھگڑ کر کبھی بھی حل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ دونوں واقعی اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں تو کچھ عرصے کے لیے دوستی کر لیں۔ بعد میں تو تو میں میں کرتے رہے گا لیکن اگر ابھی آپ نے مل کر اس مسئلے کو حل نہ کیا تو یوں ہی لڑتے جھگڑتے آپ لوگوں کی شادی ہو جائے گی۔ یہ میں لکھ کر دے سکتا ہوں۔“

”اللہ نہ کرے۔“ نباء کے منہ سے بے ساختہ

نکلا۔

”بس تو پھر کچھ عرصے کے لیے دوست بن جائیں اور مل کر کوئی حل سوچیں۔“ احمد نے کہا۔

”منہ تمہارا چھوٹا ہے لیکن بات تم نے بے شک بڑی کی ہے۔“ ایک نے لمبی سانس لی۔

”میں تیار ہوں۔“

”میں بھی۔“ نباء بولی۔

”بس تو اسی خوشی میں آپ لوگ چائے

پیئیں۔“ دعا نے چائے میز پر رکھی۔

☆☆☆

نباء نے گہری سانس لی اور چائے کی ٹرے کو مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ دونوں اسٹڈی کے دروازے کے باہر کھڑے تھے، طے یہی ہوا تھا کہ مل کر ابراہیم صاحب سے بات کی جائے۔

”بات تم شروع کرو گی۔“ ایک کو اپنی بیڑی تھی۔ باپ کے سامنے اس کی ویسے ہی جان نکلتی تھی

سواب بھی وہ گھبرایا ہوا تھا۔ بناء نے جواباً اسے گھورا اور دروازے پر دستک دی۔

”کم ان۔“ ابراہیم صاحب کی بھاری آواز پر ایک بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بناء توجہ دیئے بغیر اندر داخل ہو گئی۔

”آؤ آؤ بیٹا۔“ ابراہیم صاحب اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ بناء نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور ایک باہر رہ گیا تھا۔ اس نے دانت کچکچائے اور آگے بڑھ کر چائے ٹیبل پر رکھی۔

”بیٹھو۔“ ابراہیم صاحب نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آج تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میری بہت خواہش تھی کہ میری پہلی اولاد بیٹی ہو اور یہ خواہش تم نے آ کر پوری کر دی۔ بیٹیاں بہت پیاری چیز ہوتی ہیں، انہیں نظروں سے دور کرنے کا دل نہیں چاہتا۔ ڈر لگتا ہے نا قدرے لوگوں میں پھنس جائیں تو ماں باپ بے چارے جی سکتے ہیں نہ سکون سے مر سکتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔

”والدین کے ہاتھ میں ان کی اولاد کا نصیب نہیں ہوتا لیکن وہ حتی المقدور ان کے لیے بہترین کا انتخاب کرتے ہیں۔ میں نے تمہارے لیے جو فیصلہ کیا ہے تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں بیٹا۔“

بناء نے ان کی طرف دیکھا، گریس فل سو بر پر سنائی والا یہ آدمی جو غم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا باپ نہیں تھا، لیکن وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کا باپ نہیں تھا۔ زندگی کے ہر لمحے میں وہ اس کے باپ کی جگہ پر موجود تھا۔ گھر میں ہر ایک کے لیے گرجتا برستا وہ شخص جب اس کی طرف دیکھتا تھا تو ایک دم ٹھنڈی چھاؤں بن جاتا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ ان کے سینے سے لگ جائے۔ انہیں بتائے کہ وہ ان سے کس قدر محبت کرتی ہے لیکن ان کا رعب اسے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں، بتایا ابو۔“

”جیتتی رہو۔“ وہ خوش ہو گئے۔ ”مجھے پتا تھا

میری بیٹی میرا مان ضرور رکھے گی۔“ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ مسکرا رہے تھے۔ باہر ایک بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اسے اسٹڈی سے نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ اسے نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔

”دعا! میرا خیال ہے مجھے آج پار لڑ کا ایک چکر لگالینا چاہیے۔ خالہ نے پکن میں جھونک کر میری اسکن کا ستیاناس کر دیا ہے۔“ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ دعا نے ایک نظر اس پر ڈال کر پھر اپنی کتابوں میں سر دے لیا تھا۔

”بات کی تم نے ڈیڈ سے۔“ ایک جواب کا منتظر تھا۔

”اتنا تجسس ہو رہا ہے تو ساتھ چلنا تھاناں۔“ وہ جل کر بولی۔

”یار تم میری کمزوری جانتی ہو۔ ڈیڈ کا سامنا کرنا بہت مشکل کام ہے، تم مجھے بتاؤ ناں کیا بات ہوئی۔“ وہ صبح جو انداز میں بولا۔

”انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔“

”تم نے انکار کر دیا۔“ ایک نے پر جوش انداز میں اس کی بات کاٹی۔ بناء نے ایک گہری سانس لی۔

”نہیں۔“

”کیوں۔“ وہ ایک دم جھنجھلا گیا پھر آنکھیں پھیلا کر بغور اسے دیکھا۔

”کہیں تمہارا دل تو نہیں آ گیا مجھ پر۔“

”یہ تو خیر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔“ بناء نے منہ بنایا۔

”دراصل بتایا ابو کو منع کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ محض ان کی خوشی کی خاطر میں تمہارے جیسی مصیبت کو اپنے گلے نہیں لگا سکتی۔“

”تو میں کون سا تمہارے گلے لگنے کے لیے ترس رہا ہوں۔“ ایک بھنا کر بولا۔
 ”کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔“
 یہ دعا تھی۔ ”غیر مہذب، ناشائستہ ناموزوں۔“
 ”یہ کیا ہوتا ہے۔“ نباء حیران ہو کر اس کی طرف پلٹی تھی۔

”اپنے سابقے لاحقے اپنے پاس رکھو۔“
 ایک بد مزہ ہو کر کمرے سے نکل گیا۔ دعا شرمندہ سی ہو کر دوبارہ اپنی اردو کی کتاب پر جھک گئی۔

☆☆☆

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ دعا اور احمد نیچے قالین پر اپنی کتابیں پھیلانے، اسکول کا کام کر رہے تھے۔
 نباء صوفے کے اوپر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔
 ایک ایک طرف ٹہل رہا تھا۔
 ”تم ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتے۔“ بالآخر نباء نے اپنی جھجھلاہٹ اس پر اتاری۔
 ”واک کرنے سے میرا دماغ زیادہ کام کرتا ہے۔“ ایک نے متانت سے جواب دیا۔

”پھر کیا کام کیا اتنی دیر میں تمہارے دماغ نے۔“

ایک سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک نظر احمد اور دعا پر ڈالی اور دوسری نباء پر۔ تینوں اس کی طرف دیکھ رہے تھے، اس نے کہنا شروع کیا۔
 ”میں اچھا خاصا ہنڈسم ہوں۔ ایجوکیٹڈ بھی ہوں اور ویل آف بھی لیکن آج تک میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ یہ نہیں کہ مجھے کسی نے پسند نہیں کیا۔ کالج میں، یونیورسٹی میں ہزاروں لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں لیکن میں نے کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں ہمیشہ ناقابلِ تسخیر بنا رہا۔ اس کا صلہ تو مجھے یہ ملنا چاہیے تھا کہ کوئی پریوں جیسی حسین سی نازک سی شرمیلی سی لڑکی آ کر میرے دل کے دروازے پر دستک دیتی اور میں دل و جان سے اسے قبول کر لیتا لیکن ہوا کیا۔ ایک چڑیل میرے اوپر قبضہ کرنے جا رہی ہے اور میں کچھ بھی نہیں کر پار ہا۔“

وہ اچھا خاصا آب دیدہ ہو گیا تھا۔
 ”تمہیں میں چڑیل لگتی ہوں۔“ نباء نے اسے گھورا۔ ”تم خود کسی جن سے کم ہو کیا۔“
 ”ویسے جن اور چڑیل کی جوڑی بنتی تو ہے۔“
 احمد نے سوچ کر کہا۔ جواباً نباء نے اسے بھی ایک گھوری سے نوازا اور اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی۔

”ظلم تو مجھ پر ہو رہا ہے۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے میں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے۔ کیا زبردست آئیڈیل تھا میرا۔ لونگ، کیئرنگ، میرے آگے پیچھے پھرنے والا۔ میرے ناز و خیرے اٹھانے والا۔ مجھ سے رومانٹک باتیں کرنے والا اور مل کیا رہا ہے مجھے..... تم۔“ انگلی سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم تو دنیا کے آخری انسان بھی ہوتے تو میرا انتخاب کبھی بھی نہیں ہو سکتے تھے۔“ ایک کے ماتھے پر بل پڑتے دیکھ کر دعا ایک دم بول اٹھی۔
 ”آپ لوگ ڈیڈ کو خط کیوں نہیں لکھتے۔“
 ”خط۔“ تینوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

”خط۔ درخواست..... کچھ بھی.....“ وہ گڑبڑا گئی۔ ”دیکھیں اگر بات آ منے سامنے نہ کی جاسکے تو لکھ کر کہہ دینا چاہیے۔“
 ”پیپر پنسل دو۔“ ایک فوراً ہی لکھنے بیٹھ گیا۔
 ”پیارے تایا ابو اور ڈیڈ!“
 ”پہلے ڈیڈ لکھو بعد میں تایا ابو۔“ نباء نے اعتراض کیا۔

”ہر چیز میں کیڑے مت نکالا کرو۔ تایا ابو کے ساتھ ہی تو ڈیڈ لکھا ہوا ہے۔“ ایک نے اسے جھڑکا۔
 ”آگے بتاؤ کیا لکھنا ہے۔“
 ”لکھو..... پیارے تایا ابو اور ڈیڈ۔“ نباء نے لکھوانا شروع کیا۔

”ہم دونوں آپ سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔ اس لیے پلیز ہمارا رشتہ آپس میں طے نہ کیا جائے۔“
 ”پرفیکٹ۔“ ایک نے لکھ کر اطمینان سے سر

ہلایا۔
 ”نیچے اپنا اور میرا نام بھی لکھ دو۔“ نباء نے
 مشورہ دیا۔ ”لیکن اب یہ انہیں دے گا کون؟“
 ”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ ایک نے نام لکھ کر پیپر
 فولڈ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اسٹڈی ٹیبل پر رکھی ان کی کسی فائل میں رکھ

آتا ہوں۔“
 ”چلو یہ کام بھی ہوا۔“ اس کے جانے کے بعد
 نباء نے ہاتھ جھاڑے۔
 ”کھینکس ٹومی۔“ دعا ہنسی۔

ان سب کے کندھوں سے جیسے ایک بوجھ سا
 اتر گیا تھا۔ ایک اور نباء کی پریشانی اور بگڑے موڈ کی
 وجہ سے دعا اور احمد بھی ٹینشن میں آئے ہوئے تھے۔
 مسئلہ حل ہونے کی امید نے ماحول پر اچھا اثر ڈالا۔
 شام کو نباء نے مسلسل گنگناتے ہوئے چکن پلاؤ بنایا۔
 ایک نے سب کو آکس کریم کھلائی۔ اتنے دوستانہ
 ماحول پر طاہرہ حیران ہوتی رہیں اور وہ چاروں معنی
 خیز انداز میں مسکراتے رہے۔ یہ سیاری خوش
 گواریت اگلے دن سہ پہر تک برقرار رہی تھی۔

شام کے تقریباً چار بجے ابراہیم صاحب کے
 گرجنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ اسٹڈی
 میں تھے اور طاہرہ کو ادنیٰ آواز میں ڈانٹ رہے
 تھے۔

”لگتا ہے ڈیڈ نے خط پڑھ لیا ہے۔“ احمد نے
 ان کے کمرے میں جھانکا۔ نباء جو دروازے سے
 کان لگا کر آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، جھنجھلا
 کر بولی۔

”ایک کہاں ہے۔“

”بھائی تو سو رہے ہیں۔“ دعا نے بتایا۔

”اٹھاؤ اسے۔“ اس نے دعا اور احمد دونوں کو
 بھیجا اور خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں گھبراہٹ ہوا
 ایک بھی آ پہنچا۔

”یہ ڈیڈ کو کیا ہوا ہے؟“

”وہی جو ہونا تھا۔ تمہیں پتا تو ہے ان کے غصے

کا۔“ نباء نے دوبارہ دروازے کے پاس جا کر سننے
 کی کوشش کی۔

”یہاں تو پتا ہی نہیں چل رہا۔ باہر جا کر سنتا
 ہوں۔“ ایک باہر نکل گیا۔ وہ تینوں گھبرائے ہوئے
 اس کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی
 ہوئی۔

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈیڈ کی کوئی فائل
 گم ہو گئی ہے۔ اصل میں مام نے آج صفائی کروائی
 تھی اسٹڈی کی تو وہ غصہ کر رہے ہیں کہ ان کی ساری
 چیزیں ادھر ادھر ہو گئی ہیں۔“

”تم نے خط کہاں رکھا تھا۔“ نباء نے پوچھا۔
 ”ٹیبل پر۔ ان کی بلو فائل میں۔“ اس نے
 کہتے ہوئے سر پر ہاتھ مارا۔

”وہی فائل تو گم ہوئی ہے۔“

”اب جب وہ فائل ملے گی اور اس میں سے
 آپ کا خط نکلے گا تو آپ دونوں کی خیر نہیں ہے۔ ڈیڈ
 پہلے ہی بہت غصے میں ہیں۔“ احمد نے انہیں ڈرانے
 کی کوشش کی جس میں وہ سو فیصد کامیاب رہا۔

”تم جا کر فائل ڈھونڈو اور تایا ابو کے ہاتھ لگنے
 سے پہلے اس میں سے خط غائب کرو۔“ نباء نے
 ایک سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ بے چارہ فوراً ہی مشن پر
 روانہ ہو گیا۔ اسٹڈی کا ماحول اچھا خاصا گرم تھا۔

ابراہیم صاحب غصے کے بہت خراب تھے۔ یہ طاہرہ
 ہی ان کی اہمیت تھی کہ وہ ان کا غصہ برداشت کرتی تھیں۔

اس نے اندر جھانکا، طاہرہ فائل ڈھونڈ رہی تھیں اور
 ابراہیم صاحب منہ سے گولیہ باری کر رہے تھے۔

”ہزار دفعہ میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ ملازمہ

سے میری اسٹڈی مت صاف کروایا کرو۔ ہر چیز کی
 جگہ بدل دیتی ہے۔ میری اتنی اہم فائل تھی، اس کا کیا
 بھروسا۔ چاہے اس نے کوڑے میں ہی پھینک دی
 ہو۔“

”ڈھونڈ رہی ہوں ناں میں۔ ابھی مل جاتی
 ہے۔“ طاہرہ نے صوفے سے کشن اٹھا کر چیک

کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔

”تم کیا کر رہے یہاں پر؟“ ابراہیم صاحب کی نظر دروازے پر کھڑے ایک پر پڑی تھی۔

”مم..... میں بھی فائل ڈھونڈنے میں مدد کرتا ہوں مام کی۔“ وہ اندر آ گیا۔

”ہونہہ..... تمہیں تو ضرور ہی مل جائے گی

ناں۔“ وہ کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔

ایک نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ بک

ریکس میں، ٹیبل پر پڑی فائلز اور کتابوں میں۔

صوفوں پر کٹن ہٹا کر ڈیکوریشن پیسز کے آگے پیچھے۔

ابراہیم صاحب نے اپنا پسندیدہ مشغلہ پھر سے شروع

کر دیا تھا۔

”ہوتی تو اتنی دیر میں مل نہ جاتی۔ مان لو

تمہاری چہیتی کوڑے میں پھینک گئی ہے۔ تم آخر

میری کسی بات پر کان کیوں نہیں دھرتی ہو طاہرہ۔

جب میں نے منع کیا تھا تو تم نے اس سے صفائی

کیوں کروائی۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور یہ کمر بہت

گندا ہو رہا تھا۔“ اب تو طاہرہ بھی روہا لسی ہو گئی

تھیں۔ اس منحوس فائل کو پتا نہیں زمین کھا گئی تھی یا

آسمان۔ ملنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”تو رہنے دیتیں گندا ہی۔ کم از کم یہ پریشانی تو

نہ ہوتی۔“

ایک نے بھاری اسٹڈی ٹیبل کے نیچے

جھانکا۔ بلو فائل نیچے پڑی تھی۔ اس نے چور نظروں

سے دیکھا، ابراہیم صاحب کی ساری توجہ طاہرہ کو

پھٹکارنے کی طرف تھی۔ اس نے خط نکال کر چپے

سے اپنی جیب میں منتقل کیا اور فائل اٹھا کر کھڑا

ہو گیا۔

”ڈیڈ! یہ فائل ہے کیا؟“

”ہاں۔“ انہوں نے لپک کر فائل جھپٹی۔

”کہاں سے ملی تمہیں؟“

”ٹیبل کے نیچے پڑی تھی۔“

”دیکھا۔“ ابراہیم صاحب نے فاتحانہ نظروں

سے طاہرہ کو گھورا۔ ”یہ صفائی کی ہے محترمہ نے۔

آدھی چیزیں ٹیبل کے نیچے گھسا کر چلی گئی ہے۔“

ایک ان دونوں کو الجھتا چھوڑ کر نباء کے کمرے میں

آیا، جہاں وہ تینوں ہنوز حالت پریشانی میں تھے۔

”یہ لو اپنا خط۔“ اس نے خط نباء کو پکڑ لیا۔

”تایا ابو کو پتا تو نہیں چلا۔“ اس نے پوچھا۔

”بس بال بال بچ گئے۔ احمد مجھے پانی پلاؤ۔“

وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

”اب کیا ہوگا۔“ نباء نے خط پھاڑ کر ڈسٹ

بن کی نذر کیا۔

”یہ اسکیم تو فیل ہو گئی۔“

”میرا خیال ہے۔“ ایک نے گہری سانس

لے کر نباء کو دیکھا۔ ”فی الحال منگنی کر لیتے ہیں، بعد کی

بعد میں دیکھی جائے گی۔ منگنی کا کیا ہے ٹوٹ بھی سکتی

ہے۔“ ایک کے لیے ابراہیم صاحب کو انکار کرنے

سے زیادہ آسان تھا نباء کو جھیلنا اور ویسے بھی جب

سے ان کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار ہوئے

تھے۔ وہ اب اسے زیادہ بری نہیں لگتی تھی۔ نباء کو بھی

چارونا چاراس تجویز سے متفق ہونا ہی پڑا تھا۔

☆☆☆

منگنی ہال میں رکھی گئی تھی۔ کچھ قریبی عزیز و

اقارب کو بلا کر مختصر سی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔

ہمیشہ الٹے سیدھے حلیے میں رہنے والی نباء آج تیار

ہو کر سامنے آئی تو ایک اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

ڈل گولڈن کلر کا کام دار فراک تھا۔ ایک طرف

دوپٹا تھا اور دوسری طرف پھولوں سے سجے بال

آگے کی طرف ڈالے ہوئے تھے۔ سنہری لٹین

انتہائی نفاست سے چہرے کے ارد گرد پڑی تھیں۔

خوب صورتی سے کیے گئے میک اپ میں وہ کوئی

شہزادی لگ رہی تھی۔

اسے لگا جیسے اس کے دل کے دروازے

کھٹاک کھٹاک کھلتے چلے جا رہے تھے اور وہ کسی قسم

کی دستک کی زحمت کئے بنا سیدھی اس کے دل کے

اندر گھسی چلی آرہی تھی۔ شاہانہ انداز میں مکمل مالکانہ

حقوق کے ساتھ۔

”تم اتنے غور سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ نباء نے اس کا مسلسل اپنی طرف دیکھنا محسوس کر لیا تھا۔
”بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔“ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

دھت تیرے کی۔ ساتھ ہی اپنے دل کو ڈپٹا تھا جو ایک دم ہی دغا دے کر مخالف پارٹی سے جا ملا تھا۔
”پورے تیس ہزار لگے ہیں میک اپ پر۔“
نباء نے اس کی طرف جھک کر رازداری سے بتایا۔
”نہ کرو یا ر!“ ایک نے ماتھے سے نادیدہ پسینہ پونچھا۔ ”میں تو بہت سستا تیار ہوا ہوں۔“
”تم.....“ نباء نے غور سے اسے دیکھا، بلیک سوٹ میں وہ بے حد شان دار لگ رہا تھا۔ ”بہت ہینڈم لگ رہے ہو۔“

”واقعی۔“ وہ ایک دم خوش ہو گیا۔ سنہری شہزادی کو وہ پسند آ گیا تھا۔ اف یہ بے وفادل۔
”دیکھ نہیں رہے ہو، سب لوگ اتنی تعریف کر رہے ہیں۔ چاند سورج کی جوڑی کہہ رہے ہیں ہمیں۔“

”دیکھ ہی تو رہا ہوں میں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر گم ہوئے لہجے میں بولا تھا۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ والدین ہمارے بارے میں ہمیشہ اچھا ہی فیصلہ کرتے ہیں۔“

”مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آرہیں۔“
نباء نے منہ بنا کر اپنا ٹیکہ درست کیا۔ وہ اس وقت ایچ پر موجود تھے۔ ابراہیم صاحب اور طاہرہ مہمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ دعا پنک شرارے میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی اور احمد اپنے کیمرے سے تصویریں لے رہا تھا۔

”بعد میں سمجھاؤں گا۔“ ایک نے ٹیبل پر رکھے گلدستے میں سے ایک گلاب کا پھول نکالا۔

”میں یہ تمہارے بالوں میں لگا دوں۔“
”پہلے ہی بہت سے لگے ہوئے ہیں۔“ نباء

نے اعتراض کیا۔

”تم بس چپ کرو۔“ اس نے نباء کے بالوں میں پھول لگا دیا۔ احمد نے اس خوب صورت لمحے کو اپنے کیمرے میں مقید کر لیا۔ ابراہیم صاحب اور طاہرہ نے آ کر دونوں کو پیار کیا۔ پھر طاہرہ نے انگلیوں کی ایک کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ایک نے نباء کو انگلیوں پہنائی۔ اب افسوس ہو رہا تھا کاش وہ اس کے لیے اپنی طرف سے بھی کچھ لے لیتا۔ ہائے یہ بد تمیز دل۔
”واؤ کتنی زبردست رنگ ہے۔“ نباء ساختہ بولی تھی۔

”منگنی ٹوٹنے کے بعد میں یہ واپس نہیں کروں گی۔ یاد رکھنا یہ بات۔“ ساتھ ہی ایک کو وارن کیا۔
”خوشی کے موقع پر بد شکونی کی بات نہیں کرتے بیٹا۔“ طاہرہ نے پیار سے اس کا ماتھا چوما۔ وہ ان کے ارادوں سے باخبر تھیں۔ پھر انہوں نے اسے سونے کے دو خوب صورت سے کنگن پہنائے۔
”یہ بھی مت واپس کرنا۔“ ایک نے سرگوشی کی۔ وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”اب آپ لوگوں کا فوٹو شوٹ ہو جائے۔“ احمد اپنا کیمرہ سنبھالے کھڑا تھا۔
”میرے اکیلے کی پکچرز لو۔“ نباء نے اسے ہدایت دی۔

”کیوں؟“ ایک نے اعتراض کیا۔ ”میری بھی منگنی ہے۔“

”تم اپنا الگ فوٹو شوٹ کرواؤ۔“ نباء نے بے مروتی دکھائی۔

”میں سنسنی ہوں تمہارا۔“ ایک نے جتایا۔
”لیکن عارضی۔“ نباء نے بھی جواباً جتلیا۔
”اس طرح تو یہ منگنی بھی عارضی ہے۔ تم کہ اتنی زیادہ پکچرز بنوا رہی ہو۔“

”میں اتنی زبردست تیار ہوئی ہوں۔ پکچرز کیمروں کی تو بعد میں یاد کیسے رہے گا کہ میں کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔“ نباء کی اپنی ہی منطق تھی۔
”یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمہاری منگنی بس

سے ہوئی تھی۔“ ایک کو غصہ آ گیا۔ اتنا غصہ کہ اس نے بناء کو ایک بھی تصویر اکیلے نہیں بنوانے دی۔ ہر تصویر میں وہ اس کے ساتھ موجود تھا، آہ یہ ڈھیٹ اور بے شرم دل۔

☆☆☆

”بالآخر منگنی کا قصہ بھی ختم ہوا۔“ بناء نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا باہر کھڑی شام نے بھی پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

”ایک بات تو ہم دونوں میں کا من ہے۔ ہم دونوں ہی بزدل ہیں یا پھر اپنے پیاروں کا دل دکھانے کی ہمت نہیں رکھتے۔“ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ شام اداس تھی اور اسے اپنی اداسی میں شریک کرنے پر بضد تھی۔

”بناء تم یونیورسٹی میں ایڈمیشن کیوں نہیں لیتیں۔“ طاہرہ نے اس کی پڑمردگی کو محسوس کر کے مشورہ دیا۔

”صحیح کہہ رہی ہیں خالہ!“ بات اس کے دل کو لگی تھی۔

”ورنہ یہ بوریت تو مجھے مار ہی ڈالے گی۔“ اگلے چند دنوں میں اس کا ایڈمیشن ہو گیا۔ پڑھنا تو اس نے خیر کیا تھا لیکن نئے نئے کپڑے جوتے، رنگ برنگی دوستیاں اور کھٹی میٹھی مخالفتیں۔ مصروف وہ بے شک ہو گئی تھی۔

”بناء آئی! آپ کے کوئی یونیورسٹی فیلو آئے ہیں ریمز۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔“ وہ خالہ کے ساتھ کچن میں تھی جب احمد نے آکر اطلاع دی۔ باہر سے گزرتے ایک کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف جاتی بناء کے پیچھے ہولیا۔

ریمز ایک مناسب شکل و صورت کا مالک لڑکا تھا جو ذرا زور سا صوفے پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

”ریمز! کیسے آنا ہوا بھئی۔“ بناء اسے دیکھ کر چمکی۔ ایک نے ماتھے پر بل ڈال کر اس کی چہکار کو نوٹس کیا۔ ریمز کھڑا ہو گیا۔

”میں یہ تمہارے نوٹس دینے آیا تھا۔“ (ہونہہ..... بہانہ اچھا ڈھونڈا ہے)۔

”تو کل یونیورسٹی میں دے دیتے۔ خواہ مخواہ اتنی زحمت کی تم نے۔“ بناء نے اس سے نوٹس لیتے ہوئے کہا۔

(زحمت کیسی..... سبز کے بل آیا ہوگا)۔

”میں نے سوچا تم نے پڑھنا ہوگا۔“ وہ تھوڑا سا جھینپ کر مسکرایا۔

(”پڑھنا؟“ اس صدی کا سب سے بڑا مذاق)۔

”سونائس آف یو۔“ بناء مسکرائی۔

(سونائس آف یو؟ تمہیں تو میں چھوڑوں گا نہیں۔ کسی اور کی منگیت پر ڈورے ڈالنے والے گھٹیا انسان)۔

ایک نے خیالوں ہی خیالوں میں ریمز کے منہ پر دوپٹن مکر سید کیے اور پھر بناء کی طرف مڑا۔

”تمہیں مام بلا رہی ہیں۔“

”ہیں؟ اسے یہاں کھڑے کھڑے کیسے الہام ہو گیا۔“ بناء نے سوچا ضرور لیکن کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

”تم..... ٹھنڈا لوگے یا گرم؟“ ایک نے اسے گھورتے ہوئے چبا چبا کر کہا۔ انداز ایسا تھا جیسے یہیں کھڑے کھڑے مار کھاؤ گے یا الٹا لٹکا کر ٹھکانی کروں۔

”کک..... کچھ نہیں۔ میں چلتا ہوں۔“ ریمز نے کھسکنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

☆☆☆

ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ بناء لان میں نصب جھولے پر بیٹھی ہولے ہولے جھولا جھول رہی تھی۔ اس کی نظریں آسمان پر جمع ہوتے بادلوں کے تعاقب میں تھیں لیکن سوچ ایک کے گرد گھوم رہی تھی۔ وہ اب پہلے جیسا لا پرواہ اور غصیلا ایک نہیں رہا تھا۔ اب وہ اسے ڈانٹتا بھی تھا تو لہجے میں اپنائیت ہوتی تھی۔ وہ اس کے معاملے میں پوزیو ہو گیا تھا۔ اس پر اپنا حق جتانے لگا تھا اس نے اظہار محبت نہیں کیا تھا لیکن انداز محبت ضرور دکھا رہا تھا۔

”کیا وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے؟“ بناء نے خود

سے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں، مجھے پکا یقین ہے۔“ دل نے شور
 مچانا شروع کر دیا۔

”اور کیا میں؟“ اس نے جھجک کر اگلا سوال کیا۔
 ”میں بھی..... میں بھی۔“ دل مچلاتھا۔

نباء کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔ وہ خود کو اچھا خاصا
 مضبوط سمجھتی تھی۔ اپنے دل کے اس قدر جلد ایک پر
 لٹو ہو جانے پر جی بھر کر بد مزہ ہوئی۔

”اکڑ دیکھو ذرا اس کی، کہہ نہیں سکتا تھا کہ مجھ
 سے محبت کرنے لگا ہے اور پھر میں کیوں مانوں اس
 کی بات؟ میری اپنی بھی کوئی مرضی ہے۔“ اس نے
 نخرہ دکھایا۔

”چھوڑو بھی اب بے کار کی ضد۔“ دل کا اپنا
 معاملہ تھا سوا سے منانے لگا۔

”دیکھو ناں، وہ کتنا ہینڈ سم ہے اور جب خیال
 رکھتا ہے تو مزید اچھا لگتا ہے۔“

”چپ کرو۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہوا
 نے آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تیز گرد آلود
 آندھی۔ آسمان کالے سیاہ بادلوں سے اٹ گیا تھا۔
 بیرونی گیٹ کھلا ہوا تھا، یقیناً احمد باہر نکلا تھا۔

”یہ احمد بھی کس قدر لا پرواہ ہے۔“ وہ گیٹ بند
 کرنے آگے بڑھی، اسی وقت کھلے گیٹ سے کوئی
 اندر داخل ہوا تھا۔ پیچھے ایک لڑکا دو سفری سوٹ کیس
 گھسیٹا چلا آ رہا تھا۔ گورا چٹا سا، دور سے فارز لگتا تھا،
 ایک ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کرتی آنکھوں کو گرد سے
 بچاتی وہ بغور آنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔

پتھر پلی روش پر چلتے ہوئے گرے سوٹ میں
 ملبوس اجنبی کے قدم بو بھل تھے یوں جیسے وہ اکیلا نہیں
 تھا اس کے ساتھ گزری مسافت کے بہت سارے
 بوجھ تھے۔

کسی خزانے کی مانند چھپا کر رکھی گئی یادوں
 کے بے شمار پل تھے۔ بھاری قدم اس کے پاس آ کر
 رک گئے۔ نباء نے ان کی شکل دیکھی، وہ صورت
 اجنبی ہو سکتی تھی لیکن وہ رشتہ دنیا کی کسی زبان میں بھی

اجنبی نہیں کہلایا جاسکتا تھا۔ گیلی آنکھیں، لرزتے
 لب، ان کا کانپتا ہاتھ اس کے سر پر ٹکا تھا۔ نباء کی
 آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بادل زور سے گرجا
 تھا، آسمان نے پانی سے بھرا تھاں نیچے الٹ دیا،
 آنسو اور پانی رل مل گئے۔

”اندر آ جائیں۔“ اس نے کہا اور پلٹ کر اندر
 کی طرف بڑھ گئی۔ کریم احمد اس کے پیچھے تھے سوٹ
 کیس سنبھالتا فارز لڑکا اور گیٹ بند کرتا احمد بھی اندر
 کی طرف بھاگا تھا۔

☆☆☆

ابراہیم صاحب بے حد خوش تھے۔ ان کا ماں جایا
 ایک عرصے کے بعد لوٹ آیا تھا۔ یہ بہن بھائیوں کا
 رشتہ بھی ہوتا ہے۔ لاکھ ایک دوسرے سے دور ہوں ان
 کے دل آپس میں جڑے ہی رہتے ہیں۔ ہزار ناراضی
 کے باوجود دل ان کی خیر ہی مانگتا ہے۔ وہی بچپن والا
 رویہ کہ میں خود چاہے مار لوں لیکن کوئی دوسرا ہاتھ لگا کر تو
 دیکھے ساری عمر قائم رہتا ہے۔

آج ڈائننگ ٹیبل کریم احمد کی پسندیدہ ڈشز
 سے سجا ہوا تھا۔ اماں ابا کی یادیں، بچپن کی شرارتیں،
 پردیس کی مجبوریوں اور مجبوریوں کے قصے بے شمار
 باتیں تھیں کرنے والی۔ کھانے کے بعد محفل لاؤنج
 مین جمی تھی سب ہی وہاں موجود تھے۔ کریم احمد۔
 نباء کو اپنے بٹھا رکھا تھا۔

ابراہیم صاحب سے باتیں کرتے ہوئے وہ
 بار بار نباء کو دیکھتے تھے اور ان کے دل کا بوجھ کچھ اور
 بڑھ جاتا تھا۔ ان کے ساتھ آنے والا فارز نما لڑکا
 درحقیقت ان کی دوسری بیوی یتا شا کا بھتیجا سفیان
 تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سبز تھیں لیکن ان انگریز
 آنکھوں سے وہ نباء کو جس انداز سے تاڑ رہا تھا وہ
 خالصتاً پاکستانی تھا۔ ایک جو اس کی نظر بازی پر نظر
 رکھے ہوئے تھا دل ہی دل میں تلملارہا تھا۔ بالآخر
 اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”دعا اور احمد تم لوگوں نے صبح اسکول جانا ہے
 اس لیے اب جا کے سو جاؤ اور نباء! تم نے بھی تو

یونیورسٹی جانا ہے۔“ اس نے نظروں سے نباء کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”پاپا میں جاؤں۔“ نباء نے کریم احمد سے اجازت طلب کی۔ وہ ایک لمحہ اسے دیکھتے رہے پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا معصوم چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”جاؤ بیٹا! کل ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔“ سفیان کے لیے اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کی محفل رات گئے تک جی رہی۔

☆☆☆

”خوش ہو۔“ نباء گلاب کے پھولوں کو چھو کر ان کی لطافت اور خوب صورتی کو محسوس کر رہی تھی۔ جب ایک چپکے سے اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے ایمان داری سے جواب دیا۔

”تم چاچو کو ہمیشہ مس کرتی تھیں؟“ وہ چونکی۔ ایک اتالا پروا اور بے خبر ہرگز نہیں تھا جتنا وہ جھجکتی تھی۔

”میں نے تمہیں اکثر فیس بک پر ان کی تصویریں دیکھتے دیکھا ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”لیکن ان کی زندگی میں میری جگہ کبھی بھی نہیں رہی۔“ نباء کا لہجہ اداس تھا۔

”تمہیں کسی کی زندگی میں زبردستی گھسنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ ایک نے شرارت سے کہا۔

”ہمیشہ سے تم میرے ماں باپ پر قابض رہی ہو اور اب تم نے ان کا بیٹا بھی پٹا لیا ہے۔“

”ایک۔“ وہ چلائی اور بے اختیار اس کے کندھے پر مکا جڑ دیا پھر فوراً ہی اپنے بے ساختہ فعل پر جھینپ گئی۔

”سوری۔“ لیکن وہ بھی ایک تھا۔ آسانی سے چھوڑ دینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بھی وہ ہنستے ہوئے اپنا کندھا مل رہا تھا۔

”تم نے شادی سے پہلے ہی میرے ساتھ مار

پیٹ شروع کر دی ہے۔ کم از کم شادی تک تو صبر کر لیتیں۔“

”ایک! تم بہت بے شرم اور گھٹیا ہو۔“ ساری شرمندگی بھول کر نباء نے دانت پیسے تھے۔

”پلیز پلیز، مجھ سے دور رہو۔ تمہارا ہاتھ بہت بھاری ہے۔“ وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا۔

”بدتمیز انسان۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا سمجھے گا۔“ نباء نے غصے سے کہا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ٹیرس پر کھڑا سفیان دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ نباء کی نظروں کے تعاقب میں ایک نے بھی اسے دیکھ لیا۔

”بات سنو۔“ وہ ساری شرارت بھول کر اس کے پاس آیا۔

”اس بندے سے بچ کر رہنا۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔“

”تمہیں اپنے علاوہ سب کی نیت ہی خراب لگتی ہے۔“ نباء نے جل کر کہا۔

”ایگزیکٹو۔“ وہ کھل کر ہنسا تھا۔

☆☆☆

”بھائی جان، بھابھی! میں آپ دونوں سے بے حد شرمندہ ہوں۔“ کریم احمد آج اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے بیٹھے تھے۔ ”میں نے ساری زندگی خود غرضی میں گزار دی۔ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔“

”چھوڑو، جو بیت گیا سو بیت گیا۔ گزرے وقت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ ابراہیم صاحب نے کہا۔

”میں آپ لوگوں کا احسان کبھی نہیں اتار سکتا۔ جس طرح آپ نے میری بیٹی کو سنبھالا۔ ذمہ داری میری تھی لیکن نبھائی آپ نے۔“ کریم احمد نے شرمندگی سے کہا۔

”انسان اپنی ذمہ داری بھول سکتا ہے لیکن اللہ جسے پیدا کرتا ہے پھر اسے سنبھالتا بھی خود ہی ہے۔

ہم نے کوئی احسان نہیں کیا۔ تم پر نہ نباء پر۔ ہم نے جو کچھ کیا اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا جو اللہ نے

ہمارے دلوں میں نباء کے لیے پیدا کر دی تھی۔“
ابراہیم کا لہجہ تسلی آمیز تھا۔

”پچھلے دنوں مجھے ہارٹ کا کچھ پرابلم ہوا تو کچھ دن ہسپتال رہنا پڑا۔ وہ چند دن بھی عجیب دن تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی اچانک تھم گئی ہو یا پھر میں بھاگتے بھاگتے رک گیا تھا۔ برسوں بعد میری اپنے آپ سے ملاقات ہوئی اور میں اپنی شکل دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں وہ نہیں تھا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ مجھے سائرہ بہت یاد آئی، اس سے جدا ہوتے ہی میں خود سے بھی جدا ہو گیا تھا۔

میں نے زندگی نہیں گزاری۔ یہ وقت تھا جو مجھے روندتا چلا گیا تھا لیکن انسان جب اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش ہوتا ہے ناں تو پھر کوئی بہانہ کوئی تاویل کام نہیں آتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں مجرم ہوں اپنی بیٹی کا۔ میں گناہ گار ہوں سائرہ کا۔ بھائی جان! میں روز قیامت اس کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے اپنی بیٹی کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ باپ کے ہوتے ہوئے اسے یتیم کر دیا۔“ ان کی آواز رندھ گئی۔ ابراہیم صاحب انہیں ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ طاہرہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

کریم احمد کا چہرہ مضحک تھا۔ ایک بیمار پچھتاؤں کے مارے شخص کا چہرہ۔ ان کی عمومی صحت بھی اچھی نہیں تھی۔

انہیں سائرہ سے بے حد محبت تھی۔ جتنی آسانی سے یہ محبت حاصل ہوئی اتنی ہی جلدی چھن بھی گئی۔ انہوں نے یہ صدمہ برداشت کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر حالات سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ آنکھیں بند کر کے بھاگتے ہوئے وہ یہ قطعاً بھول گئے تھے کہ اپنے ہی وجود کا اہم حصہ وہ پیچھے چھوڑے جا رہے تھے۔ اس وقت تو بس انہیں نکلنا تھا اس گھر سے اس شہر سے اور اس ملک سے جہاں انہوں نے اپنی محبوب بیوی کے ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے۔

”اب میں تلافی کرنا چاہتا ہوں۔“ کریم احمد کہہ رہے تھے۔

”میں نباء کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں ہمیشہ کے

لیے۔ سفیان بہت اچھا لڑکا ہے۔ سڈنی میں اس کا بزنس اچھا خاصا سیٹ ہے، اگر نباء کی اس کے ساتھ شادی ہو جائے تو وہ بھی وہیں سیٹل ہو جائے گی۔“ لیکن کریم! ہم نباء کی منگنی کر چکے ہیں ایک کے ساتھ۔

اور ہم نے یہ رشتہ طے کرنے سے پہلے تم سے پوچھا بھی تھا۔“

”بھابھی! اس وقت حالات مختلف تھے لیکن جب سے مجھے دل کی تکلیف ہوئی ہے، میرا دل ڈر گیا ہے۔ پتا نہیں میرے پاس کتنا وقت ہے، پلیز مجھے اپنے گناہ کے ازالے کا موقع دے دیں۔ یہ منگنی گھر کی بات ہے، توڑی بھی جاسکتی ہے۔ اگر ایک میرے ساتھ سڈنی آ کے سیٹل ہو سکتا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں تھا لیکن میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ آپ کی اولاد بھی چھین لوں۔ میرے دل پر بہت بوجھ ہے بھابھی! میں درخواست کرتا ہوں، مجھے نباء کو اپنے ساتھ لے جانے دیجیے۔“ وہ آب دیدہ ہو گئے۔

”ٹھیک ہے۔“ ابراہیم صاحب نے گہری سانس لی۔ ”اس بات کا فیصلہ نباء پر چھوڑ دیتے ہیں، اگر وہ جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ طاہرہ نے بے حد خفا ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

ابراہیم صاحب آفس چلے گئے تھے۔ کریم احمد قبرستان گئے ہوئے تھے، سفیان گھومنے پھرنے نکلا ہوا تھا۔ احمد اور دعائے آج اسکول سے چھٹی کی تھی۔ طاہرہ حسب معمول کچن میں مصروف تھیں اور ایک..... اس کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ کانوں سے دھواں نکل رہا تھا، آنکھوں سے بھاپ اور منہ سے چنگاریاں وہ صحیح معنوں میں آگ بگولا ہو رہا تھا۔

”اب تو یہ ثابت ہو گیا ناں کہ ڈیڈ کو مجھ سے کوئی خاص دشمنی ہے۔ جب میں نباء سے منگنی کے لیے تیار نہیں تھا تب انہوں نے زبردستی کی اور اب جب میں راضی ہو گیا ہوں تو وہ زبردستی یہ رشتہ ختم کر رہے ہیں۔“ وہ کچن میں طاہرہ کے سر پر سوار اپنی

بھڑاس نکال رہا تھا۔
 ”کیا کریں۔ کریم اس کا باپ ہے، حق رکھتا ہے اس پر۔“ طاہرہ نے بے چارگی سے کہا اور رخ پھیر کر آنکھ کا کونا صاف کیا۔ آج ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، بار بار جی بھرتا تھا۔
 ”سالوں تک تو انہیں یہ حق یاد آیا نہیں، آج اچانک یاد آ گیا۔ آگئے ہیں میرا رشتہ تڑوانے۔ اس منہوس سفیان کے ساتھ اس کی شادی کریں گے۔ میں بتا رہا ہوں مام! اگر ایسا ہوا تو میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔“ اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔
 ”اب نباء کے ہاتھ میں ہے ساری بات۔ دیکھتے ہیں وہ کیا فیصلہ کرتی ہے۔“ طاہرہ نے آہ بھر کر کہا۔
 ”اس نباء کو تو میں دیکھتا ہوں۔“ وہ تن فن کرتا کچن سے نکلا تھا۔

نباء ٹیرس پر کھڑی تھی، اس کی نظریں دور درخت پر انکی پتنگ پر جمی تھیں۔ ایک عرصے سے بے نیازی اور لاپرواہی کا جو خول اس نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا، کریم احمد کے آنے سے وہ تڑخ گیا تھا۔
 یہ ٹھیک ہے ابراہیم صاحب اور طاہرہ نے اسے بے پناہ محبت دی تھی بلکہ طاہرہ تو اس کی خاطر اپنے بچوں کو بھی پیچھے کر دیتی تھیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس محبت کا بوجھ اپنے دل پر محسوس کرتی تھی۔
 دنیا میں صرف اپنے ماں باپ کی محبت ایسی ہوتی ہے جو انسان حق کی طرح وصول کرتا ہے جس کا کوئی احسان نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جو بھی محبت ہو اس میں احسان کا رنگ شامل ہو جاتا ہے۔

کتنی ہی باتیں ایسی تھیں جن پر وہ اپنا دل مار لیا کرتی کہ خالہ اور تایا ابو کو برا نہ لگے۔ دعا اور احمد کو حد سے زیادہ پیار کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا کہ کہیں وہ بھی ایک کی طرح اس سے چڑنے نہ لگ جائیں۔ وہ ببا نگ دہل کہا کرتی تھی کہ مجھے اپنے باپ کی کوئی پروا نہیں ہے لیکن باپ کی محبت تو بیٹی کے ضمیر میں ہوتی ہے اس سے انکار کیسے ممکن تھا۔ اس کا دل ہمیشہ ان کا منتظر رہا تھا، وہ اس کے پاس

آئیں اس سے پیار کریں۔ اسے سینے سے لگائیں، وہ ان سے فرمائشیں کرے، لاڈ اٹھوائے۔

یہ وہ خواہشات تھیں جنہیں اس نے اپنے دل کے اندرونی خانیے میں دبا کر رکھا تھا۔ بظاہر وہ مضبوط تھی، لا پرواہی۔ نٹ کھٹ اور بے نیاز بھی لیکن اتنے برسوں بعد باپ کو سامنے دیکھ کر اسے اپنی ساری محرومیاں پھر سے یاد آنے لگی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں ان سے ناراض تھی، بے حد خفا لیکن وہ مان جانا چاہتی تھی۔

”آئی!“ یہ دعا اور احمد تھے۔ دائیں طرف دعا اور بائیں طرف احمد۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔
 ”کیا آپ چلی جائیں گی؟“ دعا کے لہجے میں خدشے بول رہے تھے۔

”نباء۔“ ایک حسب عادت پکارتا ہوا آیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ نباء کی آنکھوں میں، گالوں پر آنسو تھے۔
 ”کیا وہ جانے کا فیصلہ کر رہی تھی۔“ ایک کے دل پر مکا سا پڑا تھا۔



رات کے کھانے کے بعد وہ داخلی دروازے کے باہر سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ سیڑھیوں کے دامن میں دونوں طرف لان پھیلا ہوا تھا۔ بیچوں بیچ پتھریلی روش بیرونی گیٹ تک جاتی تھی۔ لان کی لائٹس آن تھیں پھر بھی دور درختوں کے بیچ میں اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں جگنو جھکتے تھے۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا جیسے دلہن کا آئینہ جس پر ڈھیر سارے نگینے جڑے ہوں۔ ہوا خوش گوار تھی اور اس میں پھولوں کی مہک شامل تھی۔ نباء نے گہرا سانس لے کر اس مہک کو اپنے اندر اتارا۔
 سنہری بالوں کو ڈھیلی سی پونی میں باندھے وہ اداس لگتی تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا گورا رنگ اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ کوئی اس کے پاس آ کر بیٹھا تھا، اس نے مڑ کر دیکھا، یہ کریم احمد تھے۔

”تم مجھ سے ناراض ہو؟“

وہ خاموش رہی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ اس قدر ناراض کہ تم نے اپنی ناراضی بھی مجھ سے چھپالی ہے۔ نہ کوئی شکوہ کیا، نہ گلہ۔ کیوں بیٹا؟“ ان کے لہجے میں دکھ تھا۔ اس کی خاموشی ان کے احساسِ جرم کو بڑھا رہی تھی۔

”شکوہ کرنے کا کیا فائدہ پایا! آپ کے پاس اپنی وجوہات ہوں گی اور ویسے بھی میں تو آپ کے لیے کبھی بھی اہم نہیں رہی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے گلہ نکل گیا۔

”اللہ کسی کو اپنی رحمت سے نوازے اور وہ اس سے منہ موڑ لے تو اس سے زیادہ بدنصیب انسان کون ہوگا۔ میں بھی ایسا ہی بدنصیب ہوں۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”لیکن اب میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اگر سفیان مناسب لگا تو اس کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں گا ورنہ جہاں بھی تم نے چاہا لیکن اب میں مزید تمہیں خود سے دور نہیں رکھوں گا۔“

یہی وہ بات تھی جس کا ایک عرصے تک اس نے خواب دیکھا تھا کہ اس کے پایا آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور آج جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو وہ خوشی سے اچھل نہیں پڑی تھی بلکہ اس کے ذہن میں وہ سب چہرے گھوم رہے تھے جو برسوں۔ سرد و گرم میں اس کے ساتھ رہے تھے۔ وہ روئی تھی تو اس کے آنسو پونچھے تھے۔ وہ ہنسی تھی تو اس کے ساتھ ہنسے تھے، وہ ان کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ وہ اتنی خود غرض تو کبھی بھی نہیں تھی۔

”میں تمہاری ساری فرمائش پوری کروں گا۔ تم اگر پڑھنا چاہتی ہو تو وہاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لینا، ورنہ میرے کاروبار میں ہاتھ بٹانا اور اگر کچھ نہ کرنا چاہو تو بے شک نہ کرنا۔ صرف گھومنا پھرنا، انجوائے کرنا۔ میں اپنی بیٹی کو وہ ساری خوشیاں دوں گا جو اب تک نہ دے سکا۔ میں تمہاری ساری شکایتیں دور کر دوں گا۔“ کریم احمد کے لہجے میں

محبت تھی اور اپنی غلطیوں کی تلافی کرنے کا جوش۔

”اپنی خوشی کی خاطر ان لوگوں کو چھوڑ دینا جو آپ سے محبت کرتے ہوں یا جنہیں آپ کی ضرورت ہو۔ یہ تو وہی غلطی ہے ناں پایا جو آپ نے کی تھی۔“ نباء نے دھیرے سے کہا۔

”میں اس غلطی کو دہرائی نہیں چاہتی۔“

”تم بالکل اپنی ماں پر گئی ہو۔“ کریم احمد افسردگی سے مسکرائے اور ہاتھ میں پکڑی البم کھولی۔ ”آؤ تمہیں اس کی تصویریں دکھاؤں۔“

البم کیا تھی، یادوں کا ایک خزانہ تھا۔ محبت کی ایک مختصر کہانی کا احوال۔ ان ناپائیدار خوشیوں کا قصہ جو ہاتھوں سے پھسل گئی تھیں لیکن جن کے رنگ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے تھے۔

وہ کچھ دیر کے لیے اپنے ماحول سے کٹ کر اس دنیا میں پہنچ گئی جب اس کے ماں باپ ایک بھرپور محبت کو جی رہے تھے۔ اگر سائرہ نہ جائیں تو آج سب کچھ کس قدر مختلف اور مکمل ہوتا۔ صرف کسی ایک کے نہ ہونے سے کس قدر فرق پڑ جاتا ہے۔ آشیانہ بنانے والے ہاتھ نہ رہیں تو آشیانے کا انجام تو بکھرنای ہی تھا ناں۔ اس نے گہری سانس لی۔

”میں یہ البم رکھ لوں؟“

”شیور۔“ کریم احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔

البم کو کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھالتی نباء بھی کھڑی ہو گئی۔

”آئی ایم سوری پایا۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا۔“ انہوں نے اس کا سر

تھپتھپایا۔ نباء نے ان کی طرف دیکھا۔ کیا نہیں تھا ان

کے چہرے پر، تھکن، ملال، پچھتاوا۔ وہ ایک بارے

ہوئے شخص کا چہرہ تھا، اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”پاپا پلیز اپنے دل سے ہر قسم کا گلٹ نکال

دیجیے۔ میں یہاں۔ بہت خوش ہوں۔ میری زندگی

میں کبھی کوئی محرومی نہیں رہی۔“ وہ انہیں بھرپور

طریقے سے تسلی دیتے ہوئے ان کے دل کو سکون

پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کریم احمد نے بے

اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ کتنی پیاری ہوتی ہیں یہ بیٹیاں بھی۔ اپنی ذات کو پیچھے کر کے اپنے ماں باپ کا مان رکھنے والی۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
 ”آپ اندر نہیں آئیں گے۔“ اندر جانے سے پہلے اس نے پوچھا۔

”تھوڑی دیر تازہ ہوا لے لوں پھر آتا ہوں۔“ وہ لان کی طرف بڑھ گئے۔

نباء داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو کسی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک دم اسے ایک طرف کھینچ لیا۔ یہ ایک تھا، وہ اس کے سینے سے ٹکراتے ٹکراتے چلی گئی۔
 ”کیا بد تمیزی ہے۔“ اس نے بگڑ کر اپنا بازو

چھڑایا۔
 ”چاچو سے کیا بات ہوئی تمہاری۔“ یقیناً وہ کافی دیر سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

”تم سے مطلب۔“ نباء نے اسے گھورا۔
 ”میری بات غور سے سنو۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی، سمجھیں۔“ ایک نے اسے ڈپٹا۔
 ”کیوں زبردستی ہے کوئی؟“
 ”نہیں۔“ ایک کا لہجہ دھیمہ ہو گیا۔

”ریکونٹ ہے۔“
 ”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے میرے جانے پر۔“
 ”کیا تم نہیں جانتیں۔“
 ”کیا؟“

”کہ میں تمہیں کس قدر چاہنے لگا ہوں۔“
 ”تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔“ نباء نے نظریں

چرا کر کہا۔
 ”تمہیں اب تک خود ہی سمجھ جانا چاہیے تھا لیکن ہونا تم کوڑھ مغز۔“ ایک کے منہ سے پھسل گیا حسب صورت۔

”اب تو میں ضرور جاؤں گی۔“ وہ ناراض ہو کر چلی۔

”نہیں پلیز۔“ ایک نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور پھر منت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں تم سے

بے حد محبت کرنے لگا ہوں نباء! پلیز مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

اتنے واضح اظہار پر نباء کی نظریں جھک گئیں۔ چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ طاہرہ کمرے سے باہر نکلیں تو وہ ایک سے ہاتھ چھڑا کر ان کی طرف بڑھ گئی۔
 ”خالہ! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی۔“
 ان کے گلے سے لگ کر نباء نے سرگوشی کی۔

”میری بچی۔“ طاہرہ نے اس کے رخسار چومے اور رونا شروع کر دیا جب سے کریم احمد نے اسے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی۔ ان کی جان جیسے سولی پر لٹک گئی تھی، کہیں نباء ان کے ساتھ چلی نہ جائے۔ اگر وہ چلی گئی تو اس کے بغیر وہ کیسے رہیں گی۔

دعا اور احمد بھی آگئے تھے۔ دعا نباء کے کندھے سے لٹکی ہوئی تھی اور احمد کے دانت ہی اندر نہیں جا رہے تھے۔

”مام خوشی کی بات پر آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ احمد نے طاہرہ کے آنسو پوچھے۔

”بیٹا! یہ خوشی کے ہی آنسو ہیں۔“ انہوں نے مسکرا کر نظروں ہی نظروں میں نباء کی بلائیں لیں۔

”مام! اب آپ جلدی سے ہماری شادی کر دیں۔“ ایک نے طاہرہ سے کہا اور پھر نباء کی طرف مڑا۔

”اور نباء تمہیں میں ہنی مون پر آسٹریلیا لے کر جاؤں گا، آئی پراس یو۔“

نباء کے چہرے پر شرمیلیں مسکراہٹ تھیں۔ وہ محبت کرنے والوں کے درمیان تھی۔ مطمئن اور مسرور۔ کریم احمد نے اندر داخل ہوتے ہوئے یہ منظر دیکھا تو مسکرا دیئے۔ ان کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔



سٹر اسٹور

ہانیہ کونجانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ دنیا کے سارے لڑکے نکلتے اور بے کار ہیں۔ اس کے یونیورسٹی کے کلاس فیلوز ایک نمبر کے لوفر، لفنگے اور نالائق ہیں۔ خاص کر وہ لڑکے جو اس سے سلام دعا کرنے کی ہمت کرتے تھے، وہ تو بہت ہی زیادہ بے ہودہ تھے۔ خاندان کے لڑکوں کو ایک عرصہ ہوا، اس نے ناکارہ، نکمّا، کہنا شروع کر دیا تھا۔

اس کی مامادو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں، اس لیے ہانیہ کی کوئی خالہ بھی نہیں تھی۔ دو ماموں تھے جن کے بیٹے بہت چھوٹے تھے۔ اسکول جاتے تھے۔ ماما بار بار اپنی دلی حسرت کا اظہار کرتی رہتی تھیں کہ کاش ان کی کوئی بڑی بہن یا بڑا بھائی ہوتا جس کے بیٹے کے ساتھ وہ اپنی لاڈلی بیٹی ہانیہ کی شادی کر سکتیں۔ پاپا کے خاندان والوں کو وہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ پاپا کے خاندان میں سب لڑکے شرطیں لگا لگا کر فیل ہوتے تھے۔ جو سب سے زیادہ پڑھا لکھا لڑکا تھا، وہ بی اے فیل تھا۔ باقی سب بی اے تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ سب کے اپنے اپنے بزنس تھے۔ اس لیے انہیں پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

اس کا ماسٹرز ہونے والا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ماما کو اس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ غیروں میں بیٹی دینے کے خیال سے ہی انہیں ہول اٹھتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ کتنا ہی دور پرے کا ہو، لڑکا خاندان کا ہی ہو۔ ایک بار انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر پاپا کے بھائیوں کے بیٹوں کے بارے میں بھی سوچا تھا۔

ان کی سوچ کی لہریں شاید تایا جی کے بڑے بیٹے منیب تک بھی جا پہنچی تھیں۔ وہ جمعہ کو اپنی برائڈ نیو کرو لاکر کی خوشی میں دو پونڈ کا کیک لے کر ماما کے

پاس آیا تھا۔ ماما نے بھی اسے مستقبل کے داماد کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ کیک کو فریج میں رکھوا دیا تھا۔ منیب کو بھیج کر بیکری سے اچھا خاصا سامان منگوایا اور منیب کی خاطر مدارت کی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔ ہونے والی ساس اور مستقبل کا داماد خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہے تھے کہ منیب کہنے لگا۔

”بس چچی! میں تو کہتا ہوں کہ انسان شادی کرے تو اپنی بیوی کو الگ گھر میں رکھے۔ میرا تو پلان ہے۔“

ماما دل ہی دل میں خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔ جھٹانی ویسے بھی بہت تنگ مزاج تھیں۔ کتنا اچھا ہو جو منیب اور ان کی بیٹی الگ گھر میں رہیں۔

”ہاں واقعی، جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔“ منیب تھا تو بارہ جماعتیں پاس لیکن عقل بہت تھی اس میں۔ وہ دل ہی دل میں اس کی سمجھ کی داد دینے لگیں۔

”بات مشکل یا آسانی کی نہیں ہے چچی جان! اب دیکھیں نا، بندے کو یہ تو پتا چلے کہ آنے والی کتنے پانی میں ہے۔ ہمارے گھر میں تین تین کام والیاں آتی ہیں۔ اگر میری بیوی اس گھر میں گئی تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ اسے صفائی ستھرائی، کھانا پکانا آتا ہے یا نہیں۔ پوری پوری خدمت کرواؤں گا اس سے۔ سکون کا سانس نہیں لینے دوں گا اسے۔“

دانت پیستے ہوئے ماما نے غصے کو کنٹرول کیا تھا۔

”جب کام والیاں آتی ہیں تو اس سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بیوی کا فرض بنتا ہے کہ وہ شوہر کے سب کام اپنے ہاتھوں سے کرے۔ گھر کو اپنے ہاتھوں سے جت بنائے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ شادی صرف گھر کے کام کروانے کے لیے کی جاتی ہے۔“ انہوں نے تازہ پیسٹریوں کی پلیٹ اس کے سامنے سے اٹھا کر فہیم کے سامنے کھسکائی۔ اور آنکھ سے اشارہ کیا کہ فریج میں رکھ دو۔

”اچھا مذاق کر لیتی ہیں آپ چچی! بندہ اور کس لیے شادی کرتا ہے۔“

”کسی ملازمہ سے کیوں نہیں شادی کر لیتے تم منیب بیٹا.....“

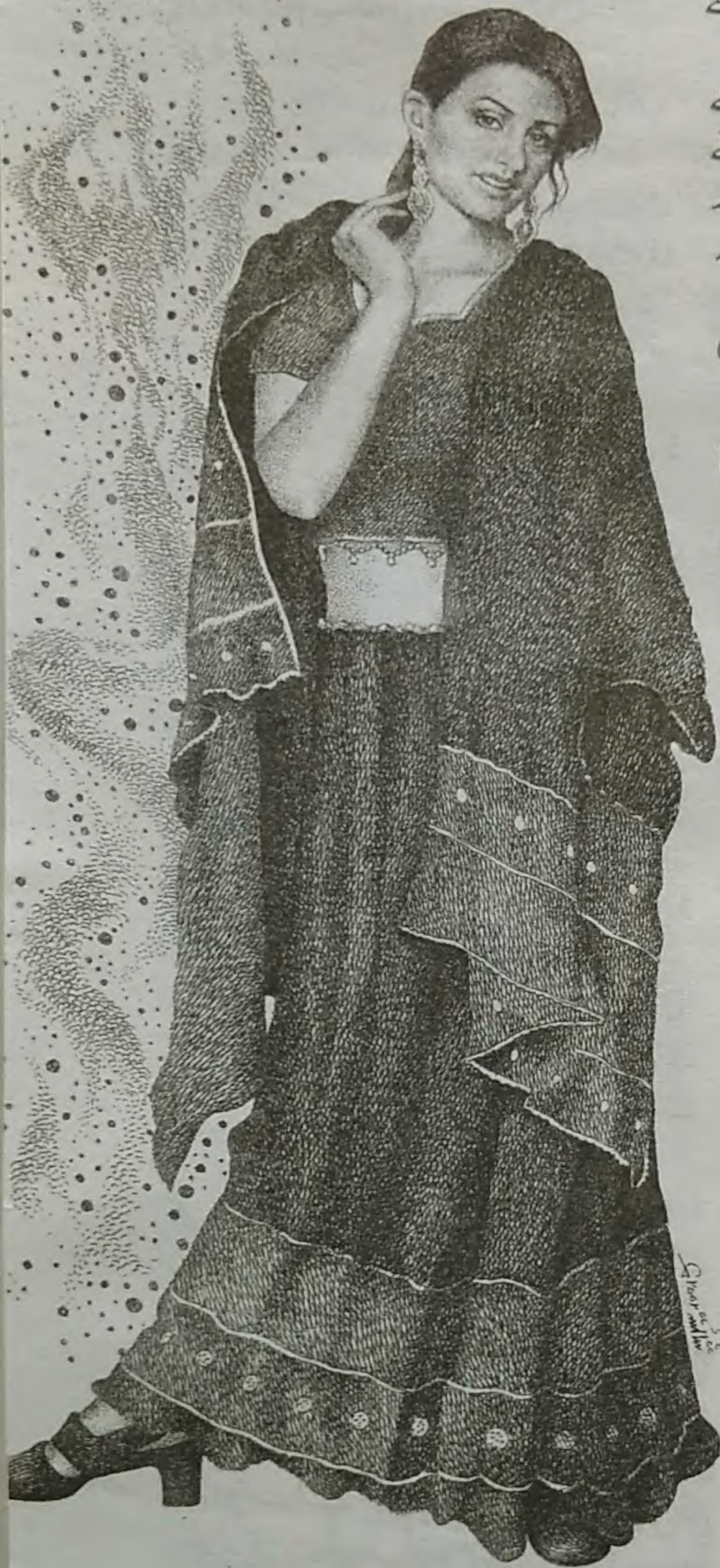
”ملازمہ کو تنخواہ دینی پڑتی ہے۔ جبکہ شادی ایک بار کا خرچہ ہے۔ پھر ساری زندگی چین اور سکون سے کھتی ہے۔“

انہوں نے نمکوبسکٹ کی پلیٹیں جھٹکے سے اس کے سامنے سے سمیٹیں اور پیچ پیچ کر ٹرے میں رکھنے لگیں۔ رات تک ماما کا پارہ ہائی رہا تھا۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہی۔ تھوڑی بہت کہانی فہیم نے اسے آتے ہی سنا دی تھی۔

”جب سے میں یونی گئی ہوں، آپ پر میری شادی کا جنون سوار ہو گیا ہے۔ آپ مجھے سکون سے ماسٹرز تو کر لینے دیں۔“

”تم چڑیل، تمہارا ہونے والا دولہا بھوت۔ یہی بھوت ماما پر سوار ہے۔ ماما کو یہ فکر ستائے جا رہی ہے کہ اسے کوئی اور چڑیل نہ لے اڑے۔“ اس کا چھوٹا بھائی فہیم ہر وقت مذاق کرتا رہتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے گلاس اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ گلاس گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ ماما نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

”میری نیندیں تو اڑا ہی چکی ہو، اب باپ کی کمائی بھی ایسے توڑ پھوڑ کر کے اڑا دو گی۔ تالائق اولاد۔“



لے جاتی۔ وہ کلاس کی لائق لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان چکروں میں پڑ گئی تو سب سے زیادہ نالائق لڑکیوں میں سے ایک ہو جائے گی۔

اگلے دن سیٹ پر دو کارڈ ملے۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”یہ کون بدتمیزی کر رہا ہے میرے ساتھ۔“ کارڈ ہاتھ میں لے کر وہ ساری کلاس سے پوچھنے لگی تھی۔ لیکچرر ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ سب خوش گپیں میں مصروف تھے۔

”تم جیسی سٹریل لڑکی کے ساتھ یہ بدتمیزی جو بھی کر رہا ہے، اپنا ٹائم ویسٹ کر رہا ہے۔ تمہیں تو میں بغیر آلو کا سموسہ نہ دوں، وہ تمہیں دو۔“ کارڈ زبھیج چکا ہے۔ بہت ہی بے وقوف اور فضول انسان ہے۔

ساری کلاس ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی

ساری کلاس ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ غصے اور شرمندگی سے اس کی گردن کی رگیں کھینچ گئی تھیں۔ تنقیدی ہوئی اس آلو کے سموسہ کے سامنے کرکھڑی ہو گئی۔

”تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی کہ لڑکے سے کیسے بات کرتے ہیں۔“

”تمیز تمہیں نہیں ہے مس ہانیہ کہ کلاس سے آتے جاتے سلام دعا بھی کرتے ہیں۔ کیا ہو خود کو، قلو پطرہ ہر وقت تمہارا پارہ ہانی رہتا کلاس کے لڑکوں کو لوفر، لفنگا جھتی ہو۔“

”یہ قلو پطرہ تم نے کسے کہا ہے..... ان کو.....“ دور سے کسی لڑکے نے ہانک لگائی۔ ”انہیں قلو پطرہ کہنے سے پہلے تمہیں اس کاٹ لینی چاہیے تھی۔ بے چاری اصلی والد کیا سوچتی ہوگی۔ مجھے پاکستان کی کس صف سے ملا دیا ہے۔“

کلاس پھر کشت زعفران بن چکی ہنس رہے تھے۔ وہ روکھی ہو گئی۔ سب

”صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم پیدا ہی کیوں ہوئیں ہانیہ۔ شادی، شادی، شادی۔ آپ کہیں تو زہر کھالوں۔“

کھانا چھوڑ کر وہ غصے میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ فہیم کوٹوٹا ہوا گلاس سینیٹا پڑا۔

”آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما۔ آپ ہر وقت شادی شادی کرتی رہتی ہیں۔ ایسا کریں آپ میری شادی کر دیں۔“

”خبردار جو تم نے اپنی شادی کا نام لیا۔ آٹھ دس سال کما کر دو پہلے، پھر شادی کروں گی۔“

اس نے دکھ بھرا سانس بھر کر ڈسٹ بن کا ڈھکن کھول کر شیشوں کی کرچیاں انڈیل دیں۔

”آپی ٹھیک کہتی ہیں آپ پتھر کے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔“

☆☆☆

اگلے دن وہ یونیورسٹی گئی تو اسے اپنی سیٹ پر ایک کارڈ رکھا ملا۔ (وہ روزانہ ایک ہی سیٹ پر بیٹھتی تھی۔ کلاس فیلوز اس کا لحاظ کرتے تھے، اس لیے اس کی سیٹ پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا)۔ جس پر پیلے رنگ کا بڑا سا مسکراتا چہرہ بنا ہوا تھا۔ وہ الٹ پلٹ کر کارڈ کو دیکھنے لگی تھی۔ اس پر کہیں کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔

”اوہو۔ اسمان کی کارڈ..... کس نے دیا ہے بھی! ہمیں بھی بتاؤ ذرا.....“ اس کی کلاس فیلو نے شرارت سے اسے کہنی مار کر پوچھا تو اس نے غصے سے اسے گھور کر دیکھا۔

”بھوت نے.....“ اسے غصہ آ گیا تھا۔ کارڈ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس نے ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ تاکہ سب دیکھ لیں کہ اس کلاس کے کوڑا کرکٹ لڑکوں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آج اسمان بھیجی ہے، کل پھول بھیجے گا، پرسوں پروپوزل بھیج دے گا۔ اس کلاس میں کوئی لڑکا اس لائق نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے گھر چائے پر بلا سکتی۔ اپنا کلاس فیلو کہہ کر کسی سے تعارف کروا سکتی، کج بات اتنی دور تک

”صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم پیدا ہی کیوں ہوئیں ہانیہ۔ شادی، شادی، شادی۔ آپ کہیں تو زہر کھالوں۔“

کھانا چھوڑ کر وہ غصے میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ فہیم کو ٹوٹا ہوا گلاس سمیٹنا پڑا۔

”آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما۔ آپ ہر وقت شادی شادی کرتی رہتی ہیں۔ ایسا کریں آپ میری شادی کر دیں۔“

”خبردار جو تم نے اپنی شادی کا نام لیا۔ آٹھ دس سال کما کر دو پہلے، پھر شادی کروں گی۔“

اس نے دکھ بھرا سانس بھر کر ڈسٹ بن کا ڈھکن کھول کر شیشوں کی کرچیاں انڈیل دیں۔

”آپی ٹھیک کہتی ہیں آپ پتھر کے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔“

☆☆☆

اگلے دن وہ یونیورسٹی گئی تو اسے اپنی سیٹ پر ایک کارڈ رکھا ملا۔ (وہ روزانہ ایک ہی سیٹ پر بیٹھتی تھی۔ کلاس فیلوز اس کا لحاظ کرتے تھے، اس لیے اس کی سیٹ پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا)۔ جس پر پیلے رنگ کا بڑا سا مسکراتا چہرہ بنا ہوا تھا۔ وہ الٹ پلٹ کر کارڈ کو دیکھنے لگی تھی۔ اس پر کہیں کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔

”اوہو۔ اسماعیلی کارڈ..... کس نے دیا ہے بھئی!“

ہمیں بھی بتاؤ ذرا.....“ اس کی کلاس فیلو نے شرارت سے اسے کہنی مار کر پوچھا تو اس نے غصے سے اسے گھور کر دیکھا۔

”بھوت نے.....“ اسے غصہ آ گیا تھا۔ کارڈ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس نے ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ تاکہ سب دیکھ لیں کہ اس کلاس کے کوڑا کرکٹ لڑکوں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آج اسماعیل بھیجی ہے، کل پھول بھیجے گا، پرسوں پروپوزل بھیج دے گا۔ اس کلاس میں کوئی لڑکا اس لائق نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے گھر چائے پر بلا سکتی۔ اپنا کلاس فیلو کہہ کر کسی سے تعارف کروا سکتی، کجابات اتنی دور تک

لے جاتی۔ وہ کلاس کی لائق لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان چکروں میں پڑ گئی تو سب سے زیادہ نالائق لڑکیوں میں سے ایک ہو جائے گی۔

اگلے دن سیٹ پر دو کارڈ ملے۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”یہ کون بدتمیزی کر رہا ہے میرے ساتھ۔“ کارڈ ہاتھ میں لے کر وہ ساری کلاس سے پوچھنے لگی تھی۔ لیکن ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ سب خوش گپیں میں مصروف تھے۔

”تم جیسی سٹرل لڑکی کے ساتھ یہ بدتمیزی جو بھی کر رہا ہے، اپنا ٹائم ویسٹ کر رہا ہے۔ تمہیں تو میں بغیر آلو کا سموسہ نہ دوں، وہ تمہیں دو۔“

کارڈ زبھیج چکا ہے۔ بہت ہی بے وقوف اور فضول انسان ہے۔

ساری کلاس ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

ساری کلاس ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ غصے اور شرمندگی سے اس کی گردن کی رگیں کھینچ گئی تھیں۔ تنقیدی ہوئی اس آلو کے سموسہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی کہ لڑکیوں سے کیسے بات کرتے ہیں۔“

”تمیز تمہیں نہیں ہے مس ہانیہ کہ کلاس فیلوز سے آتے جاتے سلام دعا بھی کرتے ہیں۔ کیا سمجھتی ہو خود کو، قلو پطرہ ہر وقت تمہارا پارہ ہانی رہتا ہے۔ کلاس کے لڑکوں کو لوفر، لفنگا جھکتی ہو۔“

”یہ قلو پطرہ تم نے کسے کہا ہے..... ان محترمہ کو.....“ دور سے کسی لڑکے نے ہانک لگائی۔

”انہیں قلو پطرہ کہنے سے پہلے تمہیں اپنی زبان کاٹ لینی چاہیے تھی۔ بے چاری اصلی والی قلو پطرہ کیا سوچتی ہوگی۔ مجھے پاکستان کی کس فضول لڑکی سے ملا دیا ہے۔“

کلاس پھر کشت زعفران بن چکی تھی۔ سب ہنس رہے تھے۔ وہ روکھی ہو گئی۔ سب نے ٹھان لی

”پھر کس کا قصور ہے۔ سارا سارا دن اے سی لگا کر بیٹھی رہتی ہو۔ ہر وقت اس گھر میں نی وی لگا رہتا ہے۔ بجلی کا بل دیکھو کتنا آیا ہے۔ لان کے کپڑے تم ایسے پر لیس کرتی ہو جیسے تمہاری شادی کا ڈریس ہو۔ دو دو گھنٹے لگا دیتی ہو۔ ہر روز یونیورسٹی جانے سے پہلے گھنٹہ بھر ہیئر ڈرائیو کرتی ہو۔ میں پوچھتی ہوں تم یونیورسٹی جانی ہو یا کسی فیشن شو میں۔ بالوں کی چوٹی بنا کر جانے میں کیا قیامت ہے۔ بالوں کو استری کر کے جانا ضروری ہے۔ دیکھو ذرا کتنا زیادہ بل آ گیا ہے۔“

اس نے سکون کا سانس لیا۔ اسمالٹی پلندہ اٹھا کر کچن میں آ کر چولہے پر رکھ دیا۔ آگ کے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔ ماما بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔

”ہائے اللہ..... کیوں خود کو آگ لگا رہی ہو۔ ذرا سا ڈانٹ کیا دیا۔ توبہ ہے آج کل کی اولاد، اللہ بچائے۔“ انہوں نے جلدی سے جگ بھر کر پانی ڈال دیا۔ اس نے بھٹا کر ماما کو دیکھا۔

تھی کہ اسے ایسے احساس دلائیں گے۔ وہ واقعی میں لڑکوں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ کوئی سلام کرتا تھا تو وہ برا سامنے بنالیتی۔

اس کی فرینڈز کا بھی کہنا تھا کہ کم سے کم وہ سلام کا جواب تو ٹھیک سے دے دیا کرے۔ اسے لڑکوں سے اتنی ہی خارش تھی تو پھر اسے خواتین یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہیے تھا۔

”مس ہانیہ! پلیز اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ جائیں۔ آپ اپنے آپ کو بہت لائق فائق سمجھتی ہیں۔ ایسی ہی ذہین و فطین ہیں تو چلیں پھر مسٹر اسمائل کو پکڑ کر دکھائیں۔ پھر ہم آپ کو مانیں گے۔“

ابہتاج اسے طیش دلا رہا تھا۔

سب نے اپنی اپنی ڈیسک بجانی شروع کر دی۔

”ہمت ہے تو پکڑو اسے، ہمت ہے تو پکڑو اسے۔“ سب یک زبان کہہ رہے تھے۔ اس نے دانت پس کر سب کو گھور کر دیکھا۔

☆☆☆

بھنائی ہوئی وہ گھر آئی۔ صوفے پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ پانی کے جگ کو منہ سے لگا کر وہ غٹا غٹ پینے لگی۔

”آج ڈاک آئی ہے تمہاری۔“ ماما نے خطوط کا پلندہ لا کر اس کے سامنے رکھا۔ عینک لگا کر وہ بجلی کا بل پڑھنے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ حیران و پریشان وہ اتنی ساری ڈاک کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بیکٹ کھولا، اسمائل کارڈ نکلا۔ دوسرا کھولا، اسمائل کارڈ نکلا۔ تیسرا کھولا اسمائل اسٹیکرز کا پلندہ نکلا۔

”توبہ توبہ.....“ ماما کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔ اس نے چونک کر ماما کو دیکھا پھر اسمالٹی پلندے کو۔ اس کی سانس اٹکنے لگی۔

”وہ..... وہ..... میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے ماما..... یہ تو..... یہ تو.....“ وہ چوری بن گئی تھی۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت -/120 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور مٹی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دستی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

ڈیپارٹمنٹ میں اس کا مذاق بنا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

لائبریری میں وہ اپنی اسائنمنٹ پر کام کر رہی تھی کہ ابہتاج اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ وہ بھی نوٹس مانگنے آیا ہے۔

”میں تمہاری مدد کروں؟“

”تم..... ہونہ..... اپنی شکل دیکھو، اپنا تعلیمی ریکارڈ چیک کرو۔ میں تم جیسے نالائق سے مدد لوں گی۔“

”میں مسٹر اسمائل کو ڈھونڈنے میں مدد کی بات کر رہا ہوں مس جلتا ہوا انگارہ۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔

”مجھے اسے ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے وہ۔ کارڈ ہی بھیج رہا ہے، بھیجتا رہے۔ اس کے پیسے ضائع ہو رہے ہیں۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں تو پھاڑ کر پھینک دیتی ہوں۔“ اس نے شانے اچکا کر بے نیازی سے کہا۔

”پچھلے دو دن سے تم کارڈ نہیں

رہیں۔ میں نے ڈسٹ بن چیک کیا تھا۔“ اس نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ اس کی سٹی کم ہوگئی۔ وہ گڑبڑا گئی۔

”وہ..... وہ..... میں نے سوچا اب کارڈ جلا دیا کروں گی۔ اس لیے میں گھر جا کر کارڈ جلا دیتی ہوں۔“ وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ حقیقتاً اسے مسٹر اسمائل سے تھوڑی سی انسیت ہوگئی تھی۔ بے چارہ انسان کتنی محنت کر رہا تھا۔ کارڈ خریدتا ہے۔ چھپ چھپ کر اس کی سیٹ پر رکھتا ہے۔ گھر پوسٹ کرواتا ہے۔ کتنا خرچا ہو رہا تھا اس کا۔ اس کے حق حلالی کے پیسے وہ پھاڑ پھاڑ کر پھینک رہی تھی۔ یہ بھی زیادتی تھی۔

”اوہ آئی سی۔ گھر جا کر تم انہیں وارڈروب میں تو نہیں رکھ دیتیں۔ سنبھال کر۔ بہت پیار سے۔“

”شٹ اپ۔ تم کیا میرے گھر میں ٹانک جھانک کرتے رہتے ہو۔ جلا دیتی ہوں بس۔ مجھے تو شک ہے کہ تم ہی مسٹر اسمائل ہو۔ سب سے زیادہ تمہیں ہی مجھ سے مسئلہ ہے۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”کیوں پانی ڈالا آپ نے۔ مجھے کیا ضرورت

ہے جل کر مرنے کی۔“

”میں نے سوچا میرا خون جلاتی رہتی ہو، شاید۔“ ماما کی ہنسی نکل گئی تھی۔

”ائف ماما!“ پاؤں پختی وہ وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ یونیورسٹی وقت سے پہلے چلی گئی تاکہ مسٹر اسمائل کو پکڑ سکے۔ وہ ڈیپارٹمنٹ سے کچھ دور چھپ کر بیٹھ کر کلاس میں آنے جانے والوں پر نظر رکھنا چاہتی تھی۔ سب سے پہلے اسے ابہتاج آتا ہوا نظر آیا۔ جو اسے بغیر آلو کا سموسہ نہ دینے کی بات کر رہا تھا۔ وہ کلاس کے اندر گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں باہر نکل آیا۔ وہ چپکے سے کلاس میں گئی، اپنی سیٹ کی طرف دیکھا، وہ خالی تھی۔ اسمائل کی کارڈ نہیں آیا تھا ابھی۔

”شکر خدایا! یہ بدتمیز ابہتاج مسٹر اسمائل نہیں نکلا۔“ وہ واپس اسی جگہ آکر چھپ کر کھڑی ہوگئی جہاں پہلے کھڑی تھی۔ لیکن یہ کیا۔ اب وہاں ایک کارڈ رکھا ہوا تھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”زیادہ کھوجی بننے کی ناکام کوشش نہ کرو، تم مجھے نہیں ڈھونڈ سکتیں.....“ کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ اس نے اس کارڈ کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ چار دن بعد اسے اپنی اسائنمنٹ جمع کروانی تھی۔ وہ مسٹر اسمائل کو ڈھونڈتی یا اپنی اسائنمنٹ پر کام کرتی۔ جھنجھلاتی ہوئی وہ لائبریری آگئی تھی۔

اس کا زیادہ وقت لائبریری میں گزرنے لگا تھا۔ کارڈ بھی وہیں آنے لگے تھے۔ ساری کلاس اس صورت حال سے محظوظ ہو رہی تھی۔ آتے جاتے سب ہنسی چھپا کر اس سے پوچھتے رہتے تھے۔

”مس ہانیہ! مسٹر اسمائل ملے۔ مل جائیں تو ہم سے بھی ملو ایسے گا۔ ہم بھی ان کے ڈھیٹ پنے کے فین ہو چکے ہیں۔“

وہ دانت کچکچا کر رہ جاتی۔ مسٹر اسمائل نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اب وہ کارڈ پر جملے بھی لکھنے لگا تھا۔ اگر وہ اسے کہیں مل جاتا تو وہ اس کا خون پی جاتی۔

پھیلا لیے۔ واقعی میں، یہ بندہ آخر کون تھا جو اس کی اتنی بد تمیزیوں پر بھی اسے کارڈ بھیج رہا تھا۔ پورے دو مہینے ہو گئے تھے، وہ مستقل مزاجی سے ہر روز اسے کارڈ بھیج رہا تھا۔

ان کارڈز کی وجہ سے اس کی زندگی میں تبدیلی آ رہی تھی۔ اسے ان کارڈز کا انتظار رہنے لگا۔ کارڈ ہاتھ میں پکڑتے ہی اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی۔ اسے انجانی خوشی ملتی۔ اب ہر وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی۔

اس کی دوستیں بھی نوٹ کر رہی تھیں کہ اس کا رویہ بدل رہا ہے۔ کم سے کم اب وہ ہر وقت خونخوار بلی نہیں بنی رہتی تھی۔ کوئی لڑکا اس سے نوٹس مانگتا تھا تو وہ خاموشی سے دے دیتی تھی۔ اپنے سب کلاس فیلوز کو وہ دیکھتے ہی سلام کرتی تھی۔

اب وہ جیسے ہی گھر آتی تو سب سے پہلے مین گیٹ پر لگا میل باکس چیک کرتی۔ جلدی جلدی انہیں کھول کر دیکھتی۔ کمرے میں لا کر احتیاط سے رکھ دیتی۔ جس کارڈ پر کوئی جملہ لکھا ہوتا اسے بار بار پڑھتی۔ سارا دن وہ جملہ اس کے کانوں میں گونجتا رہتا تھا۔

ایک دن وہ کلاس میں گئی تو حسب معمول سیٹ پر اسمائل کارڈ رکھا ہوا ملا۔ اس نے کارڈ اٹھا کر پڑھا۔ خلاف معمول وہ مسکرا رہی تھی۔ ساری کلاس اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ کن اکیوں سے اسے دیکھ کر سب ایک دوسرے کو اس کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

”جو بھی مجھے یہ کارڈ بھیج رہا ہے اس کا تھینکس۔“ کارڈ کو سب کی طرف لہرا کر اس نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

اما اس کی آمد کا بہت شدت سے انتظار کر رہی تھیں۔ بہت خوش نظر آ رہی تھیں وہ۔ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پر جوش انداز سے بتانے لگیں۔

”میری ایک سہیلی تھی روبینہ۔ ہم دونوں دوپٹہ بدل بہنیں بنی ہوئی تھیں۔ آج اچانک وہ گھر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں تو حیران ہی رہ گئی ہانیہ۔ تمہارے پاپا

وہ جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”مس آگ کی دکان! میں مسٹر نو دو گیارہ تو ہو سکتا ہوں۔“ مسٹر مینٹل نہیں۔ تم جیسی لڑکی کو اتنے سارے کارڈ بھیجنے سے اچھا ہے کہ میں ہاسپٹل میں بیٹھی صبا، ردا، سعدیہ کو ایزی لوڈ بھیج دوں۔ اس کا باپ بیمار ہے۔ وہ غریب لاچار ہے۔ اپنے باپ کے ٹھیک ہوتے ہی وہ مجھے ایزی لوڈ واپس بھی کر دے گی۔ بدلے میں تم مجھ کیا دو گی۔“

”مجھ جیسی لڑکی..... م..... مم..... کیا مطلب ہے تمہارا.....“ وہ پھر سے شرمندہ ہو گئی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں نظر آنے لگی تھیں۔

”ایک نمبر کی سیڑیل ہو تم۔ یونیورسٹی کے پہلے دن بہت ادب، بہت نمبر سے تمہارے پاس آ کر میں نے تمہیں سلام کیا تھا۔ اپنا تعارف بھی کروایا تھا۔ لیکن تم نے کیا کیا۔ مجھے سر سے پیر تک گھور کر دیکھا اور منہ بنا کر چلی گئیں۔ بہت پڑھی لکھی بنتی ہو تم، دوسروں کے سلام کا جواب دینا ہی سیکھ لو۔ ہم لڑکے ہی ہیں۔ لڑا کا طیارے نہیں ہیں کہ تم پر بم گرا کر تمہیں ہلاک کر دیں گے۔“

وہ گڑ بڑا گئی۔ ”وہ..... میں..... مم..... میں لڑکوں سے بات نہیں کرتی۔“

”تم سب لڑکوں کو لو فر اور لفنگا سمجھتی ہو اس لیے ان سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔ اسی لیے کلاس کے لڑکے بھی تم سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ مسٹر اسمائل یقیناً بہت بڑے ٹیٹ کا مالک انسان ہوگا جو تمہیں لفٹ کروا رہا ہے۔ شاید اسے کھانے میں ٹنڈے پسند ہوں گے۔ پیزا، زنگر برگر، کوک میں اسے کوئی انٹرسٹ نہیں ہوگا۔ پینڈ وہیں کا۔“

دو سالوں میں سب نے نوٹ کر لیا تھا کہ وہ لڑکوں کو کتنا برا سمجھتی ہے۔ ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ کوئی اس سے نوٹس مانگنے آ جاتا تو صاف انکار کر دیتی۔

وہ گھر آئی تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ وارڈ روم سے سارے اسمائل کارڈز نکال کر اس نے بیڈ پر

سے شادی سے پہلے، اچانک ان کے ابو کا کوئٹہ ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ ہم میں خط و کتابت چلتی رہی۔ پھر اس کے خط آنا بند ہو گئے۔ آج اسے یہاں اپنے گھر میں دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گئی۔“

”آپ کو بہت شوق تھا کہ آپ کی بھی کوئی بہن ہوتی۔ مل گئی بہن آپ کو۔ منہ میٹھا کروائیں۔“ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہ گلاس میں ڈال کر پینے لگی۔

”منہ ہی میٹھا کروانا پڑے گا۔ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ یہاں آئی کیسے۔ وہ یہاں میرے لیے نہیں آئی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے تمہارا پروپوزل لے کر آئی تھی۔ وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ یہ میرا گھر ہے۔“

پانی پیتے اسے اچھولگ گیا۔

”پروپوزل وہ بھی میرا..... ایسے اچانک.....؟“

”میں نے بھی اس سے یہی پوچھا کہ تم میری بیٹی کو کیسے جانتی ہو تو کہنے لگی اس کا بیٹا تمہارا کلاس فیلو ہے۔“

”میرا کلاس فیلو..... کون.....؟“ اس کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

”کک..... کیا..... نام ہے اس کا..... میرا مطلب ان کے بیٹے کا۔“

”بڑا مشکل، مانا نام ہے۔ میری تو زبان پر بھی نہیں چڑھ رہا۔ ہاں وہ کہہ رہی تھی کہ سب مسٹر اسمائل کے نام سے بھی جانتے ہیں۔“

اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔

”پر ماما میں تو جانتی ہی نہیں کہ مسٹر اسمائل ہے کون۔“ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ یقیناً وہ انسان اپنے جذباتوں میں سچا تھا اسی لیے گھر پر پروپوزل بھیج دیا تھا۔

”یاد آیا..... اب..... اب تاج.....؟“ وہ نام کی ادائیگی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ابہتاج.....؟“ اس کی چیخ ہی نکل گئی تھی۔

”ہاں..... یہی..... یہی..... مجھے اپنی دوپٹہ بدل بہن سے رشتے داری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کل میں اور تمہارے پاپا ان کے گھر جا رہے ہیں۔ تم اپنا ماسنڈ بھی بنا لو۔ میں ہاں ہی کر کے

آؤں گی۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔ ہمارے گھر سے ان کا گھر بھی زیادہ دور نہیں ہے۔“

ماما پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں، وہ گنگ بیٹھی تھی۔ اس کا شک صحیح تھا، ابہتاج ہی مسٹر اسمائل نکلا تھا۔ ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے میں گئی، اپنی بیسٹ فرینڈ ابرا کو فون کر کے کہا کہ ابہتاج کا فون نمبر کہیں سے لے کر دے۔

☆☆☆

”تم کہتے تھے کہ تم مجھے بغیر آلو کا سموسہ بھی نہیں دو گے، پھر میرے گھر پر پروپوزل کیوں بھیجا ہے۔“ وہ تنک کر بولی۔

اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔

”تا کہ ہم دونوں ایک ٹیبل پر آئے سامنے بیٹھ کر، قہیے والے سموسے کھائیں۔ تجھے آلو کے سموسے پسند نہیں ہیں۔“

وہ زریب مسکرانے لگی۔

”مجھے کارڈ بھیجنے والے تم ہو..... مسٹر اسمائل ہے نا؟“

”جی جناب میں ہی مسٹر اسمائل ہوں۔ پورے دو سال تک تمہیں دل ہی دل میں پسند کرتا رہا ہوں۔ تمہیں مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تمہاری پیشانی پر ہل پڑ جاتے تھے۔ بہت ڈر لگتا تھا تم سے۔“

”کارڈز بھیجتے ہوئے ڈر نہیں لگا تھا؟“ اس کے دل میں محبت کی کلی کھل اٹھی تھی۔

”بہت لگا تھا۔ سوچا تھا تم نے پکڑ لیا تو کیا ہو گا۔ پروہ عشق ہی کیا جو بے خوف نہ ہو۔ ڈر کے آگے جیت ہوتی ہے۔“

کمرے کی دیواروں پر چسپاں اسمائل کارڈز کو دیکھ کر وہ بیک وقت مسکرا اور شرما رہی تھی۔ ان کارڈز نے اس کے دل کی دنیا بدل دی تھی۔ اسی لیے تو وہ مسٹر اسمائل کی مسز اسمائل بننے کو تیار تھی۔



کہانی کی ابتدا ایک اجنبی سے ہوتی ہے جو لنگڑاتے ہوئے بس سے اترتا ہے اور گاؤں کے چاچا حفیظ سے ملتا ہے۔
چاچا حفیظ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہے۔
دلہن کا کمرہ سجا ہے اور وہ اس میں پتھر کی مورت بنی بیٹھی ہے۔ اس کے احساسات مفلوج ہیں۔ اسے یقین نہیں
آ رہا کہ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔

حمیدہ اپنے بیٹے کی ضد پر سیف اللہ کے گھر اس کی بے حد حسین بیٹی زہرہ کا رشتہ لے کر جاتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے
کہ اس کے بیٹے کی کیا اوقات ہے وہ بد شکل اور ناخواندہ ہے۔ پھر بھی زہرہ پر مرتا ہے۔ لیکن منہ کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔
بیوہ ہو جانے کے بعد حمیدہ اور اس کے بیٹے کو سیف اللہ نے پناہ دی اور ان کا خرچ اٹھایا۔ جبکہ آپاں جی سمجھ جاتی ہیں کہ وہ
کس لیے یہاں آئی ہے اور اسی وجہ سے انہیں شدید غصہ آتا ہے۔

فخر اور فری بہن بھائی ہیں۔ وہ سیف اللہ کے مرحوم بھائی کے بچے ہیں۔ بچپن سے ہی زہرہ کی بات فخر سے اور فری
کی بات کرم سے ملے ہے۔ کرم کو نہ پڑھنے میں دلچسپی ہے اور نہ ہی کاروبار سے، اس لیے سیف اللہ اپنے بیٹے کا رشتہ فری
سے توڑ دیتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ وہ اسے کرم سے بیاہ کر زیادتی نہیں کریں گے۔

کرم فری کو بہت چاہتا ہے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو کر فخر کا داخلہ گھر میں بند کر دیتا ہے، فخر اور زہرہ چھپ چھپ
کر باغ میں ملتے ہیں لیکن انہیں یہ علم نہیں کہ کوئی ان پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ ایک دن عاشق زہرہ کو راستے میں روک
لیتا ہے اور اس سے گھٹیا اور فضول باتیں کرتا ہے۔

ساتھ رضا

حکایتِ حیرت



مُكْحَلِ تَاوُل



زہرہ کے حسن کے چرچے پورے گاؤں میں پھیلے ہیں۔

فیض اپنی ماں اور بہنوں سے زہرہ کے حسن کے قصے سنتا ہے۔ اور شدید اشتیاق کے عالم میں اسے دیکھتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی اس پر فدا ہو جاتا ہے اور راہ روک روک کر اسے پریشان کرتا ہے۔ جس پر زہرہ اس کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔ کرم کو پتا چل جاتا ہے کہ حمیدہ نے اپنے بیٹے عاشق کے مجبور کرنے پر زہرہ کا رشتہ مانگا ہے۔ یہ سن کر اس کا خون کھول جاتا ہے کہ عاشق اس کی بہن پر بری نظر رکھتا ہے۔ وہ عاشق کی پٹائی کر دیتا ہے۔

ستو والے باغ میں زہرہ فخر سے ملتی ہے تو اسے بتاتی ہے کہ اس کے لیے فیض کا رشتہ آیا ہے۔ تب ہی فیض وہاں آ جاتا ہے۔ فخر فیض کی پٹائی کرتا ہے۔ فیض بھاگ جاتا ہے۔ تب ہی سیف اللہ کا فون آ جاتا ہے تو فخر تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ فون اٹھائے یا نہ اٹھائے۔

اب آگے پڑھیے۔

دوسری اور آخری قسط

کے بعد اپنے لیے بادام والے دودھ کا آرڈر دے رہا تھا۔

فیض کے لیے یہ انداز و جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ فوری طور پر اسے کوئی جواب نہ سوچا مگر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بولنے والا کوئی اور ہوتا تو شاید..... مگر وہ زہرہ کا بھائی تھا۔ زہرہ کے جملے بھی ایسے کاٹ دار ہوتے تھے۔ پتا نہیں کہاں سے دھار لگواتے تھے بہن بھائی کہ اگلا لہو لہان ہو جائے۔ ”جتنی تیزیاں دکھانی ہیں۔ دکھا دے کل کو کہلائے گا تو سالا ہی ناں.....“ صدیق کی نکتہ پر دازیوں پر مدثر کی پسلیوں میں بل پڑ گئے۔

مگر فیض..... وہ حیران رہ گئے۔ اس کے ہونٹ جڑے رہے۔ وہ عبد اللہ کو گھور رہا تھا۔ عبد اللہ کی نگاہ اس پر گئی۔ سفید کڑک لباس میں وہ دوستوں کی معیت میں شان سے بیٹھا تھا۔ اس نے گردن اچکا کر ایسے اشارہ کیا جیسے پوچھ رہا ہو۔ کیا تکلیف ہے۔

فیض یکدم اپنی جگہ سے اٹھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے دوستوں میں گھس کر بیٹھ گیا۔ دوستوں نے اسے دیکھا پھر عبد اللہ کو، یہ کون تھا بھلا اور یہ کیا طریقہ تھا۔

”بڑے دنوں سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

فخر کے گھونے نے فیض کے گال کو چھوا تھا۔ اب وہاں نیل کا نشان تھا۔ مگر اس نشان سے زیادہ تکلیف دہ زہرہ کے وہ آخری تاثرات تھے۔ وہ مزہ چکھانے گیا تھا۔ مزہ چکھ کر آ گیا تھا۔ گھر گیا تو ماں نے سوال پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیا۔

”کیا ہو گیا، ہائے میں مر گئی۔“ وہ گھر سے باہر نکلا تو دوست وکیل بن گئے۔ جرح پر اتر آئے۔

”بس تو ایک بار نام بتا دے۔“ منٹوں میں مشہور ہو گیا۔

”فیض شریف کے گال پر نیل ہے۔ کسی سے مار کھا کر آیا ہے۔“ وہ اب کیا چیخ چیخ کر بتاتا کہ مار کھلا کے بھی آیا ہے۔

دوستوں نے فی الوقت خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اسے گرم دودھ پلانے لے آئے۔ وہ سب آپس میں محو گفتگو تھے۔ وہی شغل لطفے، گانے، باتیں۔ وہ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھا۔ پکارنے پر چونکتا زخمی ناگ لگ رہا تھا۔

”اوئے فیض!“ یہ چونکا فیض کی آواز عبد اللہ کی تھی۔ ”کس کی بہادری کا نشان لے کر بیٹھ گیا ہے؟“ فیض چونکا جس جس نے دیکھا تھا پوچھا تھا۔ ہر طرح کا جملہ کہا مگر یہ والا..... عبد اللہ جملہ مارنے

اس نے گال کے نیل کو انگلی سے چھوا اور مصنوعی
سکاری بھری۔

”وہ جو فخر ہے ناں!“ وہ قصد آرکا۔
”کیا ہوا فخر کو.....؟“

”نہیں کچھ نہیں۔ اسے کیا ہونا ہے۔ میں یہ
سوچ رہا تھا کہ بھلے چاچے کا پتر ہے۔ مگر شرم حیا بھی
کسی چیز کا نام ہے کہ نہیں۔“ عبداللہ کی آنکھیں
سکڑیں۔

”ابھی میرے چاچے کی بیٹی کا ویاہ ہوا ہے۔“
وہ عبداللہ سے منہ پھیر کے دوستوں سے مخاطب ہوا۔
جو خاک نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ ”سر پر قرآن رکھ کر
اپنے ہاتھوں سے ڈولی میں بٹھایا میں نے..... بھائی
ایسے ہی رخصت کرتے ہیں ناں بہنوں کو؟“ سب
کے سر لامحالہ اثبات میں ہلے۔

”او تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ عبداللہ بھڑکا
”مطلب کیا ہے تیرا؟“

مطلب تو تم اب خود ڈھونڈنا میرا کام تھا اشارہ
دینا۔ ”وہ کھڑا ہو گیا۔“ ”کبھی ستو والے باغ کے آم
کھائے ہیں۔ بڑے سوادی ہیں۔ اور باغ بھی بڑا
گھنیرا ہے۔ کوئی اندر لک (چھپ) کے بیٹھا ہو تو
ڈھونڈنے سے نہ ملے، لیکن سیانے کہتے ہیں۔
ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔“

”اوئے کیا بکواس کر رہا ہے تو۔“ جو باتیں گھما
پھرا کے کرنا جانتے ہیں وہ اشارے کنائے کو بھی
بہت جلدی سمجھتے ہیں۔ ”عبداللہ تیزی سے اٹھا تھا۔
دوست بالکل نہیں سمجھتے اگر جو عبداللہ نہ
بھڑکتا۔“

”اوئے میری بہن کا نام لیتا ہے۔ تیری تو.....“
”بہن کا نام.....؟“ فیض نے بھول پن سے
اکٹھے ہو جانے والے لوگوں کو مخاطب کیا۔

”کوئی بتائے..... میں نے لیا کیا؟ بالکل نہیں۔“
”بکواس کرتا ہے۔“ عبداللہ نے جگ کا پانی
اس کی سمت اچھال دیا۔

فیض نے کالر پیچھے گرا کر بھیکے بال جھٹکے۔
”بڑی گرمی تھی آج..... ٹھنڈ پڑ گئی۔“ اس نے
اپنے بھیک جانے والے گریبان میں پھونک ماری۔
نیل کا جواب نیل ہی ہو ضروری نہیں۔ زہر میں
بجھے تیر بھی نیل و نیل کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

غیض و غضب سے کانپتے عبداللہ کے اوپر
پانی پڑ گیا۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا۔ وہ گھر پہنچ کر زہرہ
کی گردن ٹاپ لے گا اور سیف اللہ کو بتائے گا۔
دیکھیے اپنے بھتیجے کے کرتوت کیسے وہ ان کی عزت
گاؤں کے باغوں میں رول رہا تھا۔

”ہو نہ ہو..... یہ کرم کو زلیل کرنے کا بہانا
ہے۔“ مگر ادھر باپ و دیگر کے ٹھس رد عمل نے اسے
حیران کیا۔ مایوس بھی..... وہ سب اس کی طرف یوں
دیکھ رہے تھے جیسے وہ بہن کا نہیں کسی راہ چلتی کا قصہ
سن رہا ہو۔ جسے سننے میں دلچسپی کسی کو بھی نہ ہو۔

”پوچھیں اس سے..... یہ جانی ہے ناں اس
سے ملنے ستو والے باغ میں.....؟“

باپ کی نظریں زہرہ کی سمت اٹھیں۔ زہرہ نے
نگاہ چرائی۔ باپ نے بھی..... اوہ..... کسی ثبوت کی
گنجائش رہی نہیں۔ وہ جانی تھی اور باپ کو کوئی فرق
نہیں پڑا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کو ہمیشہ کی طرح مرحوم
بھائی کا منہ مارتا ہوگا..... لیکن مجھے اس دنیا میں جینا

ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ سب کچھ سن کر بھی فخر اپنی
ٹانگوں پر چلتا نظر آ رہا ہے۔ اس کا تو میں وہ حشر
کروں گا کہ باغ کا راستہ بھول جائے گا اور اس کا
علاج بھی ڈھونڈتا ہوں آ کر..... پہلے اس سے نبٹ
کر آتا ہوں۔“ وہ جارحانہ تیور لیے مڑا۔

”شہر جا عبداللہ..... فخر کو کچھ نہ کہنا۔“

”کیوں کچھ نہ کہنا؟“ وہ ایسے چلایا جیسے باپ

کا گریبان پکڑ لینے والا ہو۔

”میں نے رشتہ طے کر دیا ہے زہرہ کا فخر سے،

اس اتوار کو منگنی ہے۔ شادی ایک سال.....“
 ”رشتہ.....؟“ عبداللہ کی لکارتی آواز سرگوشی
 میں ڈھل گئی۔

”اوہ.....!“ اس کی نگاہیں درمیانی میز پر
 رکھے چائے کے لوازمات پر جا ٹھہریں۔ ان میں
 ایک مٹھائی کا ڈبا بھی تھا۔ اور جب وہ آندھی طوفان
 کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ تب سب کے
 چہرے کھلے ہوئے تھے۔ سب بہت خوش تھے۔
 خاص طور پر زہرہ..... اس نے یاری باری سب کو
 دیکھا۔ آپاں جی آنکھیں موند کر تسبیح کر رہی تھیں۔
 جیسے شکرانہ پڑھ رہی ہوں۔

ناہید کے چہرے پر خوشی تھی۔ اور زہرہ کے
 جھکے سر نے بھی شرمیلیں مسکراہٹ کو مخفی نہ رہنے دیا تھا۔
 سب سے بڑ کر جو طمانیت بے فکری اور خوشی سیف
 اللہ کے چہرے پر تھی۔ اس کا کوئی مول نہ تھا ہاں
 ایک شیم بھی۔ جس کا چہرہ رنگ بدلتا تھا۔

☆☆☆

باپ کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھا۔ کسی سے بھی کر
 دیں ابا جی بس فخر سے نہیں۔“

”اوپر کیوں.....“ سیف اللہ زچ ہو گئے۔
 ”سارا پنڈ باتیں کرے گا۔ کڑی نے اکھ مٹکا
 کیا ہے۔ ماں یاپ نے رشتہ طے نہیں کیا۔“ وہ پھٹ
 پڑا۔ ساری رات جاگ کر اس نے یہی سوچا تھا۔
 ”کون کہتا ہے؟“

”ساری دنیا..... سارے پنڈ میں مشہور ہو گیا
 ہے۔ یہ اس سے ملنے جاتی ہے باغ میں۔“ اس کے
 دل میں حقارت و نفرت تھی۔ سیف اللہ نے ڈپٹ کر
 اس کی بات کاٹی۔

”آپ کسی سے بھی کر دیں ابا جی..... بس اس
 سے نہ کریں۔ میری عزت بے عزتی کی بات ہے۔“
 ”او مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں اتنے
 لائق فائق شریف اور سب سے بڑھ کر سکے بھتیجے کو
 چھوڑ کر کسی کو تلاش کرتا پھروں۔“ سیف اللہ نے

صاف جواب دے دیا۔
 ”دنیا جینے نہیں دے گی ابا جی.....!“ وہ
 روہانسا ہو گیا۔ کیسے باپ کو سمجھائے۔

”اوئے بکو اس بند کر۔ تو نے ناہید سے اپنی
 پسند سے کی۔ ہر ایک سے فخر یہ کہتا ہے لو میرج اور
 بہن کے لیے اکھ مٹکا..... شرم کر او کوئی حیا کر.....
 خبردار جواب ایک لفظ بھی بولا۔ پہلے ہی اس کرم کے
 کرموں کی وجہ سے بات یہاں تک پہنچی..... مجھے
 خود جا کر فخر اور نغمہ سے رشتے کی بات کرنی پڑی۔
 ورنہ جس کو دیکھو رشتے داری جوڑنے چلا آ رہا ہے۔“
 سیف اللہ بولے جا رہے تھے۔ مگر عبداللہ کی
 سوئی وہیں اٹک گئی۔ خود جا کر رشتے کی بات کرنی
 پڑی اور دوسرا نام کرم کا تھا۔

وہ ایسے ہی باپ سے وجوہات، عوائل، چونکہ
 چنانچہ سننے بیٹھ گیا تھا۔ کمال ہے کرم کی طرف دھیان
 گیا ہی نہیں..... وہ مرجاتا مگر یہ رشتہ نہ ہونے دیتا۔
 سیف اللہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔
 عبداللہ کی خاموشی کو انہوں نے اپنے دلائل کی جیت
 سمجھا۔ انہیں نہیں پتا تھا۔ عبداللہ نے کیا سوچ لیا
 ہے۔ لگی آگ کو بجھانا مشکل ہوتا ہے۔ بھڑکانا
 نہیں۔

☆☆☆

”اور قیامت کا ذن کیسا ہو گا۔“ زہرہ کی بہتی
 آنکھوں پر نگاہ ڈکا کر بیٹھی شیم نے سوچا۔ خود وہ رورو
 کر تھک چکی تھی۔ پریشانی نے ناہید کی رنگت بھی زرد
 کر دی تھی۔ وہ کیکپالی زہرہ کے ساتھ لگ کر بیٹھی

تھی۔ زہرہ کی ملتچی بھگی آنکھیں اس پر پڑتیں تو وہ
 دلاسا دینے کے لیے اسے پچکار دیتی۔ یہ سب ٹھیک
 ہو جائے گا کا اشارہ تھا۔ مگر باہر کرم کے اٹھائے
 طوفان نے سب تہہ وبالا کر دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”میں اس کی بہن کے قابل نہیں تھا اور وہ
 میری بہن کے قابل ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ کو چبارہا
 تھا۔ ”ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی کہ خود سے

لڑکے کو داماد نہیں بنائے گا۔“

کسی نے اڑتے پڑتے باغوں میں ہونے والی ملاقاتوں کو بھی کرم کے بھڑکنے کا سبب بتایا۔ اس انکشاف پر کچھ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہیں کچھ نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آنکھ میچی گویا وہ تو پہلے سے ہی جانتے تھے۔

”اگر باپ اب بھی اس رشتے سے باز نہ آیا۔ تو اسے کرم کی لاش سے گزرنا پڑے گا۔“ اس نے اعلان کیا۔

”مر تو تو اسی دن گیا تھا نا خلف جس دن فری کے کمرے میں گھسا تھا۔“

سیف اللہ کی آنکھیں لہو ہو گئیں۔ سیف اللہ کو یہ بات کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے اس وقت اس بات کو یاد کروا کے ان سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ جس کا خمیازہ ہر ایک کو بھگتنا پڑے گا۔

کرم کی آنکھوں کے سامنے بھی وہ رات ایسے روشن ہو گئی جیسے پردے پر فلم چلا دی گئی ہو۔ فری اس کی نہیں ہوگی۔ تو وہ اسے کسی کی بھی۔ ہونے کے قابل نہیں رہنے دے گا۔ وہ مایوں کے زرد لباس اور پھولوں سے مہکتی فری کے دونوں ہاتھ مٹھی میں دبوچے کھڑا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر کسا ہوا تھا۔ تب ہی وہ زمین پر جا گرا۔

وہ دراصل فخر کا گھونسا تھا۔ پھر فخر نے یہ نہیں دیکھا۔ وہ کون ہے رشتے ناتے چہرے..... اسے بس فری کے گجروں کے خالی لوہے کے تار دکھائی دے رہے تھے۔ اور ہار کے خالی دھاگے۔

اس نے کرم کو اتنا پیٹا..... اتنا پیٹا..... کہ بس

آخری ہچکی کی کسر رہ گئی۔ وہ سیف اللہ نے پوری کر دی۔ ادھ موئے کرم کو عبد اللہ اور ناہید چپکے سے اپنے کمرے میں لے گئے۔ فخر نے اسے مرے ہوئے چوہے کی طرح پیروں سے دھکیل کر دروازے سے باہر کیا تھا۔

جا کر رشتہ پیش کر دیا۔ میں یہ دروازہ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہوں ماں.....! آپ آخر اسے کب تک بچا سکتی ہیں۔ بے حیا..... اس سے ملاقاتیں کرتی تھی۔ اس حرام زادے سے۔“ وہ مرحوم چچا کو آج خوب یاد کر رہا تھا۔

”زہرہ کا تو فخر سے ہی ہوگا۔ کون مائی کا لال ہے جو مجھے باز رکھ سکے۔“ سیف اللہ کا تحمل قابل دید تھا۔

عبد اللہ باپ کے اس دعوے پر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا۔ لیکن اب سامنے کرم اللہ تھا۔

”ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنے بچے ایک دوسرے کا الٹ ہوتے ہیں۔ کرم کا باپ کے مد مقابل آ جانا اس کی مثال تھا۔ اس نے سفید ہوائی چل پہن رکھی تھی۔ ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر وہ ٹھوڑی کو اٹھائے باپ کو گھورنے لگا۔ سیف اللہ نے بھی پللیں نہ جھپکنے کی قسم کھالی۔

”شرم کر کرم!“ آپاں جی سے قیامت جیسا بل اور برداشت نہ ہوا۔ بیٹے کا قد باپ سے نکل جانے کا مطلب یہ تو نہیں وہ باپ سے بڑا ہو گیا۔ انہوں نے پورے جسم کی طاقت لگا کر اسے دھکا دے دیا تھا۔ عیسیم نے تو زہرہ کو کمرے میں لے کر جو کنڈی چڑھائی اسے نہ کھولنے کی قسم کھالی تھی۔ اب جبکہ کرم کی ٹھوکروں نے کنڈی کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ تفسے سے کتنے ہی کیل نکل کر بکھر گئے۔ پہلے وہ زہرہ کی جان لیتا۔ باقی بعد میں.....

شور سن کر کتنے ہی محلے دار دروازے کے باہر جمع ہو گئے تھے۔

سب کو وجہ بھی پتا چل گئی۔ جو شیلے نو جوانوں کو کرم ٹھیک لگ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے ناں..... کل فخر نے اپنی بہن نہیں دی..... آج کرم نہیں دے گا۔“ لیکن سوجھ بوجھ والوں نے سیف اللہ کے فیصلے کو سراہا تھا۔

”کون پاگل ہوگا جو فخر جیسے لائق و شریف

ادھر اس کے شدید ترین نفرت بھرے خیال سے پرے وہ اسے قائل کر رہا تھا۔
رات وہ شلواری کی جیب میں کوئی دوا لے آیا۔
”بی لے.....“ وہ بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔ خود کو بے پرواہ ظاہر کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ اس نے بنا کسی پڑتال کے دوا ہونٹوں سے لگالی۔

☆☆☆

یہ اس سے اگلی صبح کا واقعہ تھا۔ وہ سفید کڑک لباس میں بازار آ گیا۔ موڈ خوشگوار تھا۔ دوا دینے والے نے کہا تھا چوبیس گھنٹے میں سب صاف۔
اس نے کڑک دودھ پتی کا آرڈر دیا۔ ساتھ میں مٹھائی کی پلیٹ آ گئی۔ وہ حیرت سے چائے خانے کے مالک کو دیکھنے لگا۔
”پتر ہوا ہے میرے پتر کے گھر..... مٹھائی ہی مٹھائی۔“ اس نے نعرہ لگایا۔
”اوہ.....“ اس نے سمجھ کر گلاب جامن منہ میں رکھ لی۔

”مبارک ہو بہت بہت۔“

”خیر مبارک، خیر مبارک..... یہ بتا ہم کب مبارک دیں گے؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے مٹھائی نگلی۔

”او کوئی خبر شبر..... میرے بیٹے کے ویاہ سے پندرہ دن پہلے ہوئی تیری شادی، ہے کہ نہیں۔“
”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”او پہلا بچہ ہو جانا چاہیے۔ وہ بھی منڈا۔ مرد کی گردن سیدھی رہتی ہے۔ ٹور سے چلتا ہے۔ میں نے کہا اپنے پتر سے..... چل بھئی پتر تو نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اب منالے۔ وہ کیا کہتے ہیں بنیا منیا..... پوتا ہم سنبھالیں گے۔ او آخر ہم کس لیے ہیں

ہا ہا.....“ چائے کا کپ اس کے لبوں سے لگا رہ گیا۔
اسے جیسے کسی نے زور کا جھٹکا دیا تھا۔ اسی وقت دو تین لوگ چائے خانے میں داخل ہوئے۔

سیف اللہ نے کراہیت سے منہ موڑ لیا تھا۔
”میں بیٹوں کو بیٹیوں پہ فوقیت دینے والا باپ نہیں ہوں کرم..... تو فری کے قابل نہیں تھا اس لیے نہ فخر زہرہ کے قابل ہے۔ اس لیے ”ہاں!““
”مجھے پتا لگ گیا ہے آپ نہیں مانیں گے۔ میں اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ ہاں کہنے آ سکے۔“ وہ آگ اگلتا کمرے سے نکل گیا۔ ”اس کی ہڈیوں کے سرے سے مانگ بھرے گی آپ کی بیٹی۔“

☆☆☆

”اگر تجھے چاہیے بچہ تو ٹھیک ہے میں چپ کر جاتا ہوں۔ لے آ..... مگر..... تو کیا کرے گی بچہ..... ایسے ہی فضول کی ذمہ داری..... اور پھر دیکھ تیرا جسم بگڑ جائے گا۔ دیکھ کیسے بالشت بھر کی کمر ہے۔“ اس نے ناپ کے دکھائی۔ پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے دیکھتا تو کھسپانا سا مسکرا دیتا۔ دونوں نے رات آنکھوں میں کائی۔ ایک دوسرے سے چھپا کر..... ساس نے بیٹے سے کلام کرنا چھوڑ دیا۔

”دیکھ تو کتنی سوہنی ہے۔“ اس نے اس کے شانوں اور کمر پر ایسے ہاتھ پھیرا جیسے قربانی کے جانور کو سراجتے ہیں۔

”بچے حسن نچوڑ لیتے ہیں۔“ وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہیں پا رہا تھا۔ ”اماں کو کیا پتا..... میں اپنے اور تیرے درمیان کسی تیسرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔“ دونوں باورچی خانے میں پیڑھیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ برسات کے بعد کیڑے مکوڑے پتنگے نکل آئے تھے۔ ایک موٹا چیونٹا اس کی گود میں گرا۔ وہ چونکی اس نے چٹکی سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور دوراڑا دیا۔ نظریں اپنے پیٹ پر جا رکیں۔
اس نے شوہر کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا

تھا۔ نہ ہاں نہ ناں۔ مگر ابھی ابھی اسے خیال آیا۔
کاش وہ بالکل اس چیونٹے کی طرح اپنی کوکھ میں آ جانے والے اس بچے کو بھی چٹکی سے اٹھا کر دوراڑا سکتی۔ کاش.....

جائے والا اپنی جگہ سے اٹھ کر آ گیا۔ گرم جوشی سے بقل گیر ہوا۔

پیچھے پیچھے چائے والے کا بیٹا بھی تھا۔ جھینپا سا کھڑا تھا۔ سب اس سے گلے ملے۔ پھر اس کے دوستوں نے اسے بانہوں میں بھر کے ذرا اونچا اٹھا لیا۔ وہ ہنستے ہوئے نیچے اترنے کی منت کرنے لگا۔ دبلا پتلا سا نرم چہرے والا بائیس بیس برس کا لڑکا باپ بن گیا تھا۔

”او شیر لکیاں اے شیر.....“ ایک چاچے نے اس کی کمر تھپکی۔

”خوش کر دیتا اے منڈیا..... ناں کی رکھیا اے کا کے دا۔“

”شیر محمد..... ولد دلیر محمد..... دادا شمشیر محمد۔“

”ہا ہا ہا.....“ تازہ تازہ بننے والے دادے نے پورا شجرہ سنا دیا۔ سب ہنس دیے۔ وہ یکدم پس منظر میں چلا گیا۔ اپنا آپ ایسا فالتو تو کبھی نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

مگر ایسے دیر ہو چکی تھی۔ اس کی ماں صحن کے بیچ و بیچ کھڑی تھی۔ دوا کا اثر ظاہر ہو چکا تھا۔ پھر ماں وہیں پیروں کے بل بیٹھ کر اپنے سر پر ہاتھ مارنے لگی۔

”اوہ.....!“ اس نے صورت حال کو جانچ لیا۔ وہ چارپائی پر چت پڑی تھی۔

وہ بھاگ کر اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ جو اتنی تکلیف میں پڑی تھی مگر وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ برداشت کی حد پر پہنچ کر لب تو کچلتی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر ایک سکون تھا۔ اسے ساس کی آہ وزاری سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

”اوہ.....!“ ماں نجانے کب اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور دوپٹہ اس کی پشت پر برسائے۔ وہ اسے کوس رہی تھی۔ اس نے ماں کو ہاتھ سے پیچھے کیا۔ اور اسے گریبان سے پکڑ کر مقدمہ بھرا اٹھا لیا۔

”تو..... تو بھی یہی چاہتی تھی ناں..... اوہ

خدا۔ اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ ٹھک سے چارپائی سے جا لگی۔

”تو میرا بچہ کیوں پیدا کرنا چاہے گی..... اوہ کتنی بڑی بھول ہو گئی مجھ سے..... تو تو خوش ہو گئی۔“

اس نے..... ماں اس نے مجھے روکا نہیں..... پر یہ کیوں روکتی۔ یہ تو میں اس سے عشق کرتا ہوں ناں..... یہ تو مجھ سے نہیں کرتی ناں..... یہ تو۔“

اس نے ایک بار پھر اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ گریبان چرتا چلا گیا۔

اس بار ساس اس لیے نہیں چیختی تھی کہ اس کا سر لکڑی سے بری طرح ٹکرا گیا تھا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے عیاں ہو جانے والے اس کے بدن کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر عجیب سے دھبے تھے۔ نیلے، میرون۔ جامنی اور سیاہ.....

”اوہ میریا ربا.....“ وہ قریب آ کر اسے ٹٹولنے لگی۔ کیسی دوا دے دی تھی اس نے اس کو..... جس کے بد اثرات اس طرح ظاہر ہو گئے تھے۔

جیسے سانپ ڈس گیا ہو اور زہر پھیلنے لگے۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی۔

اس کا بیٹا چونکا۔ ساس کی آہ وزاری پر اس نے یونہی نگاہ کی اور منہ پھیر لیا۔ جیسے اس کے لیے یہ دھبے نئے نہ ہوں۔ بیٹے کے چہرے پر ذرا سی گھبراہٹ ابھری پھر وہ پیر پٹختا نکل گیا۔

یہ زہر نہیں تھا۔ یہ وہ چٹکیاں تھیں جو غصے میں کاٹی گئی تھیں۔ خیر غصے میں انسان وحشی ہو ہی جاتا ہے۔ مگر..... ان میں سے زیادہ وہ تھیں۔ جو پیار میں..... لاڈ میں آ کر بھری گئی تھیں۔ اس کی ساس نے اپنا منہ دبا دیا۔ رونے کی آواز باہر نہ جائے اس لیے۔

☆☆☆

آخری تاریخوں کے چاند کی مدھم روشنی میں سائے بھیانک دکھائی دیتے تھے۔ فضا کے سناٹے کو

جھینگروں کی آوازیں توڑنے کی کوشش کرتی تھیں۔

بھلا.....جوا لیے۔

کبھی کبھار سی کتے کے بھونکنے یا بلی کی میاؤں بھی ارتعاش پیدا کر دیتی مگر اس کے بعد پھر وہی ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ ایک پراسراریت نے ہر شے کو اپنی لپیٹ لے میں رکھا تھا۔ ایسے میں بے فکری اور اعتماد سے چلتا وہ سایہ سا ایک دیوار کے پاس آ کر رک گیا۔ اس نے اپنے منہ پر لپٹے ڈھالے کو چھوا۔ وہ مطمئن تھا۔

دیوار پھلانگنے میں اس نے پھر بھی کچھ پس و پیش سے کام لیا تھا۔ مگر ذرا ذرا فاصلہ سے پڑی چارپائیوں میں سے مطلوبہ چارپائی تک وہ یوں پہنچا۔ جیسے کسی نے کان میں کہا ہو۔ وہ والی..... وہ جس نے نیلا کھیس اوڑھ رکھا ہے۔ اس ذلیل کو وہ کیسے نہ پہچانتا۔ اس نے دانت پس کر خود سے کہا۔ وہ یکدم اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور دوسرے سے وہ اس کا گلا دبائے لگا۔ نیچے والا تڑپ گیا۔ اس کے منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے پیر چارپائی پر بری طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مسلے جا رہے تھے۔ ایسا کہ چارپائی کی بنائی نے کھال الگ کر دی۔ مگر گلا دبائے والا دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔ وہ منہ سے مسلسل کچھ بول رہا تھا۔ جتا رہا تھا..... دھمکا رہا تھا۔ اسے اس کی اوقات یاد دلا رہا تھا۔

جان پر بن آئے تو مردے میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ وہ مسلسل اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ مار رہا تھا۔ اسے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اسے منہ سے اس کا ہاتھ ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ چیخ کر پکارنا چاہتا تھا۔ مگر آواز نہ نکل سکی۔ اس کے گال پر تھپڑ سا پڑا تھا۔

”زہرہ کا نام لیتا ہے۔ تیری اتنی مجال..... وہ گلا ہی نہ چھوڑوں گا جس سے آواز نکلتی ہے۔“ ڈھالے کی وجہ سے وہ ایک لفظ نہیں سمجھ سکا۔ مگر زہرہ کا نام سمجھ آیا تو مزاحمت ترک کر دی۔ یہ کون تھا

خاموشی میں برپا ہونے والی اس ہلچل نے اس کے ساتھ کی چارپائی والے کو کروٹ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگلے پل وہ اچھل کر اٹھا۔ اس کی جان لینے کے لیے آنے والا یکدم اس کے سینے سے چھلانگ مار کے اتر اور چھلاوے کی طرح دیوار پھاند گیا۔

یہ تین نفوس تھے۔ وہ تو گلا دبائے جانے کے باعث بہت دیر تک بولنے کے قابل نہ ہوا۔ اٹھ کر پیچھے کیسے بھاگتا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھا کرنے والے بھی ہانپتے کانپتے ناکام ہو کر واپس آ گئے۔

”پتا نہیں کدھر غائب ہو گیا..... ایسے بھاگا جیسے ون ٹو فائیو (125) کا انجن لگا ہو۔“ پہلے والے کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

”او یار..... مجھے تو کوئی بارلی سے (جن بھوت) لگتی ہے۔“ دوسرے کی آواز میں سراسیمگی تھی۔ وہ ان دونوں کی صورت دیکھے گیا۔ وہ ایک ہاتھ سے ابھی تک گلے کو مسل رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے ناں..... پانی دوں۔“

”پی لیا میں نے.....“ وہ بولا تو آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اور بولنے سے درد ہو رہا تھا۔

”کون ہو سکتا ہے آخر.....؟“ دونوں کے ذہن صاف سلیٹ تھے۔ ایسا تو کوئی معاملہ تھا ہی نہیں دور دور تک ایسی کوئی دشمنی تھی ہی نہیں..... اگر چور تھا تو۔

ڈیرے پر تو بھینس بندھی تھی اور بھینس چوری کرنے والوں کا طریقہ واردات ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ”کون ہوگا؟“ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اس نے کھنکار کر گلا صاف کرنا چاہا۔

”فخر کے سوا.....“ اس کو نام بھی پتا تھا،

صدیق اور مدثر نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا..... پھر فیض کو جس کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور جس کے چہرے پر فی الوقت طیش و غضب کی جگہ حیرانی کا ڈیرہ تھا۔

”بار بار..... میری زہرہ..... میری زہرہ کہہ

رہا تھا۔“

☆☆☆

”میں اس کے غصے کو نا جائز نہیں کہتا۔“ سیف اللہ کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

مگر میں اسے سمجھا لوں گا۔ پہلے تھا میرا ارادہ کہ منگنی کی رسم کروں گا مگر اب میں صرف بات طے کر دینے کی مٹھائی بانٹ دوں گا۔ تاکہ سب کے علم میں آجائے۔ باقی تم تسلی سے اپنی پڑھائی کرو۔ یہاں میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔“

باورچی خانے میں کھڑی زہرہ کی آنکھوں میں خوشی و تشکر سے آنسو آ گئے۔ اسے اپنے باپ پر فخر ہوا..... وہ کتنے مدبر تھے۔ وہ سب ٹھیک کر سکتے تھے۔

”وہ کر لیں گے ان شاء اللہ۔“ اس کے دل سے سب ٹھیک ہو جانے کی دعا نکلی۔

فخر کو واپس جانا تھا۔ سیف اللہ نے اسے اور چاچی جی کو بطور خاص بلوایا۔

وہ اس گھر کے مالک تھے۔ اپنی بیٹی کی خوشیوں اور مستقبل کے ضامن.....

کرم جو سب کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا نکلا تھا۔ اب تک اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ اور بھائی عبداللہ..... چاچی اور فخر کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ہاتھ میں پکڑا گلاس پیچ کر گھر سے نکل گیا تھا۔

”زہرہ! چائے نہیں آئی اب تک۔“ سیف اللہ نے بطور خاص اسے پکارا۔

اپنی گھبراہٹ پر اسے حیرت تھی۔ چائے کی ٹرے میں کپ لرز رہے تھے۔ اس نے خود کو ڈپٹا سیف اللہ نے ذرا سا سرک کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

”بھائی باپ کی جگہ ہوتے ہیں۔ مگر باپ.....

باپ ہوتا ہے۔ بیک وقت روشن خیال، بیک وقت تنگ نظر۔“ اسے سب کے بیچ بلا لیا تھا۔ بٹھا لیا تھا۔ مگر بائیں جانب جگہ دی۔ دائیں جانب فخر کی کرسی

ماہنامہ خانا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

اکتوبر 2018 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

اکتوبر 2018 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ ”تم میرے پاس ہو“ روٹن بلال کا مکمل ناول،

☆ ”تیرے عشق نچایا“ سدرہ اعجاز کا مکمل ناول،

☆ ”محبت کا فسوں“ سونیا چوہدری کا مکمل ناول،

☆ ”میں وقصم“ بشری سیال کا ناولٹ،

☆ ”شہر دل کا راستہ“ تحسین اختر کا ناولٹ،

☆ ”اک نام تمہارا“ رابعہ افتخار کا ناولٹ،

☆ زرقا سکندر، تمثیلہ زاہد، فوزیہ سرور، فرحت انصاری

اور ساس گل کے افسانے،

☆ ام مریم اور نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناولوں کے

علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں،

اس کے علاوہ

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

تمام مستقل سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو

آپ پڑھنا چاہتے ہیں

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی

بک اسٹال سے طلب کریں

اکتوبر 2018

تھی۔ فخر پر نگاہ پڑی تو وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ زہرہ کے لیے مسکراہٹ چھپانا دو بھر ہونے لگا۔
سب الوداعی سلام کرنے لگے۔ وہ آپاں جی کے عقب میں کھڑی تھی۔ جب فخر نے فون کان سے لگالیا۔

”جی..... رات کو نکلوں گا..... اگر آپ آسکیں شام تک..... یا جب بھی موقع ملے، جی جی..... میں انتظار کروں گا۔ بہت شکریہ۔“

اس نے فون جیب میں رکھا اور بظاہر منڈیر پر بیٹھے کبوتروں کی جوڑی کو دیکھا۔

”اللہ..... کتنا چالاک ہے یہ۔“ زہرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کتنی ہوشیاری سے اسے ملنے کے لیے آنے کا کہہ دیا تھا اس نے..... زہرہ نے نظر بچا کرنفی میں سر ہلایا۔

یہ کوئی آسان تھا بھلا..... تو بہ..... تب فخر نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھایوں جوڑا جیسے چنگی بھر نمک مانگ رہا ہو۔ یہ دراصل انداز منت تھا۔

☆☆☆

”تجھے یقین ہے۔“ مدثر اور صدیق کے پوچھنے پر فیض بھنا گیا۔ ہاتھ میں رکھا کپ پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ ”رہنے دو تم لوگ..... میں خود ہی سب کچھ کر لوں گا۔ رات سے صبح ہو گئی۔ تم لوگوں کا شک ہی نہیں جاتا..... ناں مجھے یہ بتاؤ فخر کے علاوہ اور کون کہے گا میری زہرہ..... میری زہرہ۔“

”اویار..... تو بھی ناں۔“ صدیق نے اس کے شانوں پر دباؤ ڈال کر اسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ..... فخر ایسا منڈا لگتا نہیں ہے۔ رونی جیسے نرم ہاتھ ہیں اس کے..... ساری زندگی پنسل پکڑی..... مجھے نہیں لگتا اس نے کبھی چھری پکڑ کر مسواک بھی اتاری ہو دھریک سے۔“

اور یہ جو تیری گردن پر انگلوں (انگلیوں) کے نشان ہیں۔ تو دیکھ ذرا..... ایچ لگدا ہے رچھ نے گردن نپ لئی ہوئے (ایسا لگتا ہے رچھ نے گردن ناپ لی ہو)۔“

”اوبات جب غیرت شیرت پر آجائے ناں تو..... سب کا خون ابا لے کھانے لگتا ہے۔“ مدثر نے کہا۔ صدیق کا سر پر سوچ انداز میں ہلنے لگا۔ یہ بات تو دل کو لگتی تھی۔

”اب یہ بتا دے کرنا کیا ہے.....؟“ دونوں نے بالآخر فیض کی بات مان لی۔ یہ فخر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”یہ اب میں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ تم لوگوں کو نہیں پتا کہ کیا کرنا ہے؟“ فیض بات بات پر بھڑک رہا تھا۔

”سمجھ گئے۔“ صدیق نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر مدثر کو دیکھا۔ ”پھر کب؟“

”چوبیس گھنٹے کے اندر..... اندر۔“ مدثر نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”اس کے گھر میں صرف اس کی ماں ہوتی ہے ناں؟ اسے قابو کرنا مشکل نہیں ہوگا۔“

اس کا انداز رائے لیتا ہوا تھا۔ صدیق نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بائیں ابرو اچکا کر گردن دائیں کندھے پر ڈال دی۔

”پھر تو ہم تین کافی ہیں۔ کسی اور کی ضرورت نہیں۔“ مدثر کسی زریک سپہ سالار کی طرح ہر پہلو پر غور کر رہا تھا۔

”نہیں۔“ فیض نے یکدم بھڑکے انداز سے ٹوک دیا۔

”مجھے صرف فخر کو مزہ نہیں چکھانا..... زہرہ سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔“

”زہرہ!“ دونوں نے ایک ساتھ دہرایا۔

”اس نے کیا کیا؟“ فیض چونکا۔ اسے زہرہ کا اپنی طرف دیکھا تھوکتا یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

”منگنی مبارک ہو۔“ اس نے دبے قدموں آ کر اس کے پیچھے سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں

دیکھنے لگی۔
”تم نے مجھے مبارک باد نہیں دی۔“ وہ گمبھیر
لہجے میں بولا۔

”مبارک باد..... وہ چونکی کس چیز کی؟“
”میری منگنی کی بھئی۔“

”اوہ.....“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ایسے
تھوڑی ہوتی ہے منگنی۔“

”تو اور کیسے ہوتی ہے؟“ وہ لاعلم تھا۔

”رسم ہوتی ہے۔ انگوٹھی پہناتے ہیں۔ مٹھائی
کھلائی جاتی ہے۔“

”اوہ..... او!“ فخر نے ٹوک دیا۔

”تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ابھی کر لیتے
ہیں منگنی۔“

”ابھی..... وہ چونکی۔

”ابھی کیسے بھلا؟“

فخر نے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی جیب میں
ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹول رہا تھا۔ اوہ..... یہ آنٹی گلابی
رنگ کے کاغذ کی پڑیا سی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی۔ فخر نے اسے
کھول دیا۔ اندر سونے کی انگوٹھی تھی۔ جس پر پان
کے پتے کی شکل کا ننھا سا موتی لٹکا تھا۔ ”خ.....“

حیرت نے اس کی آواز گم کر دی۔
”ادھر دو اپنا ہاتھ.....“ اس نے خود ہی ہاتھ
بڑھا کر اس کا ہاتھ آگے کر لیا۔ ”اجازت ہے۔“
زہرہ کی آنکھیں جھللا اٹھیں۔ اس کا سر بچوں کی
طرح اوپر نیچے دو تین بار ایک ساتھ ہلا..... فخر اس
معصوم انداز پر دل کھول کر ہنس پڑا۔

”مٹھائی البتہ نہیں ہے..... تم کہو تو بھاگ کر
لے آؤ۔“ وہ شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اب تو درختوں سے آم بھی اتر گئے۔ ورنہ وہ
کھلا دیتا تمہیں۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔

”انگوٹھی پسند آئی؟“ اس کا جواب اثبات کے
سوا کیا ہو سکتا تھا۔

درختوں پر بیٹھی چڑیوں کی چچھاہٹ یکدم

پر رکھ کر کہا۔
”اوہ!“ زہرہ دل پر ہاتھ رکھ کر مڑی۔
”تم نے مجھے ڈرا دیا فخر..... توبہ۔“ اس کی
رنگت سپید پڑی ہوئی تھی۔ نیلی آنکھوں کا ہر اس بھی
معدوم نہیں ہوا۔ فخر نے بازو سینے پر لپیٹ لیے اور
اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

”میرے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“ وہ پوچھ
نہیں رہا تھا۔ اس کا انداز پر یقین تھا۔
”ہاں.....!“ وہ ہنس دی۔

”تمہارے علاوہ اور کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔“
اس کا انداز اعلانیہ تھا۔ فیصلہ کن..... بے فکر۔
”ہو تو..... میں اس کی جان نہ لے لوں۔“ یہ
بھی سوال نہیں تھا۔

”پہلے تو ایسا دعویٰ کبھی نہیں کیا؟“ وہ خوش گوار
حیرت میں گھر کر بولی۔

”پہلے حق نہیں تھا اس لیے۔“ اس کا انداز
واقعی آج استحقاق لیے ہوئے تھا۔

”اچھا!“ اس نے ڈھلکنے والے دوپٹے کو اپنے
گرد لپیٹا۔

”اب ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے سرشار ہو کر گردن اوپر اٹھا
کر درختوں کی گھنی شاخوں میں چھپی ان چڑیوں کو
تلاشنا چاہا جن کی چچھاہٹ نے اسے ملاقات کی
خوب صورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔

زہرہ نے اسے بغور دیکھا۔ اسے رات میں
لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ جہاں وہ ہاسٹل میں رہتا تھا۔
اس کی تیاری اس نے ابھی سے کر لی تھی۔ سیاہ پینٹ
پر میردن دھاری دار شرٹ میں وہ بہت شان دار لگ
رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تازہ شیوہ تھی۔ اور گھنے بال
ماتھے پر ڈھلک جاتے۔ جنہیں بار بار سنوارنا پڑتا
تھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے زہرہ کے جائزہ
کو محسوس کر لیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ جھینپ کر اپنے پیروں کو

بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جیسے سب مبارک باد دے رہی ہوں۔

☆☆☆

ناہید نے پھٹی آنکھوں سے کرم کو دیکھا۔ وہ کہاں سے آ گیا۔ اس کی سال بعد کی تاریخ یہ تھی کہ وہ جب جب گھر سے جھگڑ کر نکلتا۔ دس دس دن کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔

لیکن وہ تو آج تیسرے دن لوٹ آیا تھا، تن فن کرتا۔ دروازے کھڑکیاں مارتا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ شیم کی بے چین مامتا کو قرار مل گیا۔ وہ جھگڑ کر جاتا تھا تو اس کی سلامتی کے خیال سے شیم کی نیندیں اڑ جاتی تھیں۔

کل ہی وہ سیف اللہ کے سامنے جھگڑتے جھگڑتے بے بسی سے رو پڑی۔

”کر دیتے ناں آپ فری سے شادی..... دو بچے ہوتے تو سدھر جاتا..... پھر جتنا وہ فری کو چاہتا تھا۔ فری اسے سدھا لیتی۔“

سیف اللہ کے چڑے بھنچ گئے۔ (پھر وہی بات) کرم کی صحبت غلط تھی۔ دوستوں کو وہ قبلہ و کعبہ سمجھتا تھا۔ وہ سارے حربے آزما لینے کے بعد ہی مایوس ہوئے تھے۔

”اچھا تو پھر آپ زہرہ کا نہ کریں فخر سے.....“ وہ اس بات کو برداشت کر ہی نہ سکتا تھا۔

”فری تو چلو دوسرے کی بیٹی تھی۔ زہرہ اس کی اپنی بہن ہے۔ اس کے دوست اسے طعنے ماریں گے۔“

”پھر وہی دوست۔“ سیف اللہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے میں نہیں کرتا زہرہ کا فخر سے۔ تم کر دو جس سے دل چاہے زہرہ کا..... مگر وہ لڑکا پھر فخر سے بڑھ کر ہونے ہے کوئی اس کے جوڑ کا؟“ سیف اللہ نے بیوی کو لا جواب کر دیا۔ اس کے منہ اور دل سے ایک ساتھ ابھرا۔

”نہیں زہرہ کے لیے فخر سے بڑھ کر کوئی تھا ہی

نہیں۔“

ایک طرف بیٹے کی فکر..... دوسری طرف بیٹی کا مستقبل۔

سیف اللہ نے بڑی عجیب بات کہہ دی تھی کہ بیٹا بیٹی دونوں برابر کی ذمہ داری ہوتے ہیں لڑکا کسی بھی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر مولوی کے سامنے بیٹھ سکتا ہے۔ لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں۔ شریف لڑکیاں مولوی کے سامنے بیٹھنے کے لیے باپ بھائی کی محتاج ہوتی ہیں۔ وہ بیٹی کی شادی والے دن وہ خوشی منائیں گے۔ جو لوگ بیٹوں کے بیاہ پر بھی نہیں رچاتے ہوں گے۔ شیم شوہر کی سوچ پر اس اش کہ اٹھی۔ دوسری طرف..... اس نے سوچا۔

رشتہ طے ہونے کی بات سن کر زہرہ کے لیے پیغام آنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ شادی کے لیے سیف اللہ نے فخر کی پڑھائی اور نوکری کا ٹارگٹ رکھا تھا۔ اور اس میں ابھی بہت وقت تھا۔ اتنے عرصے میں وہ کرم کو سمجھا لیتی۔ اس کی شادی کر دیتی تو بھی اسے کچھ قرار مل جاتا۔

وہ بے تابانہ آگے بڑھ کر کرم کو گلے لگا کر ماتھا چوم کر خوش آمدید کہنا چاہتی تھی۔ مگر تب ہی ناہید کے فتنے کے چہرے پر نظر پڑ گئی۔

”اسے کیا ہوا؟“ وہ زہرہ کو آوازیں دے رہا تھا۔

”اوہ.....“ شیم کو ناہید کی حواس باختگی سمجھ میں آ گئی۔ ”تو کیا زہرہ گھر پر نہیں تھی۔ تو کہاں تھی.....“ یہی سوچ کرم کے دماغ میں بھی آئی۔ وہ دہشت گردوں کے ٹھکانے پر حملہ کر دینے والے فوجی جوان کی طرح گھر کے ایک ایک دروازے کو ٹھوکروں سے کھول رہا تھا۔ ہر خالی کمرہ اس کے شک کی تصدیق کرتا تھا۔

زہرہ نہیں تھی۔

”کیا ہوا کرم..... کیسے ڈھونڈ رہا ہے؟“ شیم اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

”نہیں چھوڑوں گا۔ آج دونوں کو نہیں

چھوڑوں گا۔“
 ”نہیں کرم..... زہرہ تو..... تو وہ... دو کیشنل
 سینٹر..... نہیں نادیہ کے گھر ہے۔“
 ”دو کیشنل سینٹر رات کے وقت میرا باپ کھولتا
 ہے کیا۔“

اس کی دھاڑ سن کر آپاں جی کمرے سے ہی کیا
 ہوا..... کیا ہوا کی صدا میں لگا رہی تھیں۔
 ”ویڑہ خالی کر کے منجیاں (چار پائیاں) ڈال
 دے مائی!“ اس نے کانپتی کام والی کو کہا۔ ”آج مر
 کے آؤں گا یا مار کے.....“
 ”نہیں کرم..... کرم!“ ناہید پیچھے بھاگی۔ شمیم
 سے بھاگا بھی نہ گیا۔ گھٹنوں کے بل دھڑام سے گر
 گئی۔

”اپنے ابا جی کو فون کرنا ہے..... ہائے کوئی
 جائے۔ اوئے میرے ربا..... میری زہرہ۔“

☆☆☆

”اب میں تمہیں گھیر تک چھوڑ سکتا ہوں۔ اس
 لیے رخصت طلب کر رہی تھی۔“ تو وہ شوخ ہو گیا۔
 ”اب.....!“ اس نے مصنوعی خفگی سے اسے
 گھورا۔ ”اب کیا ہو گیا ہے؟“

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ آنکھ کے اشارے
 سے اس کی انگلی میں موجود انگلی کو دیکھا۔ وہ کھلکھلا
 کر ہنس دی۔

”ابھی صرف مٹھائی ونڈی گئی ہے۔ (بانٹی گئی
 ہے) ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پنڈ کی گلیوں میں تو
 میاں بیوی بھی نہیں گھومتے۔“ وہ اسے چڑا رہی تھی۔
 جبکہ وہ حیران ہو گیا۔ سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

”کیوں.....؟“

وہ پھر سے چپھائی۔ ”شودے لگتے ہیں۔ ہی
 ہی ہی۔“

”اوہو..... تمہارا ہاتھ ہوگا تو مجھے شودا (بھوکا،
 ندیدہ) کہلانے میں کوئی عار نہیں۔“ وہ زور سے ہنسا
 تھا۔

وہ بے نیازی دکھانے کو اس سے آئے چلنے

لگی۔ تب ہی اس کا ہاتھ پیچھے سے کھینچا گیا۔ وہ
 حیران ہوئی۔ فخر ایسے حق نہیں جتنا تھا۔ گرفت میں
 جارحیت سی تھی۔ اس کے مڑنے سے پہلے ایک چیخ
 ابھری۔ وہ مڑ نہ سکی۔ کسی نے اسے درخت کے پیچھے
 گھسیٹ لیا تھا۔ چیخ فخر کی تھی۔ کسی نے اس کے سر پر
 ڈنڈا مارا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ آنے
 والا فخر پر بھیڑے کی طرح پل پڑا تھا۔

وہ کیسے چیختی یا فخر تک پہنچتی۔ اس کا منہ سخت
 ہاتھ سے دبایا گیا تھا۔ وہ پھڑپھڑا رہی تھی مگر آزاد
 نہیں ہو سکتی تھی۔ مارنے والا ایک نہیں تھا۔ وہ دو
 تھے..... یا تین..... یا..... وہ سوچ نہ سکی۔ جو جان
 کے دشمن لگ رہے تھے۔

ان میں اسے جکڑنے والا عزت کا دشمن بن
 گیا۔ زہرہ کا دو پٹا دور اس کے اپنے پیروں میں جا
 گرا۔ اس کی قمیض کا ٹکڑا پہلے شانے کے پاس سے
 اڑا..... پھر چاک اور پر کو چر گیا۔

یہ فلم نہیں تھی کہ فخر شیر کی طرح دھاڑتا ہوا یکدم
 اٹھتا اور سب کو چیر پھاڑ دیتا۔ یہ حقیقت تھی اور آنے
 والوں نے اسے خون اور مٹی میں (لتھڑ جانا) بھیڑ
 دیا تھا۔

ادھر زہرہ جسمانی طور پر جنبش سے بھی قاصر
 تھی۔ مگر اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس
 نے اپنے منہ سے لگے ہاتھ پر پوری طاقت سے
 کاٹ لیا۔ وہ نکل بھاگی۔ فخر سے جا پٹی۔ مارنے
 والوں کے ہاتھ رک گئے اور دوسرے ہاتھ سے
 ڈھاٹا بردار کا ڈھاٹا کھینچنے کی کوشش کی۔

ادھر جو ہاتھ کی تکلیف سے دہرا ہو گیا تھا۔
 ہاتھ جھٹکتا خونخوار کتے کی طرح ان کی طرف بڑھ
 آیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے دھونے کا تھپا
 (ڈنڈا) تھا۔ زہرہ نے فخر کا سر اپنے سینے میں چھپا لیا۔
 مارنے والے کی زہرہ سے دشمنی نہیں تھی۔ اس نے
 ڈنڈا پوری طاقت سے فخر کے گھٹنے پر دے مارا۔ فخر کی
 چیخ میں زہرہ کی چیخیں شامل ہو گئیں۔ مگر کسی کے کان
 تک نہ پہنچیں مگر نہیں..... بھا بھی نے کہا تھا۔ ستو

جاگ بھی جاتا ہے۔ وہ جاگ گیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے حیرت سے اپنے مالک فخر کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ڈھانٹا برداروں پر جمپ لگائی تھی۔

زہرہ پر حملہ کرنے والا..... دوسری جانب تھا۔ اس نے کتے کی ریڑھ کی ہڈی پر ڈنڈا مارا وہ ایسے بلبلا یا اور گرا کہ ٹانگیں آسمان کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ اتنی مہلت کافی تھی انہیں بھاگنے کے لیے۔ زہرہ نے چاہا وہ ان کے پیچھے جائے۔ ایک بار ڈھانٹا کھل جاتا تو وہ کسی ایک کی صورت دیکھ لے مگر..... تب ہی اسے فخر کے ڈھیلے وجود کا احساس ہوا۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ زہرہ کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو اس کا سر ایسے زمین سے ٹکرایا جیسے جوڑ کھل گیا ہو۔ سر الگ..... دھڑا لگ..... ”فخر.....“ زہرہ کی چیخ..... اور پھر چیخیں..... سوتوں کو جگا گئیں۔

گاؤں والے جب پہنچے..... تب، تب۔ ”ایسا کرتے ہیں نانی کی دکان پر چلتے ہیں یا پھر..... چوپال میں..... دیوار پر چڑھ کر باتیں کرنی عورتوں کی سن لیتے ہیں۔ یا پھر سب کو چھوڑیں تھانے چلتے ہیں۔ جہاں چشم دید گواہ بیان لکھوار ہے تھے۔

☆☆☆

”انسپکٹر صاب..... سب سے پہلے میں تے میرا پتر وقوع تے پونچے..... تے گئی دیکھا نہ پوچھو۔“ (انسپکٹر صاحب سب سے پہلے میں اور میرا بیٹا جائے وقوع پر پہنچے اور کیا دیکھا پوچھے ہی مت) عینی شاہد نے جھرجھری لی۔ اس کے انداز میں خوف کا عنصر تھا یا وہ اس شرم ناک منظر کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ محرر نے دونوں کیفیات لکھیں۔

”اوئے نہ پوچھو کے رشتے دار..... تجھے پھر ہم نے ادھر گوٹیاں کھیلنے کے لیے بلایا ہے جو جو دیکھا۔ لکھوا نہ پوچھو والی بات سوچی بھی ناں..... صاب جو بھی پوچھیں گے۔ بتانا ہوگا مجھے۔“ ”حاضر جناب..... کڑی منڈا اک دو بے

نال زمین تے پئے سی..... کول ہی ستو پیاسی..... تے مرن والا سی..... بعد چے مروی گیا۔ توواں نوں تے پتا اے۔ تے اتناں تناں دے سرتے کھلوتا سی کرم۔ (لڑکا لڑکی ساتھ زمین پر پڑے تھے۔ پاس ہی ستو پڑا تھا اور مرنے والا تھا۔ بعد میں مر بھی گیا آپ کو تو پتا ہے اور ان تینوں کے سر پر کھڑا تھا کرم) ”ہاں جی..... اپنی ماں سے اور بھر جائی سے کہہ کر نکلا تھا۔ آج مر کے آؤں گا یا زہرہ اور فخر کو مار کے آؤں گا۔ ادیاں اکھاں بے خون اترے یا لہو پاسی۔“

(اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا) ”میں ڈنگراں لئے پٹھے وڈریا سی..... میں دیکھا کرم سجدہ ہو یا باگ وچ وڈریا اے۔“

(میں جانوروں کے لیے چارا کاٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، کرم بھاگتا ہوا باغ میں گھسا ہے) دوسری طرف نانی کی دکان پر سب کا موضوع بحث اخبار کی جلی حروف کی سرخی تھی۔ سب لوگ کرم کو غیرت مند کہہ رہے تھے۔ کون بھائی بے غیرتی کے ایسے مظاہرے کو برداشت کر سکتا تھا۔

”سنا ہے بڑی سوہنی ہے سیف اللہ کی بیٹی۔“ بعض نے تصدیقی انداز سے سر ہلایا۔ تو نہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے رشک و حسد ٹپکنے لگا۔ رات تو بے پروٹیاں بنانے والی عورتیں اس قصے میں ایسی مگن ہوئیں کہ جب گھر پہنچیں تو بھوکے بچے سوئی کے انتظار میں کب کے رو دھوکے سو چکے تھے۔

صبح سب نے جلدی جلدی بکھیرے سمیٹے اور جگہ جگہ جمع ہو کر اسی قصے کو لے کر بیٹھ گئیں۔ رات سے صبح تک قصے میں رنگینی اور سنگینی کے اتنے پھند نے لگ چکے تھے کہ یہ حادثہ کم کسی فلم کا آنکھوں دیکھا حال بن گیا۔ غیرت بھائی کی..... یا پھر عشق با بے شرمی اور جس کے کونے میں چھوٹا سا نوٹ صرف بالغان کے لیے۔

انسپکٹر صاحب کے اشارے پر بیانات لینے کا سلسلہ موقوف کر کے سب کو گھروں کو بھیجا۔ پھر اپنے

سے چھوٹے افسر سے مخاطب ہوا۔
”دیے مجھے بھی یہ غیرت و یرت کا معاملہ لگتا ہے۔“

”اچھی بات یہ ہے کہ کرم موقع واردات سے پکڑ لیا ہم نے..... بھاگا نہیں وہ۔“
”غیرت والے معاملے میں کوئی نہیں بھاگتا۔ سب کو پتا ہوتا ہے سچ جانا ہے۔“ انسپکٹر نے بے پردائی سے کہا۔
”مگر جی..... عجیب بات ہے ایک..... جو نیر کی رات سے سوئی وہیں انکی تھی۔“

”وہ کیا.....“
”یہ جو بھی بھائی ایسے قتل شمل کرتے ہیں وہ سینہ تان کر کہتے ہیں ہم نے کیا ہے۔ یہ کہتا ہے اس نے کچھ نہیں کیا۔“

”ہاں..... سوچنے کی بات تو ہے۔“
”چلو دیکھتے ہیں۔ لڑکے کی چوٹیں سیریس ہیں۔ لڑکی کو آجائے گا ہوش۔ عشق معشوقی کے معاملے میں لڑکیاں لحاظ نہیں کرتیں۔ دیکھ لینا صاف کہہ دے گی بھائی نے ہی مارا ہے۔“
انسپکٹر تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکا تھا۔ بات اب ہوش آنے تک رک گئی۔

☆☆☆

”کرم نہیں تھا۔“ زہرہ کی آنکھوں میں سوال کے لیے بے یقینی تھی۔ اس کا جواب یقین سے بھرپور تھا۔ انسپکٹر اور جو نیر نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کا تجربہ فیل نہیں ہو سکتا۔

”کرم نہیں تھا تو پھر کون تھا لڑکی؟“ اس نے ڈپٹ کر کہا اور اپنی عقاب آنکھیں اس کی آنکھوں پر گاڑ دیں..... زہرہ کی پلکوں پر نمی چمکی اور حلق میں آنسو اٹکے۔

”وہ..... فیض تھا۔“

”اب یہ فیض کون ہے؟“ انسپکٹر نے جو نیر کو دیکھا۔

”ابھی پتا لگاتا ہوں جی۔“

”بات سن لڑکی..... ہم ابھی پتا کر لیتے ہیں اس فیض بے فیض کا..... لیکن بھائی کو بچانے کے لیے تم ایسے ہی کسی کا نام نہیں لے سکتیں۔ ثبوت چاہیے ثبوت۔“

زہرہ کی نیلی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے شدت کرب سے ہونٹ کا کونا کچلا۔ دونوں افسران نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ ابھی نجاب نے اور کتنے نام سامنے آئیں۔ وہ دونوں ایک ہی سچ پر سوچ رہے تھے۔

جب وہ قلم بند کر کے جیب میں ٹکا رہا تھا۔ زہرہ کی نحیف آواز گونجی۔

”ثبوت ڈھونڈنا تو آپ کا کام ہے سرجی.....؟“
لڑکی نیل و نیل تھی۔ مگر اس کی نیلی آنکھوں میں اعتماد کی چمک ابھری تھی۔

”فیض کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ ڈاکٹر نے زیادہ بات کرنے سے منع کیا تھا۔ مگر لڑکی کے جتاتے جملے نے انسپکٹر کو مجبور کر دیا۔

”فیض..... زہرہ نے زیر لب دہرایا۔ وہ کہاں سے شروع کرے۔ خیالات کو مجتمع کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں تشکیک تھی۔ اب نجاب نے لڑکی کوں سی سچی جھوٹی کہانی سنائی۔ یکدم وہ پھڑپھڑائی۔ جیسے ڈرپ میں گلو کوڑ کی جگہ بجلی دوڑادی گئی ہو۔

”کیا ہوا؟“ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”وہ..... فیض..... میں نے اس کے ہاتھ پر کاٹا تھا۔ ادھر یہاں..... اس کی بوٹی ادھیڑ دی تھی..... میں نے..... میں۔“

”اوہ.....!“ دونوں افسران کے چہرے جگمگا اٹھے۔ اتنا سیدھا کیس۔

”بہت خوب۔“ تب ہی دروازہ کھلا۔ ایک پولیس اہلکار نے اندر آ کر ایک نظر زہرہ کو دیکھا پھر۔ انسپکٹر کے کان میں سرگوشی کی۔

اوہ..... ان اللہ..... وان الیہ راجعون۔

زہرہ نے اس کے لبوں کی جنبش سمجھ لی۔ اس نے چیخ ماری۔ فخر!“ اور پھر سے بے ہوش ہو گئی۔

اس نے استہزائیہ انداز میں انگشت شہادت اس کی سمت اٹھائی۔ پھر دھپ سے منجی پر اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔

”اس کے کوئی پچھلے نہیں ہیں۔ اس کا صرف اگلا ہے اور وہ ہوں میں..... میرے علاوہ اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ ہے ناں صحیح کہہ رہا ہوں ناں میں..... بول ناں بولتی کیوں نہیں۔“ اسے لطف آ گیا تھا۔

”تو..... تو اس سے بہت محبت ہونے کا کہتا تھا۔ جن سے محبت کرتے ہیں ان کو لوگ پھولوں کی چھڑی بھی نہیں لگاتے اور تو نے اسے نوچ کھایا۔“

”تو اسے میرے خلاف بھڑکا نہیں سکتی۔“ آگ بگولا ہو گیا۔

”نکل جا میرے کمرے سے..... چلی یہاں سے۔“ اس نے صرف کہا نہیں..... ماں کو دھکیل بھی دیا۔

”تو میری ماں کے آگے میری برائیاں کر رہی تھی۔“ اس نے اسے بٹھایا۔

”نہیں.....“ اس نے سہمے انداز سے اپنے پیر سمیٹے۔

”نہیں اگر کر بھی رہی تھی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بڑھی ہے زیادہ سے زیادہ شور ڈال دے گی اور کیا کر سکتی ہے بھلا..... ہیں؟“

”ہاں.....!“ وہ تائید کا خواہاں تھا۔ اتنا تو وہ اسے جان چکی تھی۔

”ایک بات یاد رکھ تیرے پیچھے اب کوئی دروازہ نہیں کھلے گا۔“

پتا ہے میں نے ایک بات سوچی ہے۔ مرنا سب نے ہے..... ہے ناں؟..... ہاں تو میں نے طے کیا ہے کہ میں اللہ سے کہوں گا پہلے تیری موت آئے۔ میں اپنے ہاتھوں تجھے قبر میں اتاروں۔

ناں ناں..... غلط نہ سمجھنا..... بھلے اس کے اگلے منٹ میرا ساہ بھی نکل جائے۔ مگر میں یہ

”تو نے یہ سب کیوں سہا میری کملی دھیے.....“

ساس نے اسے یوں لپٹا لیا جیسے کوکھ سے جنی ہو۔

”پھر اور کیا کرتی.....؟“ اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔ اس نے اپنے تئیں ساس کو لا جواب کر دیا تھا۔

”میں.....“ ساس کے لب باہم پیوست ہو گئے۔ ”میں تیری ماں ہوں۔“

”ماں.....!“ اس کے کانوں میں رس گھلا۔

ماں!“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ایسے لگا جیسے سسکی بھری ہو۔

ہاں ایک ماں بھی ہوتی ہے۔ دنیا میں آنے والے ہر جاندار کی ہوتی ہے۔ اس کی بھی تھی.....

ہاہ..... اس کا دل لرزا۔

”تھی کیوں..... ہے، اللہ اسے سلامت رکھے۔“ مگر کیا وہ ماں کو یہ سب بتا سکتی تھی یا دکھا سکتی تھی۔ جو آج ساس نے دیکھ لیا۔

اس کی ماں تو پہلے ہی اس کے غم سے ادھ موئی ہو چکی تھی۔

”اب تو کب تک میری منجی پر چڑھ کر بیٹھی رہے گی۔ جا..... جا کر سو مجھے نیند آ رہی ہے۔“

بیٹے کے بدلحاظ جملے پر ماں نے گھٹنے پر ٹکاتی ٹھوڑی اٹھائی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بہو کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا۔

وہ انگڑائی لے رہا تھا اور جمائی لیتے ہوئے حلق کا کو اتک دکھائی دینے لگا۔ وہ نگاہیں چرا رہا تھا۔

”لاوارث نہیں تھی یہ بے غیرت انسان!“

اس کی ماں پل پڑنے کے ارادے سے کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا مطلب.....؟“ اس نے ماں کو گھورا۔

”اگر جو اس کے پیچھے اس کا یہ حال دیکھ لیں تو..... تجھے مزہ چکھا دیں۔“ اس نے دانت پیسے۔

”مزہ.....“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”اور وہ بھی اس کے پیچھے..... ہا ہا ہا..... واہ، واہ، واہ اس کے

برداشت نہیں کر سکتا کہ میں مر جاؤں اور تو کلی رہ جائے۔ کیسا؟“ وہ داد چاہتا تھا۔ ”ویسے بھی میرے علاوہ تیرا ہے ہی کون.....؟“

”تیرا اور کوئی نہیں ہے..... یاد رکھ..... ہے ناں؟“ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی سیدھی کر لی اور اس پر مسلسل تالی بجانے لگا۔

”ویسے آپس کی بات ہے تو سوچتی تو ہوگی۔ ایسے ہی خواب دیکھتی ہوگی۔ یا چلو دعا ہی مانگی ہوگی۔“ اس کا انداز دوستانہ ہو گیا۔

”ہم آگئے ہیں تجھے لینے۔ دروازہ کھول۔“

”نہیں.....“ اس نے سچ کہا۔

”اب مجھ سے چھپا رہی ہے۔ میں نے کون سا تجھے کھا جانا ہے۔ بتانا..... دیکھتی ہے ناں ایسے خواب.....“

”نہیں دیکھتی۔“ بازو مڑنے کی تکلیف سے وہ دہری ہو گئی۔

”اچھا چل خیر.....“ اس نے یکدم بازو چھوڑ دیا۔

”دیکھتی بھی ہے تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے اس کی ٹھوڑی دبوچی..... اور دباؤ بڑھانے لگا۔

”کون سا کسی نے آ جانا ہے۔“

”آں..... آں آواز نہ نکالیں۔“

دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ساس نے بے تابانہ دروازہ بجایا۔

”نہ کر..... اس کی حالت تو دیکھ..... ہائے عالم.....!“ اب اندر سے کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔

بہو سانس گھوٹ کر رونے کے فن میں طاق ہو چکی تھی۔ ایک گھر..... دو کمروں کے بیچ پتلی سی دیوار..... درزوں والا دروازہ..... اور کیسی حیرت تھی کہ وہ بے خبر تھی۔

☆☆☆

حمیدہ نے عاشق حسین کے اضطراب کو دیکھا۔ اپنے گھر کو..... وہی بدرنگی دیواریں..... کمرے والی دیوار پر نئی تھی اور کانی (پھپھوندی) کی سبز تہہ اوپر چڑھ چکی تھی۔ باقی کی دو دیواروں پر چولے کے دھوئیں نے سیاہی پھیر رکھی تھی۔ پیچھے بنے کمروں پر بھی اجاڑ پڑا تھا۔ اس گھر کو وہ ہاتھ میسر ہی نہ ہوئے جو اسے سجاتے سنوارتے، ننگی کرسیاں..... ننگی چارپائیاں اور میزیں۔

اس کا دل بھر آیا۔ جیسے ہلکی آنچ پر ابلتا دودھ بھی اوپر آ جاتا ہے..... یا پھر جل جاتا ہے۔ اس نے اپنی بھر جانے والی آنکھ کو جھپکا۔

اسے بیٹے کو مخاطب کرنے سے ڈر لگا۔ سمجھانا تو خیر ناممکن تھا۔

اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔ کل شانے پر دروازے کا کونا لگ گیا تھا۔ بوڑھی ہڈیوں میں اب برداشت کی سکت کہناں رہی تھی۔ نہ جسمانی چوٹ..... اور نہ ذہنی۔

ایسا لگتا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر ارادہ بدل دیتا۔ حمیدہ سے اس کی ادھیڑ بن چھپی نہیں تھی۔ مگر وہ پوچھتی تو پھاڑ کھانے کو دوڑتا۔ ایک آدھ بار وہ یوں اٹھا کہ تیزی سے کہیں جانا چاہتا ہو۔ پھر دروازے ہی سے پلٹ آیا۔ ایک بار اس نے گلی میں بھی جھانکا۔ جیسے کسی کی آمد کی توقع کر رہا ہو۔

اچانک مسجد سے آواز ابھری۔ یہ اذان کا وقت تو نہیں تھا۔ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔ اعلان ہو رہا تھا۔ اللہ خیر..... اس کا پورا وجود کان ہو گیا۔ مگر عاشق نے زور زور سے کھانا شروع کر دیا۔ کسی کے انتقال کی خبر تھی۔ وہ نام نہیں سن سکی۔

اعلان دوبارہ دہرایا جانے لگا۔ عاشق یکدم کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے موبائل میں ریڈیو لگا لیا اور تیزی سے چینل بدلنے لگا۔ اعلان ختم ہوا تو اس نے بھی ریڈیو بند کر دیا۔ جیسے اسے اعلان سننا ہی نہ تھا۔ حمیدہ نے افسردہ اور ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور دکھتے بدن کو سنبھالتی نیچے جھک کر جوتی

دیکھنے لگی۔ خود ہی پتا کرنا پڑے گا۔ اس نے عاشق کو چونکتا ہوا دیکھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ عاشق حسین لپکا۔ حمیدہ کو خیال آیا وہ تو نچانے کب سے چوکیدار بنا بیٹھا تھا۔ دستک میں عجلت تھی۔ عاشق کے پہنچنے سے پہلے آواز اندر آ گئی اور سارے گھر میں گرد کی طرح گھس کر بیٹھ گئی۔ وہ گرد جو سانس کھوٹ دے اور آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگے۔

”بھین حمیدہ..... حمیدہ بھین..... اندر وڑ کے بے گئی ہے۔ بار آ۔ (اندر گھس کے بیٹھ گئی ہے باہر آ۔)

بھائی سیف اللہ کی بیوی شمیم فوت ہو گئی ہے۔ جنازہ تیار ہو گیا۔ تیری تورشتے داری ہے۔ ایسی بھی کیا ناراضی..... ہیں گلے شکوے زندگی دے نال ہوندے نہیں..... دروازہ تو کھول۔“

عاشق حسین کے کندھی میں دھرنے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ پٹ والا دروازہ وا ہو گیا۔ پڑوسن ماسی اندر گھس آئی۔ ایک ملاستی نگاہ عاشق حسین پر ڈالی۔ اور دوسری حمیدہ پر جس کا رنگ صدمے و بے یقینی سے سفید پڑ گیا تھا۔ ایک ہاتھ سینے پر جما ہوا تھا۔ جیسے موت کے فرشتے کی آواز سن لی ہو۔

”تینوں سب سے پہلے جانا چائی داسی.....“ وہ ملامت کر رہی تھی۔

”مینوں نہیں پتا لکيا۔“ حمیدہ کی آواز کنوئیں سے نکلی۔ اچھا تو یہ تھا وہ اضطراب۔ اس نے عاشق کو دیکھا۔ وہ اسے اس خبر سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔

”ہن تے پتا لگ گیا ناں..... چل چھیتی آ..... جنازے داتے صرف منہ ہی ہوندا اے۔ (جنازے کا تو صرف منہ ہی ہوتا ہے)“

”ہاں!“ حمیدہ بدقت کہہ سکی۔ اس کے ذہن و دل میں خیالات کی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ فوری طور پر کیسا رد عمل دے۔

”اور وہ کدھر اے..... تیری نوں..... بلا

اونوں..... وچاری دی ماں مری ہے۔ کوئی چھوٹی گل اے پلا (تمہاری بہو..... بلا واسے۔ بے چاری کی ماں مری ہے۔ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے)۔“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ حمیدہ کی بہو اندرونی کمرے سے نکل آئی تھی۔ جیسے سرد خانے میں دفن کے انتظار کی اذیت جھیلتا مردہ۔

”یہ نہیں جائے گی۔“ حمیدہ کے بیٹے۔ وحشت زدہ لہجے میں اعلان کیا۔

”کوئی نہیں جائے گا۔“

”او تو پاغل تے نہیں ہو گیا عاشق حسین..... کیوں نہیں جائے گی۔“

اودھیاں دے ویناں نال تے ماں پیو دے جنازے سجدے نہیں..... ظالما (ارے بیٹوں کے بینوں (بین) ہی سے تو ماں باپ کے جنازے سجتے ہیں۔ ظالم)

”نہیں۔“ وہ دونوں بازو پھیلا کر زہرہ کے سامنے حائل ہو گیا۔

”یہ نہیں جائے گی۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔ سارے پنڈ کے سامنے اس کے بھائی نے کہا تھا۔“

”آج سے اس کا کوئی نہیں..... تو جاماسی..... جا۔“

وہ اسی طرح ہاتھ پھیلائے ماسی کو باہر کی سمت دھکیلنے لگا۔

مگر تب ہی عاشق نے زہرہ کو اپنے پاس۔۔۔۔۔ بھاگ کر ماسی کا ہاتھ پکڑتے دیکھا۔

میں جاؤں گی ماسی..... مجھے ساتھ چل..... اس کا ارادہ مصمم اور لہجہ گھگھایا ہوا تھا۔ اس نے گرا ہوا پلو سر پر شہر لیا۔ وہ ننگے پیر نکلنے کو تھی۔

جب عاشق کی وحشی پکڑ نے اسے لٹو کی طرح گھما کر صحن کے بیچ میں چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی اس نے ماسی کو دھکا لگ جانے کا خیال کیے بغیر دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ مگر زہرہ ایک بار پھر دروازے کی سمت لپکی۔

”مجھے جانا ہے۔ ماسی!“ وہ صدائیں دینے

”مجھے ساتھ لے کر جا..... ماسی..... کی کی ی۔“
 لگی۔ ”بھر کے اس ساتھ میں اس نے بھی صدا
 بلند نہیں کی تھی اور کہاں وہ عاشق کی حکم عدولی کرنے
 جارہی تھی۔ عاشق کے پھڑنے اس کا منہ گھما دیا۔
 زہرہ کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں.....
 اس نے اسے ہر طرح کی اذیتیں دی تھیں۔ مگر ایسے
 ہاتھ بھی نہ اٹھایا تھا۔ پھر وہ اسے گھسیٹتا کمرے کے
 اندر لے جانے لگا۔ یہاں عاشق کے لیے مقام
 حیرت تھا۔
 وہ ظلم و حکم خاموشی سے سہتی تھی۔ آج اسے کیا
 ہو گیا تھا۔ پانی بھرے روئی کے گھڑ کی طرح زمین
 پر پڑی تھی۔

”امی..... امی..... مجھے جانا ہے۔“ اس کے
 اندر پارہ بھر گیا تھا کیا..... عاشق نے اس کے ہاتھ
 چھوڑ دیے۔ اسے بالوں سے گھسیٹ کر اندر لے
 جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔
 ”آخر یہ اتھرو (آنسو) رکتے کیوں نہیں؟“ وہ
 چلایا اور اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

زہرہ نے اپنی نیلی (جو کبھی ہوا کرتی تھیں،
 اب تو ایک گدلا سارنگ تھا) آنکھیں عاشق کی
 آنکھوں میں ڈال دیں اور جھٹکے سے بازو چھڑوایا۔
 ”ماں مری ہے میری۔“ اس کا کلیجہ پھٹ گیا
 یہ چار لفظ کہنے میں..... جب کہ عاشق انتہائی حیرت
 سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

ایسی دودو تو وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ فقط
 تنہی نظر ڈالتا تھا اور اس کے حواس کم ہو جاتے
 تھے۔ ماں کے مرنے سے تو اسے دینا چاہیے تھا، وہ
 شیر ہو گئی تھی۔

اس نے سر پر ہاتھ مار مار کے رونا شروع
 کر دیا۔ وہ اپنی ماں کو پکار رہی تھی اور باپ کو۔ اس
 کے بین سمع فراش تھے۔ پتھروں کا کلیجہ شق ہو جانے
 مگر سامنے عاشق حسین تھا۔ چلور وہی تو رہی ہے، خود
 غم تھک کر چپ کر جائے گی۔ ویسے بھی ان آوازوں
 سے کون سا وہ لوٹ آتے۔

”کرم..... ہائے کرم..... میرے بھائی.....
 ساڈی ماں مر گئی، کرم تو کدھر ہے۔ ایک تو بد نصیب،
 ایک میں..... ہائے کرم تو کتھے ہیں۔ آ جا..... میرا
 ویرا.....“

اس نے اپنے پیٹ میں مٹھیاں دبائیں اور
 ایسے چیخی کہ درود یوار ہل گئے۔ عاشق کے سر پر بھی
 ہتھوڑا برسسا، وہ کرم کو بلارہی تھی، اس کرم کو جس نے
 ایک دن عاشق حسین کو راستے میں پکڑ کر ”میری بہن
 کا نام لیتا ہے“ کا عنوان باندھ کر اتنا مارا تھا کہ وہ
 دنوں پانی کا گھونٹ بھرنے کے لیے بھی منہ نہیں کھول
 پاتا تھا اور وہ کرم جو ابھی.....

اس نے یک دم زہرہ کی ٹھوڑی دبوچ لی۔
 ”وہ نہیں آئے گا۔ تو لوڈ اسپیکر (لاؤڈ اسپیکر)
 پر چڑھ کے بھی آوازیں مارے تب بھی..... اسے
 نہیں چھوڑیں گے جیلر صاحب۔ کسی کے مرنے پر
 اسے چھٹی نہیں ملنی، بھلے ماں مرے یا پیو۔ ہاں خود
 مر جائے تو باہر آ سکتا ہے، تو دعا کر اسے موت
 آ جائے..... ہیں.....“

اسے لطف آ گیا جب کہ زہرہ کی انتڑیاں
 چرخی سے بندھ کر باہر کو کھینچ گئیں گویا.....
 ”اللہ نہ کرے، میری عمر لگ جائے اسے۔
 میں.....“

”اے، اے۔“ عاشق نے اس کے شانے
 تھام لیے۔

”مرنے کی بات نہ کرنا، تیری عمر کیوں لگے
 اسے، میں تجھ سے بہت محبت کرتا ہوں زورا! ناں
 ناں..... غلطی سے موت کا ناں..... نالینا۔“ اس نے
 اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”بھائی ہے وہ میرا۔“ وہ تڑپ کر چلائی تھی۔
 ”میری ہر سانس اس کے لیے دعا کرتی ہے۔ دیکھ
 لینا ایک دن وہ آزاد ہو کر آ جائے گا۔“ عاشق کا چہرہ
 پھیکا پڑ گیا۔ وہ آج بھی بھائی کو بے قصور سمجھتی تھی
 جب کہ.....

”سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں، قتل کیا

ہے، قتل کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“ تیز تیز بولتے ہوئے عاشق کی آنکھ پھڑکنے لگی تھی۔
 ”اگلے (مقتول کے وارث) اسے کبھی معاف نہیں کریں گے، کبھی باہر نہیں آنے دیں گے اور..... ویسے بھی.....“ اس کی باچھوں سے تھوک نکلا، جسے اس نے عجلت بھرے انداز سے انگلی و انگوٹھے سے صاف کیا۔

”وہ جیل سے آ بھی جائے، تو..... کون سا تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ہیں؟ تھوکے گا بھی نہیں تجھ پر بلکہ ایک فائر تجھ پر بھی.....“ اس نے اس کے سینے پر شہادت کی انگلی ٹھوکی۔

”ایک بات یاد رکھ، تو نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنا ہے۔ تجھے میرے علاوہ اور کسی نے نہیں رکھنا، یہ میرا جگرا تھا جس نے تجھ جیسی کو اپنا نام دیا ورنہ باقیوں نے تو..... یاد ہے ناں؟“

”میں کچھ نہیں بھولی عاشق حسین۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”قسم اللہ کی، مگر اس وقت مجھے جانے دے، میری ماں.....“ اس کے حلق میں آنسو اٹک گئے۔
 ”نہیں.....“ وہ قطعیت سے بولتے ہوئے

کھڑا ہو گیا۔
 ”تو کہیں نہیں جائے گی۔ البتہ میں جاتا ہوں تیری جگہ، میں ہوں ناں۔ سارا آنکھوں دیکھا حال سناؤں گا بلکہ موبیل میں ویڈیو بنا کر لادوں گا، ٹھیک ہے ناں۔“

وہ بہت جوش سے بولنے لگا۔ زہرہ نے بے یقینی سے دیکھا، ہاں اتنا تو وہ جان چکی تھی۔ اب جس چیز پر وہ ٹھہر گیا، اس سے ایک انچ نہیں سر کے گا۔ وہ اب اپنے لیے ٹوپی ڈھونڈ رہا تھا، جسے سر پر رکھ کر وہ ساس کے جنازے پر جاسکے۔

زہرہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا، اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔ عاشق چونکا پھر آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”ایسے تو کبھی نہیں روئی۔“ اس کا لہجہ مشکوک

تھا۔

”ناں تو نے کبھی ایسے میری منتیں کیں اور نہ میرے آگے بحث۔ چکر کیا ہے، ماں کا منہ دیکھنے کے بہانے تو کسی اور کا منہ دیکھنے کے چکر میں تو نہیں۔“ اس کا لہجہ پھنکارتا ہوا تھا، اس نے اس کے زرخرہ اپنی انگلیوں میں کس لیا۔
 ”نہیں۔“ وہ ٹپ کر رہ گئی۔

”نہیں کیسے۔“ اس نے دباؤ بڑھایا۔
 ”جیسے میں جانتا نہیں، سارے پنڈ کو پیچھے لگایا ہوا تھا۔“

”نہیں.....“ ماں کو بھول کر اسے اب اپنی پڑ گئی، اگر وہ ایسے ہی اس کی گردن دبائے جاتا تو وہ ختم ہو جاتی۔ اس نے عاشق کے ساتھ جو اذیت ناک وقت گزارا تھا، وہ موت کے لیے آسانی کی خواہش مند تھی۔

ایک دم عاشق نے اس کی گردن چھوڑ دی، وہ دھپ سے بستر پر گر گئی۔

”اب سمجھا، ماں اور بھائی کو یاد کرنے کے بہانے تو دراصل کس کو روٹی ہے، اپنے اس یار کو، ہے ناں؟“ اپنے زرخرے کو سہلائی زہرہ کا سر جھٹکے سے اٹھایا، اس کی آنکھوں میں انکار تھا۔

عاشق اس کے چہرے پر جھک آیا، اس کے اشتعال بھرے چہرے پر یک دم سکون لہریں۔
 تھا۔

”خیر، کرتی رہ یاد۔“ وہ ہنسا۔

”یاد کرنے سے کون سی مردے میں جان پڑ جاتی ہے۔ ہے ناں، ہا ہا ہا.....“

”اللہ نہ کرے۔“ زہرہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اوہ یہ کیا غضب ہو گیا، جملہ غیر ارادی تھا اور عاشق کے لیے قطعی غیر متوقع۔

اس کے اٹنے ہاتھ کے تھپڑ نے زہرہ کا منہ گھما دیا۔ اس نے زہرہ کو فٹ بال سمجھ لیا، وہ بار بار اپنے احسان بتا رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ وہ کسی بھول میں نہ رہے۔ اس کے لیے اب کوئی نہیں آئے گا، وہ

اس کا آخری دروازہ ہے۔
 ”جاریا ہوں قبرستان، اپنے ہاتھوں مٹی
 چڑھاؤں گا سچ سے۔ کہیں باہر نہ نکل آئے، آخر کو
 جوانی ہوں۔ فرض ہے میرا۔“ اس نے دروازے
 کے باہر تالا ڈالتے ہوئے ساس بہو کو مخاطب کر کے
 کہا تھا۔

☆☆☆

”چل اٹھ، شابش ہمت کر۔ میں لے کر چلتی
 ہوں۔“ مسجد سے جنازے کا وقت آخری بار بتایا گیا
 تو زہرہ نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی چیخیں دبانا
 شروع کر دیں۔ اس کا جسم جھٹکے کھار ہا تھا۔ اس نے
 بھاگ کر دروازہ بھی دھڑ دھڑایا، یہ جاننے کے
 باوجود کہ عاشق کا یہ گھر گاؤں سے بالکل باہر اور الگ
 تھلگ ہے۔

چند پل اور گزرتے وہ نہ پہنچتی اور اس کی ماں کو
 منوں مٹی تلے دبا دیا جاتا۔ پھر کہاں دیکھ پائی وہ اس
 مہربان چہرے کو۔

”جلدی کر، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“
 پتا نہیں اس نے کس طرح دروازہ کھلوا لیا۔ اس نے
 زہرہ کا منہ دھلوا لیا، اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھا۔
 بڑی چادر سے اسے اچھی طرح لپیٹ کر، وہ بے خونی
 سے گھر سے نکلی تھی۔

☆☆☆

جنازے کا اعلان ظہر پر تھا مگر پھر پتا چلا شمیم کی
 آپاں جی، جو بیٹوں کے پاس دبئی میں تھیں۔ وہ عصر
 کے قریب پہنچیں گی، سو سب ٹھہر گئے۔ آپاں جی اور
 زہرہ آگے پیچھے داخل ہوئیں۔ پہلے آپاں جی۔
 گزشتہ سال بھر سے وہ سخت بیمار رہی تھیں،
 بیٹوں سے کہتی تھیں، انہیں گاؤں چھوڑ آئیں، وہ
 وہیں مرنا چاہتی ہیں۔

بیٹے ان سنی کر دیتے، بہترین علاج کی
 کولیات چھوڑ کر وہ انہیں دور افتادہ گاؤں میں نہیں
 بھیج سکتے تھے مگر بہن کی موت کا سن کر وہ رہ نہ سکیں۔
 انہیں شمیم کے سر ہانے کرسی رکھ کر بٹھا دیا گیا۔

بڑھاپے اور بیماری کے باعث ان کے اندر رونے کی
 بھی سکت نہیں رہی تھی۔ ہانپتے ہوئے وہ مسلسل
 کپکپا رہی تھیں۔

گیلی دھندلی آنکھوں سے انہوں نے دیکھا،
 دور نزدیک کے سب رشتے دار دکھائی دے رہے
 تھے مگر شمیم کی دیورانی (فخر کی ماں) وہ نہیں تھی۔ ہاں
 وہ کیسے ہو سکتی تھی اور زہرہ..... وہ کہاں تھی، کیا کہیں
 اندر؟ لیکن یہ اندر بیٹھنے کا وقت نہیں تھا۔

ہاں وہ جانتی تھیں کہ زہرہ کو بیاہ دیا گیا تھا۔
 بھائی اسے گھر میں رکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر کس
 سے اور کیسے لوگوں میں بیاہا جنہوں نے ماں کے
 مرنے پر بھی آنے نہیں دیا۔ وہ بے تابی سے پوچھنا
 چاہتی تھیں، تب ہی زہرہ کی آمد کا غلغلہ مچا۔

”اتنی دیر سے..... اب؟“ ایک دوسرے کے
 پیروں پر چڑھی عورتوں نے کسی کے کہے بنا راستہ
 بنا دیا۔

”ہاں یہ.....“ آپاں جی نے اپنی آنکھیں
 مسلیں۔ ”یہ زہرہ..... یہ زہرہ تو نہیں تھی، لیکن وہ
 زہرہ ہی تھی۔“

”اپنی سس دے نال آئی ہے، کسی نے کہا
 کون تھی زہرہ کی ساس.....“ آپاں جی نے آنکھیں
 سکیریں۔

ان کا کلیجہ منہ کو آیا۔ یہ..... یہ تو حمیدہ تھی۔

”ہائے.....“ ان کی نگاہیں بے ساختہ ناہید پر
 جا رکیں یعنی زہرہ کا بیاہ عاشق..... عاشق حسین سے
 کیا گیا۔ ”مگر کیوں؟“ وہ جھٹکے سے گردن گھما کر
 مری ہوئی شمیم کو دیکھنے لگیں، جیسے جھنجھوڑ کر جواب لینا
 چاہتی ہوں۔

ان کی رنگت خطرناک حد تک سفید ہو گئی۔ ان
 کے ساتھ کھڑی ان کی بہو نے جھک کر پوچھا۔

”آپ ٹھیک ہیں مام!“ وہ برطانوی نژاد تھی۔

اس نے پہلی بار جنازے کا یہ ماحول دیکھا تھا۔ آپاں
 جی کی ڈبڈبائی آنکھیں بہو کی سمت اٹھیں۔ انہوں
 نے بچوں کی طرح اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اور زہرہ..... سب کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا

پڑا۔

پڑوسن ماسی نے بیٹیوں کے بین کو جنازے کی شان کہا تھا۔ یہ کیسی بیٹی تھی، جس کے ہونٹ باہم پیوست تھے، جیسے کھلنا جانتے ہی نہ ہوں اور جس کی آنکھیں پتھر تھیں۔ جس کے وزن کو بوڑھی ساس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

ناہید جمع کو چیرتی زہرہ سے جا لپٹی۔

وہ بین ڈال رہی تھی، بہو ہو کر ایسی بے قراری اور بیٹی..... وہ یک ٹک شیم کے بند ہونٹوں کو، بند آنکھوں اور ناک کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے کے لیے اتنی سی ماں کو ہی بچایا گیا تھا، باقی تو کفن میں ملفوف تھی۔

”روناں زہرہ..... روتی کیوں نہیں؟“ ناہید چونکی پھر فکر مندی سے اسے ہلایا۔ پھر گالوں پر ہلکے طمانچے لگائے۔

”دیکھ یہ ابھی لے جائیں گے امی کو۔ پھر نہیں نظر آئے گا تجھے یہ چہرہ۔“

زہرہ کی ساکت پتلیاں ناہید کے چہرے پر جارکیں۔ اسے کتنے عرصے بعد نظر آیا ہے یہ چہرہ۔ عاشق شیم کو ملنے نہیں دیتا تھا۔

”اسے رلاؤ، ایسے ٹھیک نہیں ہوتا۔“ کوئی کہہ رہا تھا، سب نہ رونے پر ہونے والے نقصانات کا بتانے لگیں۔

جب یک دم ایک دھاڑ نے سب کے سانس خشک کر دیے اور زہرہ کے آنسو..... یہ بھائی عبداللہ کی آواز تھی۔

”کیوں آئی ہے یہ..... چلی جا یہاں سے۔“ وہ اس کے سر پر پہنچ گیا بلکہ اس نے اس کا بازو دبویں لیا، وہ اسے نکال باہر کرنے کو تھا۔ کتنی عورتوں کی چیخیں بلند ہوئیں۔

”ناں عبداللہ ناں..... یہ ظلم نہ کرنا۔“

”نہیں۔“ وہ اسے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

”کرم ماں کا منہ نہیں دیکھ سکا تو یہ بھی نہیں

دیکھے گی، میں دیکھنے ہی نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں نکل۔“

”بھائی۔“ ماں پر نظر پڑنے کے بعد اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ بھائی پر نگاہ پڑتے ہی وہ تو سہ پر پڑا مکھن ہو گئی۔

پر عبداللہ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، وہ اسے گھسیٹے چلا جا رہا تھا۔

تب ہی باہر سے جنازہ لے آنے کی صدا ابھری۔ عصر ہونے کو تھی۔ عبداللہ نے نفرت، قہر اور حقارت بھرے انداز سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

☆☆☆

عاشق حسین نے اپنے ہاتھوں کو جھاڑا۔ قبر پر مٹی ڈالنے والوں میں وہ پہلا تھا۔ آخری ہو جانے کے لیے اس نے مٹی برابر کرنے کے بہانے دونوں ہاتھ مٹی بٹھانے کے انداز میں قبر پر رکھ دیئے تھے۔ گرتے ڈھیلے کو بھی جمادیا، اندازیوں تھا۔

خس کم جہاں پاک.....

آخری کنڈا بھی نکل گیا۔ ساری دنیا کے کی زہرہ کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ بس ایک شیم ہی جو بیٹی کا پتا کرنے آ جاتی تھی، اسے لگتا، وہ زہرہ کو اس سے چھیننے آتی ہو۔

مگر خیر..... آج یہ کاٹنا بھی نکل گیا۔ وہ گھر کی طرف گامزن تھا۔ مگر تب ہی اسے ایسے جھٹکا لگا گویا کسی نے پیروں سے زمین کھینچ لی ہو۔

وہ جس دروازے پر تالا ڈال کر گیا تھا، وہ کھلا پڑا تھا۔ وہ بھاگ کر اندر داخل ہوا، اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ زور نہیں تھی، اس کی ماں بھی نہیں تھی۔

وہ اٹنے قدموں گھر سے نکلا، کواڑ بہت دیر ایک دوسرے پر نفرین بھیجتے رہے۔

☆☆☆

سب نے اپنے طور پر ہاتھ اور زبان سے روکنے کی کوشش کی، مگر اس کے ایک جملے نے سب

کھا بولتی بند کر دی۔
”میری بیوی ہے میں جو مرضی کروں، جب
میں نے منع کیا تھا کہ یہ نہیں جائے گی تو مطلب نہیں
جائے گی۔“
”میں لائی تھی اسے۔“ حمیدہ کی باریک آواز

پردہ ایک لمحے کو رکا۔
”تجھ سے میں بعد میں بنوں گا۔“ وہ ماں کو
دھمکاتے ہوئے پھر زہرہ کی طرف متوجہ ہوا۔
”اس کا کام تھا کہ یہ کہتی، میرے شوہر نے منع
کر دیا ہے، میں نہیں جاؤں گی۔ مگر یہ تو ابھی تک
نجانے کن امیدوں میں ہے۔ او تیرا کوئی نہیں ادھر
سمجھی، جتنے لوگوں کی طرف امید سے دیکھ رہی ہے
ہاں، یہ سارے ویلے تماشا شائی ہیں اور اس پوری دنیا
میں ایک میں ہوں۔“

”آپاں جی۔“ زہرہ نے عرصہ ہوا سوچنا بھی
چھوڑ دیا تھا، نجانے کیوں وہ چلا اٹھی بلکہ ساتھ ہی
اس نے اپنا ہاتھ عاشق کے ہاتھ سے چھڑوانے کی
کوشش بھی کی تھی۔

یہ ناقابل یقین اور ناقابل برداشت منظر تھا۔
عاشق نے اٹے ہاتھ کا پھڑپھڑ ہرہ کے گال پر دیا تھا۔
”بیوی ہے میری۔“ اس نے گردن تان کر
چار اطراف کھڑے لوگوں کو اپنے عمل کی توجیہ پیش
کی۔ ظاہر ہے سب کو تسلیم کرنا پڑا۔
”ہاں جی۔ پھر تو جائز ہے جو بھی کرے۔“ مگر
ایک آواز نے اس حق کو تسلیم نہیں کیا۔

”اومائی گاڈ۔“ یہ آپاں جی کی برطانوی نژاد
ہوتھی۔

”کال داپولیس۔ یہ شخص اس کی جان لے
لے گا، آپ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں۔“

سب چونکے۔ اوہ یہ باہر ملک والے.....
”یہاں ایسے نہیں ہوتا، پولیس شولیس.....“

”کیوں یہاں کی عورت کو درد نہیں ہوتا؟“ وہ
چلائی۔ مگر اس ملین ڈالر قسم کے جملے کا کسی پر کوڑی
بلا اثر نہ ہوا۔

تب وہ اندر بھاگ گئی۔ بے ترتیب ہو کر
چہرے پر آ جانے والے بالوں کو ایک ہاتھ سے پیچھے
کرتے کرتے وہ گردن اچکا کر باہر دیکھ لیتی اور
ساتھ ساتھ اپنے جدید موبائل پر عجلت بھرے انداز
میں کسی کو کال کر رہی تھی۔

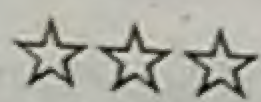
شور سن کر عبد اللہ باہر سے گھر کے اندر آ گیا
تھا۔ اس نے سخت حیرت سے اس منظر کو دیکھا۔ سب
کو یقین تھا، اب عاشق کی خیر نہیں۔ ناہید نے تیز تیز
لہجے میں شوہر کو بتانا چاہا۔

”ٹھیک ہے جب اس کے شوہر نے اجازت
نہیں دی تو اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔“
”یہ ظالم انسان اس کی جان لے لے گا۔“
ناہید نے ٹپ کر کہا۔

”تو میں کیا کروں؟“ عبد اللہ کے جملے نے
سب کو چونکایا۔

”یہ بہن ہے تمہاری۔“ کسی نے یاد دلایا۔
”نہیں..... میری کوئی بہن نہیں۔ میرا ایک ہی
بھائی ہے کرم، جو جیل میں ہے اور جس کی وجہ یہ
ہے۔“ عبد اللہ کی نفرت میں بجھی آنکھیں اور انگلی
زہرہ کی سمت اٹھیں۔

”کرم.....“ آپاں جی نے دہرایا۔
”وہ تو جیل سے آزاد ہو گیا تھا ناں۔“
آپاں جی بعد کے واقعات سے آگاہ نہیں
تھیں، ان کے ویزے کی مدت پوری ہو گئی تھی۔
سیف اللہ کے انتقال والی رات وہ بیٹوں کے پاس
فلانی کر گئی تھیں۔



زہرہ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بیان دینے
کے قابل ہوئی تھی اور سیف اللہ نے اس وقت کو جان
کنی کے عالم میں گزار دینے کے بعد بالآخر دم دے
دیا۔ سیف اللہ مر گیا۔

اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، وہ جانتے تھے۔
کرم کے لیے یہ فیصلہ برداشت کرنا مشکل ہو گا مگر وہ
یہ سب کر گزرے گا یہ ان کے تصور سے باہر کی چیز

تھی۔
ایک طرف زندگی موت کی کشمکش میں گرفتار،
عزیز از جان بھتیجا فخر..... جسے وہ اپنی زندگی کی سب
سے قیمتی شے (زہرہ) سوچنا چاہتا ہے۔

دوسری طرف تھانے میں بند کرم جس پر
نجانے کون کون سی دفعات لگائی گئی تھیں اور اگر فخر کو
ہوش نہ آتا تو کرم سیدھا سیدھا قتل کا مجرم کہلاتا۔

اور تیسری زہرہ..... اوہ اوہ..... ہو

سیف اللہ کے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ
نہ تھا۔ اس کی بیٹی کا نام گلیوں چوراہوں کا چٹخارہ بن
گیا۔ اخبار کی سرخی، سنسنی خیزی اور رنگ آمیزی کے
ساتھ..... بھائی کی غیرت نے برداشت نہ کیا۔ سکے
چاچے کے بیٹے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ لیا
تھا بھائی نے..... بھائی سے کہاں برداشت ہوتی ہیں
ایسی باتیں۔

کتنے لوگ ثبوت لانے لگے۔ ہاں انہیں تو
پہلے سے پتا تھا، زہرہ اور فخر کی ملاقاتوں کا، ہاں کرم
بے خبر تھا تو اور بات تھی۔

سیف اللہ کا سادہ بیان ایف آئی آر کا پیٹ
نہیں بھر سکتا تھا۔ انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ کرم بہت
غصہ میں تھا، ناراض تھا۔ مگر وہ اس حد تک نہیں جاسکتا
تھا، انسپکٹر نے ان کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے کی
کوشش کی۔

کہ وہ کہہ دیں کرم نے غیرت میں آ کر یہ
سب کیا لیکن کرم صاف انکاری تھا۔ اس نے سینہ
ٹھونک کر کہا۔ وہ غیرت میں آ کر اس سے بڑھ کر کرنا
چاہتا تھا جو ہوا تھا لیکن یہ سب اس نے نہیں کیا۔

ایک مصیبت دنیا والے تھے اور دوسری
عبداللہ۔ اس کا بس چلتا تو وہ باپ کا گریبان تھام کر
اسے زمین سے اوپر کر لیتا۔

”میں کہتا تھا ابا جی! یہ کام نہ کریں، کرم سے
برداشت نہیں ہوگا اور فخر میں کون سے پھول نکلے
تھے، جو اور کہیں سے نہیں ملنے تھے۔ آپ نے باپ
ہو کر بیٹے سے بدلہ لیا۔ او کوئی کمی تھی زہرہ کے لیے

رشتوں کی، مگر آپ کو تو کرم کو نیچا دکھانا تھا، بدلہ لینا تھا
اس سے۔ اس نے آپ کی مرضی کا قابل انسان جو
بن کر نہ دکھایا، میرا بھائی تھانے میں بند ہے۔“ وہ
دیوانہ ہو رہا تھا۔

”اس نے کچھ نہیں کیا، وہ چھوٹ جائے گا۔“
سیف اللہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہے تھے،
بس ایک بار ان دونوں کو ہوش آ جائے۔

”دونوں کو ہوش.....“ عبداللہ اتنی زور سے
چیخا کہ گردن کی رگیں گن لی جائیں۔

”آپ کس دنیا میں ہیں ابا جی! کرم تو شاید بچ
بھی جائے مگر میں، دونوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں
نہ اتارا تو نام بدل دینا۔ آپ سن رہے ہیں، دنیا کیا
کیا باتیں کر رہی ہے اور آپ.....“ وہ شمیم کی سمت
گھوما۔

”آپ سے ایک لڑکی نہ سنبھالی گئی، ایک لڑکی
کی نگرانی نہ ہو سکی۔ وہ باگ بگچوں میں ہمارے
شملوں کی پینگیں ڈال کر جھول رہی تھی اور وہ حرام
زادہ..... جو اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پیارا تھا وہ.....“
سیف اللہ مرحوم بھائی کے لیے یہ نام سن کر
ترپ اٹھے۔

”ہاں ہاں..... میرا منہ بند کروادیں۔ کرم
آزاد ہوگا یا نہیں لیکن سب کا ان کھول کر سن لیں، ان
دونوں کے قتل کے بعد میں پھانسی ضرور چڑھوں گا،
وہ بھی پھندا چوم کے۔ کب تک پہرہ دے گی
پولیس۔“

اس نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ شمیم، آپاں
جی اور ناہید کی چیخیں نکل گئیں۔

سیف اللہ بجلی کی سی تیزی سے عبداللہ سے
لپٹ گئے۔ وہ عبداللہ سے ریوالور چھین لینا چاہتے
تھے۔

عبداللہ کو سیف اللہ کے بوڑھے جسم سے ایسی
مستعدی کی امید نہیں تھی۔ اس کا انداز ریوالور
چلانے کے لیے جارحانہ ہو گیا۔ ساتھ ساتھ وہ
مسلل بول رہا تھا۔

وہ باتیں اور قصے جو پنڈ کے لوگوں نے رائی دیکھ کر پہاڑ کی طرح کھڑے کر دیے تھے۔ لوگ کہتے تھے، ایویں سیف اللہ نے رشتہ طے کرنے کی مٹھائی وٹڈی (بانٹی)۔ رشتہ تو بہت پہلے ہی باغ میں طے ہو گیا تھا۔ اس کے آگے کے جملے اور اشارے ضبط تحریر میں لانے کے قابل نہیں تھے۔

سیف اللہ کا جسم اور دل تاب نہ لاسکا۔ انہوں نے یک دم ریوالور کے حصول کی کوشش ترک کر دی۔ عبد اللہ کے چونکنے اور سمجھنے تک سیف اللہ کا دم نکل چکا تھا۔

☆☆☆

سیف اللہ کے جنازے میں کرم نہیں تھا اور فخر بے چارہ کیسے ہو سکتا تھا لیکن فیض بھی نہیں تھا کیوں؟ جب کہ جنازے کے وقت پنڈ کے گھروں میں صرف عورتیں رہ گئی تھیں۔ ہر عمر کا مرد جنازہ گاہ میں پہنچ گیا تھا، کمہاروں کے سارے مرد بھی تھے۔ زہرہ کے بیان اور انسپکٹر کے شک کو تقویت ملی۔ مردوں کے گھر پہنچے سے پہلے انسپکٹر اپنی ٹیم کے ہمراہ فیض کے سر پر پہنچ گیا۔ نقیشت کی ضرورت ہی نہ پڑی، فیض کا لٹھے کی طرح سفید پڑتا رنگ اور ہاتھ پر بندھی پٹی۔

”زہرہ و فخر کے معاملے سے ہمارے فیض کا کیا تعلق؟“ اس کے سارے عزیز اقربا کوؤں کی طرح بولنے لگے۔

”تعلق بھی پتا چل جاتا ہے۔“ انسپکٹر نے جیب میں گھسے ہاتھ کو کھینچ کر نکالا اور فیض کے سمجھنے سے پہلے پٹی اتار پھینکی۔ فیض نے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی۔

وہ مجرم نہیں تھا تو اسے بھاگنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ سب نے بے ساختہ سوچا۔ انسپکٹر کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی نگاہیں کھل جانے والے ہاتھ پر تھیں۔

نیلے جامنی اور سیاہ رنگ کا وہ دائرہ چھوٹی انگلی سے نیچے ہیلی کے اندر باہر دراصل زہرہ کے جڑے

کے شدید ترین دباؤ۔ وحشت، غضب، بے بسی اور نفرت کا منہ بولتا ثبوت بن کر موجود تھا۔

انسپکٹر کے — ہاتھ کے تھپڑ نے فیض کا منہ گھما دیا پھر اس نے فیض کے ماتھے سے بالوں کا گچھا دبویں لیا اور جیسے مشین گن سے برسٹ فار ہوتا ہے، ٹڑ ٹڑ ٹڑ..... ویسے فیض کے منہ پر طمانچے پڑ رہے تھے۔

کیا ہوا، کیا ہوا کی پکاریں یہاں تک کہ شریف کمہار کی انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش بھی بے سود رہی۔

☆☆☆

”او میں نے کیا کیا ہے؟“ پہلے تھپڑ سے شروع ہونے والا فیض کا سوال خود ہی بدل گیا۔ ”او میں نے کچھ نہیں کیا..... میں نے کچھ نہیں کیا۔“

انسپکٹر جانتا تھا، کس کس ڈگری کا استعمال درست جواب کی طرف لے جائے گا۔ وہ شروع سے آخر تک فیض کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”اوبے تو اچھی طرح جانتا ہے تو نے کیا کیا ہے، چل شادو شے اشارٹ..... بب..... بب..... بتاتا ہوں، سو بالآخر۔“

انسپکٹر نے سر ہلایا اور ڈھیلی ہو جانے والی پینٹ کو اوپر چڑھایا، ساتھ ہی اس نے پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کیا، اپنے لیے.....

”فخر نے ڈیرے میں گھس کر اسے سوتے میں مارا تھا، جان لینے کی کوشش کی تھی۔ زورا اچھی لگی تھی مجھے، مگر اس کا معاشقہ تھا فخر سے، تھوکا تھا اس نے، میرے اوپر، بدلہ لینا تھا۔“

”اوبے تو تو بھی تھوک دیتا، اب زندگی بھر منہ دھوتے رہنا۔ لڑکے کی حالت سیریس ہے، کوئی امید نہیں ہے اس کے بچنے کی اور ساتھ ہی تیرے بچنے کی بھی، سمجھا سیدھا سیدھا قتل تین سو دو کا مقدمہ، پھانسی کا پھندا لگے گا سمجھے، پھندا.....“ انسپکٹر نے بات ختم کر دی۔

فیض کا رنگ ڈگیا اس نے ایسا جان لیوا جملہ تو

نہیں کیا تھا، ایسے ہی انسپکٹر اسے ڈر رہا تھا، وہ ہوا پھر لا پرواہ ہو گیا۔

”میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی یہی کرتے۔“ اس نے انسپکٹر کو دلیل سے قائل کرنا چاہا۔
”اچھا.....“ انسپکٹر نے طنز سے اسے دیکھا۔
”اور میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو میں کرنے لگا ہوں۔ اوئے بند کرو اسے۔“ اس نے حکم جاری کیا۔

فیض اندر، کرم باہر..... زہرہ کو بھی اسپتال والوں نے فارغ کر دیا مگر فخر۔ اس کی زندگی وصحت کی دعا کرنے والی ایک صرف اس کی ماں نہ تھی۔ ساتھ میں فیض کی ماں اور بہن نبیلہ بھی شامل ہو گئی، اس کے بیٹے کی آزادی فخر کی زندگی سے مشروط تھی۔ وہیں دوسری طرف کرم اور عبداللہ جہاں فخر کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، وہیں اگلا مجرم فیض بن گیا۔ کرم نے سیف اللہ کی موت کو فخر کے نام لگا دیا۔ وہ راستے سے گزرتا، تو لوگ ایک دوسرے کو معنی خیز سے دیکھتے، بلاوجہ کھنکارتے، ہنس پڑتے۔ ایک آدھ نے ہمدردی جتانے کے نام پر کرم کو سیخ پر چڑھا دیا۔

فخر..... فخر..... فخر..... وہ دانت کچکچاتا۔ وہ اس کی جان لے کر اپنی آن کے سرنگوں پر چم کو دوبارہ سے لہرادینا چاہتا تھا اور صرف فخر ہی کیوں زہرہ بھی۔ یہاں شمیم اور ناہید آڑے آ گئیں۔ ناہید نے کرم کو جکڑ لیا، شمیم نے اپنا دوپٹا کرم کے پیروں میں رکھ دیا۔

زہرہ ایک سکتے کی کیفیت میں تھی، ایسے منزل پر پہنچ کر بھی کوئی پلٹتا ہے۔

فخر کی ڈرپ کے سہارے چلتی زندگی پر سب کی نظر تھی۔ سر کے پچھلے حصے پر لگنے والی چوٹ ہوش میں نہ لانے کا باعث تھی۔ چاچی جی اتنا روچکی تھیں کہ لگتا تھا بینائی چلی گئی ہے۔ زہرہ سوچتی بس ایک بار فخر کو ہوش آ جائے۔

کمہاروں کے پورے محلے میں فخر کی زندگی

کے لیے قرآن خوانیاں کروائی جا رہی تھیں۔ شریف کمہار نے کرم کا گریبان پکڑ لیا۔

”تیرے کرنے والا کام میرے بیٹے نے کیا اور وہی بے چارہ اندر ہے۔ اپنی بہن پر قابو رکھ نہیں سکے اور دوسروں کو وخت ڈال دیا۔“

کرم نے شریف کمہار کے سینے پر ہاتھ مار کے اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ کولہوں کے بل زمین پر جا گرا۔ کرم سرعت سے اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی ٹھوڑی دبوچ لی۔

”وہ میرے گھر کا معاملہ ہے۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں چاہا۔ تو فخر کی زندگی کی نہیں موت کی دعا مانگ، کیونکہ وہ بچ گیا تو تیرا بیٹا باہر آ جائے گا۔ جہاں میں اسے اگلا سانس نہیں لینے دوں گا، میری بہن کا پیچھا کرتا تھا، راستہ روکتا تھا، ہیں..... اندر محفوظ ہے تیرا بیٹا، جب تک اندر رہے گا کم از کم زندہ رہے گا۔ باہر آیا تو میں استقبال کی تیاری کر کے بیٹھا ہوں، سمجھا۔“

کرم نے نئی بات نکالی جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

شریف کمہار کے ہوش اڑ گئے، فیض نے انسپکٹر کی مار کے آگے تمام حالات و واقعات تفصیل سے بتائے تھے۔ کیسے اسے زہرہ اچھی لگی، کیسے زہرہ کا پیچھا کرتا تھا، کیسے زہرہ نے تھوکا، کیسے کیسے اور کیسے..... اس کے بیٹے کے قصور تھے۔

بس ایک بار فخر کو ہوش آ جائے، وہ..... وہ فیض کو باہر بھیج دے گا۔ بس ایک بار..... اس نے سب طے کر لیا اور فخر کو ہوش آ گیا۔

شریف کمہار نے تھانے میں کرم کی دھمکی کو نوٹ کر وادیا۔ انسپکٹر چراغ پا ہو گیا، کرم کی اتنی جرات۔

”ابھی ہم زندہ ہیں۔“ انسپکٹر نے اپنا سینہ ٹھونکا اور ایک گالی دی۔

انسپکٹر زندہ ہی رہا، فیض مار دیا گیا۔ اس کے سر پر تیز دھار شے سے وار کیا گیا تھا۔ ایک ہی وار نے

فیض کو بے فیض کر دیا۔ کرم کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

کہاروں نے کرم کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ تمام ثبوت، حالات و واقعات کرم کے خلاف تھے۔

مگر عجیب بات یہ تھی، سینہ ٹھونک کر فیض کی جان لینے کا کہنے والے کرم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہتا تھا۔

”اگر وہ مارتا تو خود تھا نے پیش ہو کر اقبال جرم کرتا بلکہ راستے میں آنے والے ہر بندے کو روک روک کر بتاتا، فیض کو پار کے آیا ہوں۔“

کرم کے اس قطعی انکار نے جہاں انسپٹر کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

تو کرم نہیں تو پھر اور کون؟ فخر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن فخر کی یاں تو ہو سکتی تھی۔ وہ بوڑھی تھی، کمزور و لاچار مگر ماں تھی۔ اپنے بچے کو زک پہنچانے والے کی جان لی سکتی تھی۔

اور شک تو زہرہ پر بھی کیا جاسکتا تھا۔ جتنا تنگ اسے فیض نے کیا اور پھر جو اس نے فخر کے ساتھ کیا۔ مگر زہرہ تو خود عبد اللہ سے اپنی جان بچانے کے لیے گھر کی کسی کو ٹھڑی میں چھپی بیٹھی تھی۔

دراصل رہا ہونے کے بعد فیض مونچھوں کو بل دیتا عبد اللہ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”اب تو پتا لگ گیا ناں میں کس کی بہادری کا نشان لے کر گھوم رہا تھا۔ ایک ہوتا ہے نشان اور ایک ہوتا ہے اعلان۔ ایک دنیا کو پتا لگ گیا۔ فیض نے کیسے اپنی عزتی کا بدلہ لیا۔ ویسے اب اپنی بہن کا کیا کرنا ہے، گھر رکھنے کے تو وہ قابل رہی نہیں، جس کے ساتھ موجیں اڑاتی تھی وہ بے چارہ تو..... ہا ہا ہا۔“

اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ کر قہقہہ لگایا۔ عبد اللہ نے فیض کا گلا پکڑ لیا۔

”ادمیرا نہیں، اپنی بہن کی گردن ب (ناپ) جا کر..... جو..... اس سے آگے جیلے نہیں تھے، غلاظت کی ڈھیری تھی۔ دونوں کے گرد جمع اکٹھا

ہو گیا۔ لوگوں نے ہا مشکل دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے گھر کی طرف روانہ کیا۔

عبد اللہ کے ہاتھوں فیض کی جان بخشی کر دینے والے بہت تھے، مگر زہرہ کے لیے گھر میں صرف دو لوگ تھے، ایک ناہید دوسری شمیم۔

چیخ و پکار سن کر پڑوسیوں نے زہرہ کو بچایا اور عبد اللہ کو مولوی صاحب اپنے ساتھ مسجد لے گئے۔ فیض کا قتل اسی رات ہوا، عبد اللہ کی ساری رات مسجد میں موجودگی کے گواہ مولوی صاحب کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی تھے۔

مگر اس کے باوجود عبد اللہ کا کردار مشکوک تھا، وہ بھی کسی کے ذریعے فیض کو مردا سکتا تھا (کرم کے ذریعے بھی) انسپٹر کے تجربے و مشاہدے میں ایسے کتنے واقعات تھے۔ کرم کے نہ ہونے کی صورت میں سب کچھ عبد اللہ کے نام ہو جاتا۔

عبد اللہ غصے سے پاگل ہو گیا، اسے کرم سے شدید محبت تھی۔

”اگر ایسی بات ہے تو ہاں میں نے مارا ہے فیض کو، آپ گرفتار کر لیں مجھے۔“ اس نے فکری انداز سے اپنے دونوں بازو انسپٹر کے سامنے کر دیئے۔

مگر یہ جذباتی اقبال جرم ثبوت نہیں تھا۔ کرم جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا اور زہرہ اناج والی کو ٹھڑی میں چھپی بیٹھی تھی۔ عبد اللہ راتوں کو سو نہیں پاتا تھا کہ اس کا بھائی کہاں ہے۔

اس کے حلق سے نوالہ نہیں اترتا تھا کہ کرم نے کیا کھایا ہوگا۔

ایسے ہی ایک اذیت ناک بل میں اس نے شمیم کو دیکھا۔ وہ ناشتے کی ٹرے لے کر گھر کے پچھلے حصے سے آرہی تھی۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر باورچی خانے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ ٹرے سلیب پر موجود تھی، اس نے دسترخوان کو اٹھایا، وہ خالی تھا۔ دہی کی پیالی خالی تھی، بکرے کا گوشت، آلو کا سالن آدھا کھایا گیا تھا، اچار، شکر اور چائے کا خالی کپ۔ ایک طرف یہ شاہی ناشتہ اور دوسری طرف کرم۔

عبداللہ نے ہاتھ مار کے فرے گرا دی۔
 ”کیسی بے حس ماں ہیں آپ، بیٹا جیل کی
 سوکھی روٹی کھا رہا ہے اور آپ اس منحوس کو ناشتے سجا
 سکا کر دے رہی ہیں اور وہ بے غیرت۔۔۔ اس کے
 حلق سے نوالے اترے کیسے۔ میں نے تو سنا تھا،
 بہنیں بھائیوں کے پیچھے جان دے دیتی ہیں۔ پہلے
 ان کے منہ میں نوالہ ڈالتی ہیں، پھر اپنے منہ میں۔
 کیسی حرام خور بیٹی پیدا کی آپ نے۔“

شمیم کہہ نہ سکی کہ دس دن سے بخار میں جھٹکنے
 کے بعد آج ہی تو اس نے چند لقمے لیے تھے۔ وہ بھی
 شمیم نے ایک لقمہ اس کے منہ میں رکھا، ایک اپنے
 منہ میں۔

عبداللہ یک دم کوٹھڑی کی سمت بڑھا، چاول کی
 بوری سے ٹیک لگا کر بیٹھی زہرہ کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا
 ہوا دروازے کی سمت لے کر چلا۔ کنڈی کھولی اور
 ہاتھ سے پکڑ کر اسے گھر سے باہر نکال کر کنڈی
 چڑھائی۔ حیران پریشان زہرہ کی دستک پر عبداللہ
 نے تو کان بند کر لیے۔ مگر دوسروں کے گھروں کی
 دروازے کھلنے لگے۔

ہائے عبداللہ نے زور انوں باہر کنڈ دیتا۔۔۔۔۔
 تے نالے کنڈی چاڑ لی۔ کھلدا ای نہیں پیا (زہرہ کو
 باہر نکال کر کنڈی لگالی اور کھولتا ہی نہیں)۔

”یہ طریقہ نہیں ہوتا عبداللہ، تو اتنا ہی تنگ ہے
 تو سیدھا راستہ استعمال کر۔ بیٹیاں اس طرح سے
 دروازوں سے باہر نہیں کی جاتیں، شادی کر دے پھر
 نہیں نظر آئے گی تجھے۔“

ایک محلے دار نے عبداللہ کے شانے پر ہاتھ
 رکھ کر سائب مشورہ دیا۔

☆☆☆

”زہرہ کا رشتہ۔۔۔۔۔ زہرہ کا رشتہ۔۔۔۔۔ کہاں تو
 آپ لوگوں نے کان کھا لیے تھے، ہر دوسرے دن
 کوئی نہ کوئی چلا آ رہا تھا۔ کہاں گئے اب وہ سارے
 لوگ، بلا میں ان میں سے کسی کو بھی اور نکالیں اسے
 گھر سے۔“

بھائی عبداللہ کی دھماکیں زہرہ کو سانس نہ
 دے رہی تھیں۔
 شمیم کیا بولتی۔۔۔۔۔ شوہر مر گیا تھا۔ بیٹا بڑھتا
 اور بیٹی۔۔۔۔۔

عبداللہ مولوی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ
 لگوائیں رشتہ۔۔۔۔۔ انہوں نے ہانپی بھری۔

عصر اور مغرب کے درمیان وقفے میں عبداللہ
 مسجد ہی کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔
 مولوی صاحب وعدے کے پابند تھے۔ وہ مین چار
 معززین کو لے کر بیٹھ گئے۔ سیف اللہ کی منگت
 گنوا میں، سب نے تاسف آمیز انداز میں تائید کی۔
 ”ہاں جی، بڑی عزت کی زندگی گزاری مگر
 موت بڑے بڑے طریقے سے ہوئی۔“

”پنڈ کی دھیاں سب کی سانجھیاں ہوتی
 ہیں۔“ مولوی صاحب پیش لفظ ترتیب دے رہے
 تھے۔

”آپ سب کو تو حالات کا پتا ہے ناں، کیسے
 سیف اللہ نے فری سے رشتہ چھڑوایا۔ کرم کا قصہ، زہرہ
 اور فخر کا باہمی لگاؤ۔۔۔۔۔ بچپن سے بات طے تھی۔ نوجوانی
 میں ایسی ملاقاتیں لڑکا لڑکی کرتی لیتے ہیں۔“ مولوی
 صاحب نے لبرل ہونے کی حد کر دی۔

”ہم سے کیا چاہتے ہیں مولوی صاحب؟“
 کسی نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

”کیا چاہتا ہے، آپ سب کے گھر میں جوان
 بچے موجود ہیں، زہرہ کو نام لگا کر لے جائیں۔ سب
 لوگ بھول بھال جائیں گے، کیا ہوا تھا۔ جس کی
 بیوی بنے گی اسی کے نام سے پھر پہچانی جائے گی۔“
 ”کیا؟“ سب نے یک زبان ہو کر اپنی

صد ماتی حیرت کا اظہار کیا۔ پھر ان سب کے
 تاسف آمیز انداز میں ہلے، انہیں مولوی صاحب
 سے ایسی امید نہیں تھی۔

”اتنے بے غیرت نہیں ہوئے ابھی مولوی
 صاحب! خالی پسندنا پسند میل ملاقاتوں کی بات نکلی
 ہے۔“ ایک نے برہمی سے کھڑے ہوتے ہوئے

کہا۔ وہ سب کو تائید طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔
 ”آپ نے شاید (شاید) دونوں کو باگ
 (باغ) میں دیکھا نہیں تھا۔“ آگے جو کہا اسے سن کر
 مولوی صاحب کا چہرہ آب و ندامت سے بھر سا گیا۔
 ”اوسانوں کی پتا، ملاقاتوں کی گل کئی آگے
 (ہمیں کیا پتا ملاقاتوں کی بات کتنی
 دڑی ہوئی سی۔۔۔۔۔)“

عبدی بھلا بنگ چکی تھی۔
 ”نسی شاید فیض دیاں گلاں نہیں سنیاں (آپ
 نے شاید فیض کی باتیں نہیں سنیں)۔“
 سو وہ صرف اپنی رائے کا اظہار نہیں کر رہے
 تھے۔ ان کے پاس فیض جیسا عینی شاہد بھی تھا۔
 وہ سب کھل کر بولتے اٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

”ہاں یہ سچ تھا، وہ زہرہ جو ماؤں کے خوابوں
 جیسی بھونکی اور جس کا نام زورالے لے کر لڑکے
 ہو کے بھرتے تھے۔ اسے اپنانے کے لیے کوئی آگے
 نہ بڑھا۔ سیدھی سی بات تھی کسی کا اتنا جگر نہیں تھا۔
 ”لیکن میرا تھا۔“

عاشق حسین کی آواز للکار جیسی تھی، وہ تمام
 احسانات جو وہ زہرہ پر جتاتا تھا، آج سب کے
 سامنے کہنے کا ایسا شاندار موقع وہ بھلا کیسے جانے
 دیتا۔

سو وہ بول رہا تھا اور اسے چپ کروانے والا
 کوئی نہیں تھا۔ عبد اللہ چاہتا تھا وہ بس اپنی بیوی کو کسی
 بھی طرح یہاں سے لے جائے۔ اس کے باپ کی
 طرح اس کی ماں کا جنازہ بھی تماشا بن گیا تھا۔

وہ مالک و مختار تھا زہرہ کا، وہ محسن تھا عبد اللہ کا۔
 سیف اللہ کے پورے خاندان کا، جب عبد اللہ زہرہ
 کے رشتے والی بات پر ہزیمت اٹھا چکا، تب عاشق
 سامنے آیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، انداز
 مذہب بلکہ التجائیہ تھا۔ اس نے زہرہ کا رشتہ ایسے
 مانگے جسے نہ سے اعزاز مانگا جائے۔

زہرہ کا نام ایسی عزت سے لے رہا تھا کہ
 عبد اللہ کے شعلے کے سارے داغ دھل گئے۔ وہ بے

یقین تھا، کوئی زہرہ کو ایسے بھی مانگ سکتا تھا، اب
 بھی۔۔۔۔۔ کیا عاشق نے لوگوں کی زبانیں نہیں سنیں۔
 ”میں سب جانتا ہوں جی، یہ ساری بکو اس
 اس فیض کی پھینلائی ہوئی ہے۔ کمہاروں نے قسم کھالی
 ہے کہ ان کا بیٹا مر گیا۔ سیف اللہ کے خاندان کو زندہ
 لاش بنادیں گے، عزت بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے
 بھلا۔“

”ماموں سیف اللہ کے بڑے احسانات ہیں
 ہم ماں بیٹا پر۔ میں ان کی مٹی خراب ہوتے نہیں دیکھ
 سکتا تھا۔“ عاشق کی ناصر آواز گلو گیر ہو گئی بلکہ
 آنکھیں بھی لبریز ہو گئیں۔
 ”میں بڑی عزت اور۔۔۔۔۔“ اس نے حلق تر
 کیا۔ ”محبت سے رکھوں گا زور۔ میرا مطلب ہے
 زہرہ کو۔“

میں پنڈ والوں کی باتوں پر یقین نہیں کرتا جی۔
 میرے لیے بھائی عبد اللہ! زور۔۔۔۔۔ زہرہ بالکل
 پاک صاف، دھلی دھلائی ہے۔ آپ مجھ پر بھروسہ
 کر سکتے ہیں۔ آپ کی عزت میری عزت، ماموں
 سیف اللہ کے ہم پر بڑے احسان۔۔۔۔۔“

”باس۔۔۔۔۔“ عبد اللہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کی
 بات کاٹ دی۔ ”زیادہ نہ بول۔“
 اس کے انداز کی عجلت آمیز کرخنگی پر عاشق
 دبک گیا۔ اس نے بہترین الفاظ کا استعمال کیا تھا۔
 اسے یقین تھا عبد اللہ انکار نہیں کرے گا، اسے بھی
 ڈال لے گا۔ خوشی سے ماتھا چوم لے گا۔
 مگر عبد اللہ کے انداز میں سخت ناگواری بھی
 تھی۔

”زیادہ نہ بول۔“
 ”کب لائے گا بارات۔۔۔۔۔ بلکہ بارات کی
 کوئی ضرورت نہیں، دو گواہ اور ایک مولوی بس۔۔۔۔۔“
 ”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ عاشق کھڑا ہو گیا۔ ”میں
 اسے بہت خوش رکھوں گا۔“

اس کی زبان خوشی و بے یقینی سے لڑکھڑا رہی
 تھی، ہاتھوں سے تھوک نکل رہا تھا۔

اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔
اس نے شادی والے روز دم بخود نظر آئی۔ ناہید کو بھی
بار بار یہی یقین دہانی کروائی۔ شیم کے آگے جھکا
جاتا تھا۔ شیم جو کسی فالج زدہ مریض کی طرح منہ
کھولے کھڑی تھی، پھٹی آنکھیں اور نہ بول سکنے کی
اذیت سہتے ہوئے۔

ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑتے ہوئے
وقت رخصت وہ عبد اللہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں
تھام کراتنا جھکا کہ لگا رکوع میں چلا گیا ہے اور سجدے
میں جانے کو ہے۔

”میں بہت خوش رکھوں گا زہرہ کو۔“

”جیسے مرضی رکھنا۔“ عبد اللہ نے حقارت سے
اپنا ہاتھ کھینچ کر دو انگلیوں کے اشارے سے حمیدہ کو
دلہن لے کر نکل جانے کا کہا۔

سخت غائب دماغی کے عالم میں نکاح نامے پر
دستخط کرنے والی زہرہ نے مشینی انداز سے تمام
احکامات کی تعمیل کی تھی۔ منہ پر غازہ مل لیا۔ آنکھ میں
کا جل بھی لگوا لیا۔ ہونٹوں کو سرخ رنگ میں رنگوا لیا۔
ماتھے پر ٹیکا اور گلے میں ہار بھی تابعداری سے ڈلوایا
تھا۔

سجائے والی کو لگا جسے وہ بچپن میں کپڑے کی
گڑیا کو سجاتی تھی، آج وہی تجربہ دہرا رہی ہو۔

تو ایسی موم کی ناک بنی زہرہ نے وقت
رخصت عاشق حسین کو دیکھ لیا۔ بھاء عاشق..... اس کا
دلہا بنا کھڑا تھا۔ فخر پر لعنت بھیج کر اس کے بھائی نے
اس شخص کو چنا تھا۔ زہرہ کی گردن دبا دیتا تو پھانسی
ملتی، زندہ درگور کر دینے پر بھی کوئی شق قانون میں
ہے کہ نہیں.....

وہ حمیدہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر واپس
گھر کے اندر پلٹ جانا چاہتی تھی۔

”مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا بھائی۔“
مصیبت میں بہنیں بھائیوں کو ہی پکارتی ہیں مگر تب
بھی آج کی طرح عبد اللہ نے اجنبیت سے منہ موڑا
تھا۔

وہ ششدر کھڑی تھی، یہاں تک عاشق حسین
نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اسے لے کر چلنے لگا تو وہ
گردن پیچھے موڑ کر عبد اللہ کو دیکھتی جاتی تھی۔ یہاں
تک کہ دلہن پار ہو گئی، دروازہ بند ہو گیا لیکن آج.....
آج نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ کہنے سننے حکم ماننا تو چھوڑ
عاشق حسین کی مار کھانے کے باوجود اس کے ساتھ
چلنے سے انکاری تھی۔

اور بار بار پلٹ کر عبد اللہ کو دیکھتی تھی کہ وہ
دیکھے جو سب کے سامنے ایسا سلوک کر رہا تھا، وہ
اکیلے میں کیا کرتا ہوگا۔

وہ دیکھنا چاہتی تھی کیا خون جوش مارے گا۔
تماشائی بنا ہر شخص بھی لاشعوری طور پر اسی چیز کا
منتظر تھا مگر عبد اللہ کا چہرہ ساٹ کا ساٹ رہا۔ آپاں
جی اور ان کی بہو کی دہائیاں بھی اس کے چہرے پر
سلوٹ پیدا کرنے میں ناکام رہی تھیں۔
تب ہی پولیس پہنچ گئی۔

☆☆☆

”اوائے انسان کا بچہ بن..... بیوی ہونے کا یہ
مطلب نہیں کہ تو اس کی جان لے لے۔“ پولیس
والے نے سرسری انداز میں عاشق کو مخاطب کیا۔
جیسے بعض مائیں اپنے بچوں کے سنگین سے
سنگین جرم سے پہلو بھی کرتی ہیں ”نہ کرو بچے“ تو یہ
ایسی ہی تنبیہ تھی۔ ساتھ ہی وہ آپاں جی کی بہو کی
سمت گھوما۔

”اوجی، میاں بیوی کے معاملے میں اب ہم
کیا بولیں۔ جب خاوند نے منع کیا تھا کہ نہیں آنا تو
نہیں آنا چاہیے تھا۔ خاوند کی فرماں برداری کا حکم تو
اللہ نے دیا ہے اور ادھر ایسے واقعات روز ہوتے
ہیں۔ سب کو سیا پے میں ڈال کر اگلے روز دیکھو تو
اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی دیکھ لینا، کل اگر آپ
اس جھگڑے کی بات کریں گی تو بولیں گے کون سا
جھگڑا..... کب جھگڑا..... چل اوائے رشید۔“

جونیر کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے ناک کو
بار بار سکڑا۔ وہ کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاں

جنازے کے بعد کے کڑوے کھانے میں نائی نے اپنا سارا ہنر استعمال کر لیا تھا۔

”نہیں۔“ زہرہ نے چیخ کر پولیس والے کے تبصرے و تجربے کی نفی کر دی۔

”مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا۔“ اس نے اپنا ہاتھ بھی چھڑا لیا۔ عاشق سمیت سب کے رنگ سفید پڑ گئے۔

آپاں جی کی بہو جو دم بخود تھی، بھاگ کر زہرہ کے برابر بیٹھ گئی۔ عاشق لڑکھڑا گیا، اسے اس بہت پڑھی لکھی اور با اعتماد نظر آتی عورت سے خوف محسوس ہوا تھا۔

عبداللہ کی عقابی نظریں صورت حال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس طرح تو تماشا ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ برطانوی بہو کی جگہ ناہید ہوتی تو وہ الٹے ہاتھ کا جھانپڑ لگا کر اندر لے جاتا۔ مگر اس نے گردنیں نکال نکال کر دیکھتے مردوزن کو دیکھا۔

”آؤ جی..... روٹی کھل گئی ہے۔ صبح سے سب بھوکے ہیں۔“ اس نے ایسی صدا لگائی جس پر بلیک کہنے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر چڑھتے لپکے۔ اس نے گزارش بھرے انداز میں پولیس والوں کو بھی بسم اللہ کرنے کا کہا۔ جیسے ششکار نے سے کبوتروں کا غول اڑ جاتا ہے اور میدان خالی ہو جاتا ہے۔

عبداللہ کا نسخہ تیر بخد ف ثابت ہوا تھا۔ وہ نے تلے قدم اٹھاتا، زہرہ کے نزدیک آ گیا۔ عاشق کا دم حلق میں اٹک گیا۔ عبداللہ تشہد کے انداز میں بیٹھی زہرہ کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ برطانوی بہو کے چہرے پر رونق ابھری۔ وہ بے ساختہ پیچھے سرک گئی۔ زہرہ کی آنسو بھری گدلی آنکھیں، امید کی کرنوں سے جگر جگر کرنے لگیں۔ مان، یقین بالآخر.....

مگر زہرہ کے بھائی عام بھائیوں سے کچھ ہٹ کر تھے۔ انہیں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی زہرہ کے حسن جہاں سوز کا اندازہ ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ پنڈ

کے وہ لڑکے جن کی ابھی مستیں ہی بھیگی تھیں، زہرہ کو دیکھتے تھے۔

فرعون کے کاہنوں کو یقین تھا، موسیٰ مصیبت بنے گا۔ عبداللہ کو یقین تھا زہرہ مصیبت ثابت ہوگی۔ زہرہ کے لیے فخر کا رشتہ دونوں بھائیوں کو اعتراض نہیں ہوا، کیونکہ ساتھ ہی کرم بھی تو فری کو پیا ہوتا۔

دونوں بھائیوں کی ناک نیچے نہ ہوتی۔ داماد کی ویسی عزت و مدارت نہیں کرنی پڑتی جیسے کسی اور کی کیونکہ فری کا شوہر ہونے کے بعد فخر یعنی بھائی کی آنکھ کرم کے آگے جھکی رہتی، یوں بھی فخر ان دونوں سے چھوٹا تھا، دب کر رہتا۔

عبداللہ ایسا ہی تنگ نظر تھا، جو یقین رکھتا تھا۔ بہنیں اور بیٹیاں صرف نگاہ اور سر کو جھکانے کے لیے ہوتی ہیں۔

اکڑوں بیٹھ کر عبداللہ نے یہ سب زہرہ سے کہہ دیا تھا۔

زہرہ کی امیدیں بلبلیہ ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی نیلی آنکھوں میں موت کی سی سفیدی پھیل گئی۔ وہیں عاشق کی رنگت خوشی سے متمنا لگی۔

”تیری وجہ سے میرا باپ مرا۔“ ہر گزرتا دن کرم کو پھانسی کے پھندے سے نزدیک کر رہا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تو میری کوئی نہیں ہے۔ میں تیرا کوئی نہیں ہوں، اس لیے مجھے کبھی مت پکارنا۔ جی یا مر، اس گلی کی طرف منہ نہ کرنا۔ یہ مرجائے ناں۔“ وہ عاشق کی سمت مڑا۔ ”تو مجھے پیغام مت کہلوانا، میرے لیے تو یہ کب کی مر چکی۔“

”نہیں بھائی۔“ زہرہ نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ عبداللہ نے بری طرح جھٹک دیا، کھڑا ہو گیا۔ ”آپ اندر چلو بھابھی۔“ اس نے برطانوی بہو کو بہت عزت و حلاوت سے کہا، ساتھ ہی ناہید کو اشارہ کیا، وہ اسے اندر لے جائے۔

”اور تم.....“ اس نے عاشق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”لے کر جاؤ اپنی بیوی کو اور پٹا ڈال

کر رکھو۔ کیسے شوہر ہو، ایک عورت کو قابو نہیں کر سکتے۔“

”بھائی۔“ زہرہ کی گدلی آنکھیں عبداللہ کے سر تک اٹھی ہوئی تھیں۔ ”اپنے ہاتھوں سے مار دو مگر اس کے ساتھ نہ بھیجو۔“ اس نے ٹوٹے لہجے میں بامشکل کہا۔

”ہاں۔“ عبداللہ کو جیسے کسی پتھو نے ڈنک مارا۔ ”کرم کے بعد اب مجھے جیل بھیجنا چاہتی ہے۔ او کیسی بہن ہے تو..... کیا بگاڑا ہے ہم نے تیرا.....“

”نہیں بھائی۔“ زہرہ نے اس کے پیر تھام لیے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ”میری عمر لگ جائے میرے بھائیوں کو۔“ وہ تڑپ کر کہنا چاہتی تھی مگر عبداللہ نے پیر جھٹک دیے۔ اس نے چٹکی بجا کر عاشق کو اسے لے جانے کا کہا پر وہ ہلتی نہ تھی۔

مجبوراً عاشق کو اس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ اس نے انگشت شہادت سے زہرہ کی گتلی بجائی۔

”تو سمجھ کیوں نہیں لیتی، تیرا کوئی نہیں ہے میرے علاوہ۔ صرف میں ہوں، میں ہی تھا ہمیشہ سے۔“ اس نے پچکارا۔ ”میں ہی رہوں گا ہمیشہ۔“ وہ چیخا۔

”نہیں۔“ زہرہ کی آواز ایسی بلند بھی ہو سکتی تھی بھلا؟ عاشق نے اس کی گدی سے بال دبوج لیے۔

”باپ مر گیا ہے، آج ماں بھی مر گئی۔ عبداللہ منہ موڑ کر چلا گیا ہے اور رہ گیا کرم۔“ وہ استہزائیہ ہنسا۔ ”کتنی بار کہیوں، اس نے آنا ہی نہیں اور آ بھی گیا تو..... تیرے قتل میں پھر اندر.....“

عبداللہ کے قدم ٹھٹکے، جانے انجانے میں عاشق نے اس کے کلیجے پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ وہ کرم کی رہائی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

اس کے مال کے بدلے، اس کی جان کے بدلے، بس کسی طرح کرم باہر آ جائے۔ کرم بے جرم سزا پارہا ہے۔ اسے کرم کے انکار پر یقین تھا، اس

نے کہا کہ اس نے فیض کو نہیں مارا تو نہیں مارا مگر سوال یہ تھا کہ پھر کس نے مارا؟

گہوار تو کرم کو مجرم ملے کیے بیٹھے تھے مگر عبداللہ آج بھی اصل مجرم کی تلاش میں تھا۔

اس کا دل چاہا وہ آگے بڑھ کر عاشق کا گریبان پکڑ لے۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی ایسی پٹشن گوئی کرنے کی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ ان دونوں پر لعنت بھیج کر اندر بڑھ گیا۔

عاشق نے اسے جبراً کھڑا کر ہی لیا۔

”دیکھ دیکھ اپنی بھائی کو جسے تو آوازیں مار رہی تھی، اس نے تو اندر جا کر کنڈی چار (چڑھا) لی ہے۔ چل شاہش آگے لگ۔“

اس نے سے کھڑا تو کر لیا تھا مگر وہ قدم نہیں اٹھاتی تھی۔ اس کی نگاہیں پلٹ پلٹ کر دروازے کو دیکھتی تھیں، پتا نہیں یک دم کیا ہوا، عاشق سے ہاتھ چھڑا کر اندر کی جانب بھاگی۔ عاشق غیض غضب سے پاگل ہو گیا اور وہ اندرونی دروازہ بجانے لگی۔ عاشق اسے کھینچنے لگا۔ اس نے اتنا دروازہ بجایا کہ ہاتھ شل ہو گئے، اتنا پکارا کہ گلابند ہو گیا۔

”بھائی عبداللہ..... بھابھی..... آپاں جی..... ابا جی..... امی اور کرم.....“ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ عاشق اسے کھینچنے میں ہانپ سا گیا۔ یک دم زہرہ نے دستک دینا بند کر دی، وہ ٹپٹی، عاشق سرعت سے حائل ہو گیا۔

”کدھر؟“ اس کے جبرے کسے ہوئے تھے اور اس نے ہاتھ کو گھونے کی شکل میں کس لیا تھا۔

”گھر.....“ اس کی آواز میں آنکھوں میں لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ وہ قدم اٹھا چکی تھی، مگر رفتار بہت کم تھی۔ عاشق نے آگے ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اسے لے کر چلنے لگا تھا، جیسے پرانے زمانوں میں کمینروں کو لے جایا جاتا ہوگا۔

کڑوی رونی کھا کر آنے والوں کے منہ بکرا رہے ہو چکے تھے۔ جب باہر آ کر انہوں نے یہ منظر دیکھا، بنا پوچھے بتائے سب کو سب سمجھ میں

آگیا۔ عاشق کا سینہ کسی کوہِ پیا کی طرح پھولنے چکپنے لگا، جو جھنڈا گاڑ چکا ہو۔ ہر ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے وہ زہرہ سے مخاطب تھا۔

”یہ سارے تماشاں ہیں، صرف میں ہوں۔ جب وقت پڑا تھا تب سارے پیچھے ہٹ گئے، زہرہ ایسی، زہرہ ویسی..... تب میں نے اپنے نام کی عزت دی اور آج کا سبق کافی ہے تیرے لیے۔ تیرے اپنے بھائی نے دروازے بند کر لیے۔ اب تو اور کس کا دروازہ بجائے گی..... ہیں۔ بول! بولتی کیوں نہیں۔“

اس کا انداز جارحانہ ہو گیا۔ اس نے زہرہ کی گدی میں ایک چپت لگائی اور اس کی خاموشی پر لگاتا چلا گیا۔ جیسے مسجد سے بھاگے بچے کو باپ مارتا ہوا لے کر جاتا ہے۔

”نہ کر عاشق! یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔“ کسی کی آواز پر عاشق چراغ پا ہو گیا۔

اس نے پوری طاقت کا ٹھٹھڑ زہرہ کے سر پر جمایا۔ ”کون بولا..... ہیں، تجھے بڑی ہمدردی ہے۔ تو بھی کوئی پچھلا عاشق ہے کیا؟“

بولنے والا سامنے آ گیا۔ یہ گاؤں کا ڈاکیہ تھا جس کے سفید بال جھاگ سے تھے۔

”تجھے روکنے کے لیے عاشق ہونا ضروری نہیں، انسان ہونا کافی ہے۔“

کوئی مجمع کو چیرتا ہوا آگے آیا تھا۔ دو ٹوک اور بے خوف لہجہ..... زہرہ کا سر جھٹکے سے اٹھا۔ سب تماشاؤں میں کوئی انسان بھی تھا، کوئی جو بتا رہا تھا، وہ روک سکتا ہے۔

رو رو کر سوچی آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔

دائرے کے بیچ میں اب دو کے بجائے تین لوگ تھے۔ زہرہ عاشق اور وہ..... وہ کون..... کون کی پہچان کے لیے اس نے پلکیں زور زور سے جھپکیں مگر کون سے پہلے اس نے عاشق کو دیکھا۔ جس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابل چکی تھیں۔ ساتھ ہی ایک شور ساج گیا، کیا اس کی

حمایت کے لیے اللہ نے کسی فرشتے کو بھیج دیا تھا اور جسے دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے۔

لوگ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے، آوازیں میں حیرت کی جگہ اب خوشی کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا۔ زہرہ نے ہونٹوں کی طرح سب کو دیکھا۔

اور پھر اس فرشتے کو، جس نے اپنا ہاتھ عاشق کے شانے پر گاڑ دیا تھا۔ وہ زبان سے بھلے ایک لفظ نہ کہتا، مگر اس کا وہ رکھا ہوا تھا ہاتھ..... اور عاشق کی آنکھوں میں گڑی بے خوف آنکھیں.....

تو عاشق حسین غلط کہہ رہا تھا کہ زہرہ کے لیے کوئی آگے نہیں آئے گا۔

کوئی عاشق سے باز پرس نہیں کر سکے گا اور کوئی.....

زہرہ کی دھندلی سوچی آنکھیں دیر ہی سے سہی نو وارد کی پہچان کے مرحلے سے گزر گئیں۔ جب عاشق بار بار کہتا تھا کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں اور اس کے دل سے آواز اٹھتی تھی۔

”نہیں، ایک شخص ہے، ایک تو ہے ہی.....“ تو وہ ایک آگیا تھا، اپنی ٹانگوں پر چل کر..... کھڑا ہوا تھا۔

زہرہ کو غش آ گیا، وہ پورے قد سے زمین پر آ رہی۔

نو وارد شہر سے گاؤں کو جوڑنے والی سڑک کا وہی واحد مسافر تھا، جسے دیکھ کر چائے والے حفیظ پر شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔ جسے حفیظ نے گود میں اٹھا لیا تھا اور اس کا منہ چوم لیا تھا۔

نو وارد میں آس تھی، جو زہرہ کے لاشعور میں بسی ہوئی تھی۔

وہ دعا تھا، جسے مانگنا اس نے کبھی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ بس ایک بار اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔

نو وارد عاشق حسین کا وہ خدشہ تھا جیسے کسی نے پگڑی میں دو موہنا چھپا رکھا ہو۔ ایک خیال یہ تھا جسے وہ جھٹکتا تھا جس کے نہ آنے کی یقین دہانی وہ زہرہ کو مار مار کر داتا تھا۔ جسے وہ زندہ لاش کہتا تھا۔

جب اس کی روتی دھوتی ماں بہن اسے یہاں سے لے کر گئیں۔ تو وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں لوٹھڑے کی صورت اس کے پیچھے زمین پر گھسٹی تھیں۔ مارنے والے نے اس کے گھٹنوں کے اوپر نشانہ باندھ کر ہاکیاں اور ڈنڈے برسائے تھے۔

سب کو اس کے ہوش میں آنے کی فکر تھی، بس وہ ایک بار ہوش میں آ جاتا تو سب ٹھیک ہو جاتا مگر اسے ایسا ہوش آیا تھا کہ آنکھیں کھلی اور نیم وا ہونٹوں سے کراہیں ابھرنے لگیں۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ رگوں میں خون رواں تھا، مگر سر کے پچھلے حصے کی چوٹ نے گردن کی ہڈی کو نقصان پہنچایا تھا۔ اس کا ڈیلا پھر گیا تھا، وہ تھوک نہیں نکل سکتا تھا جس کی وجہ سے باجھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ اس کا دماغ جسم کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ اس سے اچھا تو وہ مر جاتا، ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اچھا علاج..... توجہ..... اس کی ماں بہن نے اس جوان جہان مرد کو پھر سے پالنا شروع کر دیا۔ اس کی پرورش شروع کر دی، انہیں پتا تھا، وہ اسے ٹھیک کر لیں گی۔

مائیں ایسی خوش فہمیوں کے سہارے مزے سے جی لیتی ہیں، سب نے سوچا، عاشق اسے زندہ لاش کہہ کر ہنستا تھا (زہرہ کے آنسو دل پر گرتے)۔ لیکن آج اس وقت اسی تن مردہ میں جان پڑ گئی تھی۔ زہرہ کے گالوں پر طمانچے رسید کر کے عاشق اسے ہوش میں لے آیا اور اسے آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لوگ فخر کو جی بھر کے دیکھنے کی خوشی منا چکنے کے بعد ایک انتہائی سنسنی خیز انجام کے منتظر تھے۔

میت والے گھر کے باہر خوشی و مسرت کے قہقہے اور نعرے..... عبداللہ کو باہر لے آئے۔ ہر شخص فخر کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی ٹانگوں پر کھڑا فخر

عبداللہ کو مجسمہ کر گیا، اس نے اپنی ماں شمیم کو فخر کے لیے بھی گڑگڑا کر دعائیں کرتے دیکھا تھا۔ جس پر وہ شمیم سے جھگڑ پڑا۔ اسے صرف کرم کے لیے دعا مانگنی چاہیے تھی۔ فخران کا کون تھا، کوئی بھی نہیں۔

اور اسی مسترد شدہ کردار نے عاشق کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ وہ اسے اس غیر انسانی سلوک کی اجازت نہیں دے سکتا۔

”تجھ سے اجازت مانگ کون رہا ہے، بیوی ہے میری۔“ عاشق نے پتھرائی ہوئی آنکھوں والی زہرہ کے ہاتھ پر گرفت کس لی۔

”اب نہیں رہے گی۔“ فخر کے اعلان نے سب کو چونکا دیا۔ عاشق کا رنگ بدل گیا۔ فخر کے جھٹکا دینے سے زہرہ کا ہاتھ خود بخود چھوٹ گیا۔

”او کیسے نہیں رہے گی میری بیوی۔“ عاشق نے دوبارہ ہاتھ تھاما۔

”چل..... چلتی کیوں نہیں۔“ اس کی رنگت سیاہ پڑ رہی تھی، اس نے بے تابانہ عبداللہ کو پکارا۔ ”دیکھ بھائی عبداللہ۔ یہ پھر سے تمہاری عزت کا تماشا لگوانے آ گیا ہے۔ اسے اپنی زبان میں روک لو میں..... ورنہ.....“ وہ تیز تیز لہجے میں بولنے لگا۔

عبداللہ کی نگاہیں فخر پر جا رکیں، جو سینہ تان کر کھڑا عاشق کو گھور رہا تھا۔ اس کی رحم بھری نظریں زہرہ پر جا جا کر پلپتی بھی تھیں۔ وہ آزاد فضا میں کھڑا تھا جبکہ کرم.....

نفرت کا ایک تیز ابال عبداللہ کے رگ وے میں سرایت کر گیا۔ وہ ہوتا کون تھا، زہرہ کی گریہی میں دخل دینے والا اور پھر وہی آخری سوچ کہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا سبب فخر ہی تو تھا۔

”یہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر گلی میں کیوں آ گیا اور آپ کو لگتا ہے

یہاں پوی ہیں۔ وہ آقا ہے اور یہ غلام۔ کیا آپ
ناہید بھابھی کو ایسے لے کر چلتے ہیں محلے میں۔ اگر
آج تاؤ سیف اللہ زندہ ہوتے تو.....“
”آج تاؤ سیف اللہ کے زندہ نہ ہونے کی
وجہ بھی تم ہو اور اس کے اس حال کے ذمہ دار بھی تم
اور.....“

”تو میں اس کا حال درست کرتا ہوں۔ تاؤ کو
زندہ کرنا میرے بس میں نہیں، تم اس کے ساتھ نہیں
جاری ہو۔“

وہ عاشق و زہرہ کے بیچ حائل ہو گیا۔ عاشق کی
برداشت جواب دے گئی، وہ اور فخر گتھم گتھا ہو گئے۔
عبد اللہ ایک پل ساکت رہنے کے بعد بچاؤ
کے لیے بڑھا مگر صاف دکھائی دیتا تھا، وہ عاشق کا
جمایتی ہے۔ ایک شور مچ گیا۔ فخر کو لمبے کے بل
گر گیا، عبد اللہ نے زہرہ کا ہاتھ عاشق کے ہاتھ میں
میں پکڑا اور آگے کودھکیلا۔

”جا.....“ زہرہ کی نگاہیں فخر پر تھیں۔ وہ
قدموں پر چل کر آ گیا تھا، مگر توانائی نہیں تھی۔ اس کی
چال بھی متوازن نہیں تھی۔

عبد اللہ نے زہرہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
”کسی خیال میں مت رہنا، تجھے اسی کے
ساتھ رہنا ہے، جیسے کرم کو جیل میں رہنا ہے۔ اسے
نجات دہندہ سمجھ رہی ہے مگر میں یہ ہونے نہیں دوں
گا۔“ اس نے فخر کی طرف اشارہ کیا۔

عاشق کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی۔ فخر کھڑا
ہو گیا۔ وہ شدید بے یقینی اور صدمے سے عبد اللہ کو
دیکھ رہا تھا۔ عاشق کا اعتماد اور حق بحال ہو گیا تھا۔ وہ
دائرے سے نکلنے لگا، لوگ دائیں بائیں ہو کر راستہ
بنانے لگے۔ دائرے کے باہر گاڑی تھی، یہ راستہ
واصل اسے دیا جا رہا تھا۔

فخر کے شدید صدمے میں گھرے چہرے پر
رونق ابھری۔

وہی نظریں جب عاشق پر پڑی تو ان میں
نفرت و غضب چھلکنے لگا۔

”ادھ، تو تم ہو۔“

آنے والے دو مرد عاشق کے دائیں بائیں
ایسے کھڑے ہو گئے، پھر فخر کے چہرے کی رونق،
عبد اللہ کے چہرے کی بے رونقی اور دائرے میں
کھڑے لوگوں میں سے کچھ جو آنے والوں کو نہیں
پہچانتے تھے۔ انہوں نے ان سب کو زہرہ کا رشتہ دار
سمجھا بلکہ ہمدرد..... ورنہ رشتے دار یہاں جنازے پر
بہت اکٹھے ہوئے تھے مگر سب نے عبد اللہ کا منہ دیکھا
تھا۔

یہ کون تھیں، جنہوں نے زہرہ کو خود سے لپٹا لیا
تھا، بکھرے بال سمیٹے تھے اور شانے پر گرے آچل کو
سیر پر اوڑھاتے ہوئے اپنے آجانے کی نوید سنائی
تھی۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ خود کو نجات دہندہ
کہہ رہے ہوں۔

زہرہ کی آنکھوں میں پہچان نہیں تھی لیکن
طمأنیت تھی۔ تب ہی پیچھے سے ایک پر جوش مگر
طمأنیت بھری صدا نے سب کو متوجہ کر دیا۔

”شکریہ آپ لوگ آگئے۔“ یہ آپاں جی کی
برطانوی بھونگی اور آنے والے ایک بہت نیک نام
اور فعال این جی او کے اہلکار تھے، جو دیہاتی علاقوں
میں عورتوں اور بچوں پر ڈھائے جانے والے مظالم و
نا انصافیوں کے لیے کام کرتے تھے۔

عبد اللہ سمیت دیگر لوگوں نے کیا سمجھا تھا،
برطانوی بہوان کے گھر محلے کی عورت تھی جو مردوں
کی ایک جائز ناجائز دھاڑ پر دبک جاتی ہیں یا وہ اتنی
آسانی سے پولیس والوں کے رویے کو قبول کر لے
گی۔

اس کا دماغ اور ہاتھ تیزی سے کام کر رہے
تھے۔ یہ جو دیر ہوئی یہ جائے وقوع کے دور ہونے
کے باعث ہوئی تھی حالانکہ آنے والوں نے ہائی
روف کو بھگایا تھا۔

☆☆☆

”تم رہنا چاہتی ہو اس شخص کے ساتھ؟“
معاملہ سمجھنے کے لیے سارا واقعہ از سر نو سننا ضروری

تھا۔

برطانوی بہو کی شکایت اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکی تھی کہ ”وہ آدمی اپنی بیوی کو بری طرح پیٹ رہا ہے اور اگر ایسے ہی مارتا رہا تو اس کی جان لے لے گا۔ آپ بس جلدی آ جائیں۔“

اب پوچھنے پر ہر شخص بولنے لگا، زہرہ دم بخود تھی کہ سارا گاؤں واقف تھا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عبداللہ بے خبر ہوتا۔ بھائی سخت مزاج تھا، حالات نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا مگر وہ ایسا بے حس ہو چکا تھا کہ کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔

اسی لیے شیم تڑپ تڑپ کر آتی تھی اور زہرہ کے لاکھ کہنے پر بھی یقین نہیں کرتی تھی کہ ”وہ ٹھیک ہے“

عاشق بھی ہکا بکا تھا، وہ تو جو کرتا تھا۔ یہی سمجھا تھا کہ کسی کو خبر نہیں۔

ایک محلے دار نے اپنی بیٹھک کھول دی، سب وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ برطانوی بہو بار بار عاشق کے مارنے کو پھٹی آنکھوں کے ساتھ دہرائی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ ابھی بلیک وارنٹ لے لیتی، عاشق قطعاً بیٹھک میں جانے کو تیار نہیں تھا مگر جب آنے والی عورتیں زہرہ کو کندھے سے لگائے اندر لے گئیں، تو اسے بھی آنا پڑا۔ ہر شخص اندر گھس جانا چاہتا تھا۔ فخر اندر چلا گیا، تب کچھ سوچ کر عبداللہ بھی آ گیا۔

عاشق اپنی صفائی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے، مگر بس آج غصہ آ گیا بس وہ ان دونوں کو جانے دیں۔

”اگر لڑکی بھی یہ کہہ دے گی تو سوچیں گے، ہاں بھئی بولو۔“

”ہاں ہاں زہرہ، بول..... بول ناں۔“ عاشق نے منت بھرے انداز سے شروع کیا اور اس کی خاموشی۔

”مم..... یہ مجھے جان سے مار دیں گے۔“

”اوہ یعنی..... وہ عاشق کے ساتھ نہیں جانا

چاہتی، جواب مل گیا تھا۔ وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ ابھی تک خواب سمجھ رہی تھی کہ اسے نجات دلوانے کے لیے اتنے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔

عاشق کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں، وہ ہانپنے لگا۔

”عورت ساتھ نہیں رہنا چاہے، تو کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔ یہ حق پاکستان کا قانون بھی دیتا ہے اور اس سے پہلے اللہ.....“

”کک..... کیا..... کک..... کیسے؟“ اٹک اٹک کر بولتی زہرہ کے سوال کی عجلت نے سب کو چونکایا۔

”تم خلع لے سکتی ہو، اب تو یہ فیصلہ بہت جلدی مل جاتا ہے۔ تم کہو گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں وکیل کر کے دیں گے۔ تمہیں شیلٹر بھی دیں گے۔ شیلٹر مطلب..... چھت۔ رہنے کی جگہ، وہاں ہنر بھی سکھاتے ہیں۔ تم اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ گی، کسی کی محتاجی نہیں رہے گی۔ تم تعلیم حاصل کر سکتی ہو، تم.....“

خاتون اہلکار بتا رہی تھی، جیسے زندگی آ دے رہی ہو۔

”یہ.....“ زہرہ کی انگلی اٹھی۔ ”یہ نہیں دے گا۔ وہ خلع.....“

”تم لینا چاہتی ہو۔“ پوچھنے والی نے اک نگاہ غلط انداز عاشق پر ڈالی اور نرمی سے پوچھا۔

زہرہ کی نظریں سب پر اٹھ گئیں، برطانوی بہو کا سرتیزی سے اثبات میں مل رہا تھا۔ اس نے دیکھا، حمیدہ جو سب سے پیچھے دیوار کے ساتھ لگی ہے۔ اس نے پلکیں جھکا کر ہاں کہنے کا اشارہ کیا۔

”اوہ.....“ اس نے فخر کو بے چینی سے پہلو بدلتے دیکھا، نگاہ ملی وہ واضح اشارہ تو نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

وہ کہہ رہا تھا، وہ بے فکر رہے، وہ ہے ناں..... وہ..... عبداللہ اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے ہاتھ مار کے پڑوسی کی بیٹھک کا گلدان زمین پر دے مارا۔ اس

نے فخر کی یقین دہانی کو دیکھ لیا تھا۔

”ہمیں کوئی خلع نہیں لینی، چل اٹھ میں خود تجھے تیرے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ آپ لوگ جاؤ جی، ہمارے مسئلے ہمیں خود حل کرنے آتے ہیں۔“ اس نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

عبداللہ کے اس عمل نے عاشق کے اندر جناتی قوت ڈال دی۔ وہ بھی چاق و چوبند سیاہی کی طرح کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے اس کی کپکپاہٹ کو ہر شخص نے حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ حیران تھا، جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ ہو کیا رہا ہے اور بری طرح خوف زدہ بھی، یک دم اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا خود پر چڑھایا، عاجزی کا ملمع اتر گیا۔

وہ زہرہ کے گال پر طمانچہ رسید کرنا چاہتا تھا۔ جب ایک اہلکار نے راستے میں اس کا ہاتھ روک کر اس کی مشقیں کس دیں۔ عاشق پھڑپھڑانے لگا۔ این جی او کی آمد کا سن کر پولیس والے بھی آگئے تھے ورنہ سب بے پہلے وہی پھتے۔ عاشق اب ساری مصیحتیں بالائے طاق رکھ کر زہرہ پر حملہ کر دینا چاہتا تھا۔

”دیکھو عبداللہ! تو کر فیصلہ؟ میری بیوی قبضے میں کر لی ہے ان لوگوں نے۔“

عاشق کو عبداللہ ہی سے حمایت کی توقع تھی اور عبداللہ نے اسے مایوس نہیں کیا۔

”یہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے جی، کوئی بڑی بات نہیں۔“

وہی ٹھکی پٹی بات، زہرہ کی لبریز آنکھوں میں ٹپکوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا، جس میں بے بسی تھی۔

عبداللہ مستم مزاج تھا، جس سے بیر پال لیتا سے قبر تک نباہتا تو پھر وہ اس کی جان ہی لے لیتا۔ اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا اور زہرہ کو اس اذیت ناک زندگی سے نجات مل جاتی۔

سینئر اہلکار کو عبداللہ کے سرسری لہجے نے بری طرح چونکا دیا۔ شام رلت کا لبادہ اوڑھنے کو تھی، اسے

ابھی اس معاملے کو کہیں نہ کہیں تو پہنچانا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پوچھنے والا سوال سب سے آخر میں پوچھا۔

”ہاں بھئی، تم رہنا چاہتی ہو اس شخص کے ساتھ، گھر جاؤ گی؟“

زہرہ کے جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ ایسا زندگی بخشے والا سوال اس سے پوچھا جائے گا، اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ عاشق نے اپنے پیر زور زور سے زمین پر مارے۔

زہرہ کی آنکھوں میں نمودار ہوئی امید کا دیا ٹمٹمانے لگا۔ وہاں خوف کی تاریکی چھا گئی تھی۔

”گھر ہی جائے گی اور اس نے کہاں جانا ہے؟“ عبداللہ نے لہجے کو اور بے ضرر کر لیا مگر اس میں مخفی دھمکی، زہرہ کی ریڑھی کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔

فخر نے پہلو بدلا، وہ کہنا چاہتا تھا۔ عبداللہ اپنی زبان اس کے منہ میں نہ دے۔

”یہ.....“ اس نے عاشق کو دیکھا۔ ”اور.....“ اس نے نام نہیں لیا، عبداللہ کے قطعی جارحانہ اعلان نے عاشق کے چہرے کی رونق بحال کر دی۔

”تجھے خلع لینے دوں تاکہ تو اس کے ساتھ جا کر ہنسی خوشی زندگی گزارے اور ادھر کرم.....“ اس کی پھنکار جیسی سرگوشی ہر ایک نے سنی۔ ”وہ قید رہ کر سزا بھگتے گا تو تو آزاد رہ کر۔“

زہرہ کے چہرے پر خوف ابھرا اور پھر سب چونکے۔ عاشق بھونچکا رہ گیا۔

زہرہ کے خوف پر اعتماد غالب آ گیا تھا۔ اس نے عبداللہ کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑوا لیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہو کر این جی او کی اہلکاروں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی۔

”میں خلع لوں گی۔ میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ مجھے آزاد کروادیں۔“ وہ گڑگڑانے لگی۔ عبداللہ اس پر پلن پڑنا چاہتا تھا مگر اسے روک دیا گیا۔

2018 اکتوبر 145

فخر کی یقین دہانی کو دیکھ لیا تھا۔

ہمیں کوئی خلع نہیں لینی، چل اٹھ میں خود تجھے تیرے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ آپ لوگ جاؤ جی، ہمارے مسئلے ہمیں خود حل کرنے آتے ہیں۔

عبداللہ کے اس عمل نے عاشق کے اندر جناتی قوت ڈال دی۔ وہ بھی چاق و چوبند سیاہی کی طرح کھڑا ہو گیا۔

حالانکہ تھوڑی دیر پہلے اس کی کپکپاہٹ کو ہر شخص نے حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ حیران تھا، جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ ہو کیا رہا ہے اور بری طرح خوف زدہ بھی، یک دم اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم کل ہی کیس فائل کریں گے۔“

وہ آپس میں بات کرنے لگے۔ عبد اللہ خون آشام نگاہوں سے زہرہ کو دیکھ رہا تھا، سب اپنی بولیاں بولنے لگے۔ ایک عاشق تھا جو کھڑے کھڑے کانپ رہا تھا۔

اہلکاروں کے بیچ بیٹھی زہرہ اسے دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب لوگ جو میاں بیوی کا معاملہ کہہ کر خود کو بری الذمہ کر دیتے تھے۔ چلو تو ادھر کو ہوا ہو جدھر کی مصداق..... زہرہ کے حامی دکھائی دینے لگے۔ عاشق کا پورا وجود جھنجھٹا اٹھا۔ اس نے کسی نشے باز کی طرح اپنی ٹوٹی بانہوں کو کسا تھا، سر جھٹکا تھا۔

فخر اچانک اہمیت اختیار کر گیا، سب اس سے بات کرنے کو بے تاب تھے۔ ہر ایک جب قریب جاتا گلے لگا کر نئی زندگی اور صحت یابی کی مبارک باد دیتا۔

عاشق نے عبد اللہ کو بے بسی آمیز پیش میں گھر کر پر توالتے ہوئے دیکھا۔ اسے زہرہ کی جھلک سی نظر آئی، نجانے کیا طے ہوا تھا۔ وہ..... اس کی زہرہ کو کہیں لے جا رہے تھے۔

پھر وہ اسے کبھی دکھائی نہ دیتی اور زہرہ کو دیکھو، وہ کیسے جا رہی تھی۔ عاشق سے منہ پھیر کر حالانکہ اس نے ہر گھڑی اسے اپنی بے پناہ محبت کا بتایا تھا۔ وہ جو اس کی آس تھی ہمیشہ سے، وہ اسے اس طرح ذرا سی بات پر چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ ہاں اس سے غلطی ہو گئی اسے اس طرح ماں کے جنازے میں شرکت سے نہیں روکنا چاہیے تھا تو وہ اس سے معافی مانگ لیتا ہے۔

وہ یک دم اس کے روبرو ہو کر گھگھیا نے لگا۔ وہ معافی بہت اچھے طریقے سے مانگتا تھا، جیسے تائب ہو گیا ہو۔ زہرہ ہر بار معاف کر دیتی تھی (پایہ کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا) مگر اس بار اس نے نیپی میں سر ہلایا۔ وہ ان اجنبی لوگوں کے ساتھ جا رہی تھی، اسے چھوڑ کر.....

”تو نہیں جاسکتی۔“ اس نے اس بار اس کا پلو پیچھے سے تھاما تھا۔

”میں تجھ سے عشق کرتا ہوں زہرہ! میرے علاوہ اور کوئی تجھے ایسے نہیں چاہ سکتا تو میرے عشق کی طاقت سے واقف ہی نہیں۔ تجھے پانے کے لیے میں نے دعائیں کیں، کوششیں کیں زہرہ! راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پار لگا دیا۔ اس فیض پر سوتے میں حملہ کر دیا زہرہ! پھر میں نے اسے جان سے مار دیا۔ الزام لگ گیا کرم پر..... مجھے کرم سے بھی بدلہ لینا تھا، اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ کہتا تھا میری بہن کا نام کیسے لیا۔ اس کی تو بہن تھی، میری تو زورا تھی ناں۔ میں نے اپنی ماں کو بھیجا تھا ماموں سیف کے پاس، میں نے خود ماموں سے بات کرنے کی کوشش مگر کسی نے سمجھا ہی نہیں۔“

اور تجھے بھی یہ فخر اچھا لگتا تھا، میں اسے بھی مار دینا چاہتا تھا مگر.....“

عاشق کے جنونی اعتراف نے وہاں موجود ہر شخص کے قدموں سے زمین کھینچ لی۔ زہرہ کے دونوں ہاتھ ہونٹوں پر جار کے۔ اس نے فخر کو دیکھا، جو پھٹی آنکھوں سے عاشق کو دیکھ رہا تھا۔ عبد اللہ کے دروازے کی طرف بڑھتے قدم جکڑے گئے تھے، بے یقینی اور صدمے سے عاشق کو دیکھتے ہوئے اس کے حلق سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔

اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا وہ کسی خون خوار چیتے کی طرح عاشق پر پل پڑا، جو بولتے بولتے رو پڑا تھا اور قمیص کے دامن سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ عبد اللہ میں سو پہلوانوں کی طاقت حلول کر دی گئی تھی۔

”تو..... تو.....“ وہ بس ایک لفظ کہہ رہا تھا۔

”تیری وجہ سے..... میرا بھائی..... تو نے میری بہن پر ایسی گندی نظر رکھی۔“ اسے بہن بھی یاد آ گئی۔

”گندی نظر۔“ زہرہ کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ ”اس نے اس کی بہن کو خود اپنے آپ سے نظر ملانے جو گا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایک سال اس

فیض اس سے بدلہ لینے باغ میں پہنچ گیا۔ انسپکٹر درست سمت میں جا رہا تھا۔

”ہاں..... وہ ڈیرے والے واقعے کا بدلہ لینے آئے تھے۔ میرا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ میں چاہتا تھا وہ فخر کو اتنا ماریں، اتنا ماریں کہ وہ مرجائے۔ مگر فیض نے زور اسے بدتمیزی شروع کر دی۔ میں نے سوچا، مجھے بھاگ کر جا کر زور کو بچانا چاہیے۔ اس طرح میری عزت بڑھ جاتی، اس کی نظر میں۔ مگر تب ہی ادھر فخر کا کتا ستوا گیا۔

ان سب کو بھاگنا پڑا۔ زور ابے ہوش فخر کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے کرتے خود ہی بے ہوش ہو گئی۔ میں نے کچھ بھی منصوبہ نہیں بنایا تھا جی، مگر بس سب خود بخود ہو گیا۔ فیض اپنے ڈنڈے ہاکی وہیں چھوڑ گیا تھا، میں نے پوری طاقت سے فخر کے گودوں (گھٹنے) پر ڈنڈے مارے۔ میں اسے زندگی بھر کے لیے لولا لنگڑا کرنا چاہتا تھا پھر وہ زہرہ کے قابل نہ رہتا مگر مجھے خیال آیا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کی لاشی بن جاتی۔ میں نے سوچا، ایک بڑا پتھر اٹھا کر فخر کا سر پچکا دیتا ہوں۔

مگر ایسا پتھر نہ ملا، میں نے اس کے بے ہوش سر کے نیچے نوکیلے پتھر رکھے اور دونوں ہاتھوں میں اس کا سر پکڑ کر زمین پر مارتا گیا، جیسے پتھر سے پتھر کو توڑتے ہیں، مگر ادھر کرم آ گیا۔

مجھے خیال آیا میں کرم کو بتاؤں کیسے فیض نے اس کی عزت پر حملہ کرنا چاہا اور میں نے اسے بچایا۔ مگر تب ہی مجھے یاد آ گیا، کرم نے کیسے مجھے راستے میں روک کر مارا تھا، کہتا تھا۔ تیزی اتنی جرات کہ میری بہن کے بارے میں سوچا۔ اس نے مجھے یہ بھی کہا۔ ”خود کو دیکھا ہے کبھی؟“

اور کوئی میری شکل پر بات کرے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا مگر اس دن میں اسے منہ توڑ جواب نہ دے سکا مگر..... میں فوراً بھاگ کر چھپ گیا۔ کرم ہکا بکا ادھر کھڑا تھا۔ وہ کبھی بے ہوش زہرہ کے گال تھپتھپاتا تھا کبھی فخر کا چہرہ ہلاتا، اس کے

چاتل کے ساتھ صبح شام کرتی رہی۔ وہ پورے قد سے زمین پر گری تھی۔ عاشق کو عبد اللہ سے چھڑانے کے لیے ہر شخص نے کوشش کی۔ وہ اسے لہو لہان کر چکا تھا۔ عبد اللہ کے گھونسوں نے اس کی ناک کی ہڈی توڑ دی تھی۔ عبد اللہ کو سنبھالنا پارے پر انگلی رکھنے کے مترادف تھا۔ عبد اللہ کے گھونسوں نے عاشق کے سامنے کے دو دانت توڑ دیئے تھے۔ ہونٹ پھیڑ دیا، آنکھ کے نیچے سیاہ رنگ کا نیل تھا، آنکھ کھلتی نہ تھی اور ایسے میں وہ اور کرم سے نظر آتا تھا، جتنا کہ تھا۔ زبان دانتوں میں چبائی گئی تھی، سو بولنے میں بہت تکلیف تھی اور اس کے کہے الفاظ سمجھ نہیں آتے تھے، مگر انسپکٹر کو اسے سننا تھا۔

”شروع سے ایک ایک لفظ کہتا جا۔“
”شروع سے.....“ عاشق کے لیے خیالات کو مجتمع کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔
”فیض پر سوتے میں حملہ تو نے کیا تھا؟ اور نام فخر کا لگا دیا۔“

”زور سینٹر جاتی تھی، میں بس اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے صبح سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ پھر وہاں فیض آ گیا۔ میں نے دیکھا۔ زور کو یہ چیز پسند نہیں آئی تھی، اس نے زور اسے بدتمیزی کی۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اسے سبق سکھاؤں گا۔ میں تو اسے مار کے آ گیا تھا، میں نے فخر کا نام نہیں لگایا تھا۔ وہ تو فیض نے خود ہی مشہور کر دیا کہ فخر نے مارا ہے۔ مجھے بڑا برا لگا، میں نے تو سوچا تھا کہ میں زور کو جا کر اپنا کارنامہ بتاؤں گا کہ دیکھ جس نے تجھے تنگ کیا۔ میں نے اس کا کیا حشر کیا، کتنا خیال تھا مجھے اس کا، وہ خوش ہو جاتی۔

میں تو یہ بھی سوچ کر گیا تھا، فیض کو اپنا نام بتاؤں گا، مگر پھر مجھے خیال آیا ایسے زور کے نام سے منہ لگے گی۔ میں اپنی پاک محبت کو لوگوں کے منہ تک پہنچانا چاہتا تھا.....
”فخر فخر کے بھلیکے (خیال، اندازے) میں

ہاتھ فخر کے خون سے رنگے گئے۔

میرا دماغ تیز تیز چلنے لگا۔ فخر کو اپنے حساب سے میں مار چکا تھا، الزام کرم پر لگتا کرم اندر..... فخر..... بالکل اندر..... اور پھر زہرہ میری ہو جاتی مگر.....

وہ بولتے بولتے تھک گیا، شکست خوردہ اور مایوس نظر آنے لگا۔ آنکھیں خلا میں مرکوز تھیں۔
”مگر.....“ انسپکٹر نے اسے سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے کہا۔

”فخر بھی بچ گیا اور کرم بھی..... اور اس کے بعد فیض بھی بچ گیا۔“ اس کے لہجے میں بے بسی آمیز سفاکیت در آئی۔ ”تینوں بچ گئے، ساری کھیڈ مک گئی (سارا کھیل ختم ہو گیا)۔

میں نے ساری ساری رات جاگ کر سوچا جی، قسمت ایسے موقع بار بار نہیں دیتی جی۔ اللہ نے میرے لیے سارے راستے سیدھے کر دیے تھے۔ اب آگے مجھے اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے تھی ناں؟ سارا پنڈ فخر کا حال پوچھنے جاتا تھا۔ میں تو روز ہی جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا، وہ بچ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ میں نے کتنی بار اس کی جان لینے کا منصوبہ بنایا مگر کمہاروں نے اس کی زندگی کی حفاظت کے لیے سخت پہرہ لگا رکھا تھا۔ انہیں عبد اللہ سے خطرہ تھا کہ وہ اسے مار دے گا تا کہ فیض جیل سے باہر نہ آ سکے اور کرم آزاد ہو جائے۔ ادھر زورا کے بیان سے کرم باہر آیا۔ فیض اندر گیا، پھر فخر کو ہوش آیا، تب فیض بھی باہر آ گیا۔

تب میں غصے سے پاگل ہو گیا جی اور میں نے فیض کو مار دیا۔ الزام کرم کے سوا اور کسی پر لگ سکتا، ہے ناں جی؟“

اس نے بالآخر قصہ ختم کر کے خود کو تعریف کا مستحق سمجھا۔ انسپکٹر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”اس بات کا یقین تھا تجھے کہ اب زہرہ تیری ہو جائے گی؟“

”بالکل نہیں تھاتی، اس کے لیے مجھے ہر ایک

کو بتانا پڑا کہ زہرہ فخر کے ساتھ خراب تھی۔ مجھے یقین تھا، اب اس پر پنڈ کا کوزہ بھی نہیں ٹھو کے گا۔“

اس کا لہجہ شاد ہو گیا، انسپکٹر نے ماتھے کے پاس سے اس کے بالوں کا کچھا پکڑ لیا اور اپنے ہاتھ کا ٹھپڑ رسید کیا۔ انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی پتلون اوپر کی اور ٹھپڑ لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایسا ہی اپنے ہاتھ کا ایک ٹھپڑ اپنے منہ پر رسید کرے کہ کھوپڑی کی ہڈیاں پیچ جائیں۔

اس نے اپنے تئیں اس کیس کو بہت مہارت سے حل کیا تھا۔ عاشق کا اعتراف جرم دراصل اس کا اعتماد و کارکردگی اور تجربے کے اوپر لگتا تھا۔

”زہرہ ہی کیوں؟“ طیش میں گھر کر اس نے اس بار عاشق کے بال گدی سے پکڑے تھے۔ عاشق کی گردن پیچھے ڈھلک گئی۔ ”جبکہ تو کہہ رہا ہے کہ وہ فخر کے علاوہ کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں تھی۔ تو نے خود کو کبھی دیکھا تھا، ہیں؟“

انسپکٹر نے گدی پر اتنا دباؤ بڑھایا کہ عاشق کا نچلا دھڑا کر گیا۔ اس کی گردن کرسی کے پچھلے حصے پر گڑ چکی تھی۔

انسپکٹر کے آخری جملے پر تکلیف کی شدت۔ بھرائی ہوئی آنکھیں انسپکٹر کی آنکھوں کے ساتھ باہم ہو گئیں۔ انسپکٹر کا چہرہ اس کے چہرے پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ان کی ناک آپس میں ٹکرانے کو تھی۔ انسپکٹر نے جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا، وہ حیران تھا، عاشق مسکرایا تھا۔

☆☆☆

”بچپن میں چمپک نکل آئی تھی، اس کے نشان۔ یتیم تھا ماں نے لکڑی کا کام سکھانے کے لیے بٹھا دیا۔ استاد نے ذرا سی غلطی پر نوکلی لکڑی اٹھا کر ماری تو یہ.....“ اس نے گال پر انگلی رکھی۔ ”ساری جگہ پھٹ گئی ڈاکٹر نے ایسے بانٹے لگائے جیسے موچی جتی گندتا ہے (موچی جوتی گانٹھتا ہے)۔

آنکھ کے بالکل نیچے اسکیل سے چھنی سیدھی لکیر تھی جو ٹھوڑی کی باہر جا کر رک گئی تھی۔ ٹانگے

ایسے تھے جیسے کانٹے دار جھاڑی، رنگ بھی کالا تھا۔
 ماں کہتی تھی تو شہزادہ ہے، جھوٹی عورت.....
 پنڈ کے سارے منڈے مجھے بھوت کہتے تھے۔
 بچوں جماعت میں تھے ہم سارے۔ پنواری نے
 اپنے ہتر شجاعت کی منگنی کردی اس کی پھوپھی کی کڑی
 سے..... اس کی پھوپھی نے اسے سونے کی گھڑی دی۔
 وہ سارا دن اپنی منگیتر کی باتیں کرتا تھا، سارے لڑکے
 بتانے لگے، ان کی منگنیاں کس کس سے ہوں گی۔
 ”او تو بھی کسی کا ناں لے عاشق۔“

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
 ”اس سے کیا پوچھتے ہو، اس سے منگنی کرنے
 سے تو لولی نے بھی انکار کر دینا ہے۔“ لولی پنڈ کی کالی
 کتیا تھی، جس کے زخم میں کیڑے پڑے تھے۔ وہ
 سب ہنسنے لگے، میں نے آ کر ماں کو بتایا۔
 تو ماں نے میرے آنسو صاف کیے، مجھے
 بہلانے لگی مگر مجھے سکون نہیں آتا تھا۔ تب ماں
 بولی۔ سارے بھونکتے ہیں، وہ میرے لیے پری
 جیسی دلہن لائے گی، سارا پنڈ دیکھے گا۔

پری جیسی..... کیسی؟
 ”بالکل زورا جیسی۔“

”زورا جیسی؟ کیسی ہے زورا؟“

”وہ پری ہے۔“ ماں نے اس کے نقشے کی
 ایسی تشریح کی کہ دیکھے بغیر اسے اتنا دیکھ لیا جتنا کہ
 اس نے خود بھی نہ دیکھا ہوگا۔

”زورا جیسی کیوں..... زورا ہی کیوں نہیں۔“
 میں نے سوچا مگر وہ تو فخر کی منگیتر تھی، میں ماں سے
 لڑ پڑا۔ ماں بولی اس نے زورا جیسی کہا تھا۔

”زورا نہیں..... وہ چل گیا۔“ زورا ہی.....
 میں رونے لگا۔ ”بس.....“ اسے بھی رونا آ گیا۔

”بس۔“ انسپکٹر نے عاشق کے چپ
 سوجانے پر پوچھا۔

”میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے تڑپا
 کرتا تھا۔ پھر کرم اور فری والا معاملہ ہو گیا۔ وہ فخر
 سے ملے بارغ آنے لگی۔ وہ اماں کے بتانے سے بھی

بڑھ کر تھی۔ وہ عاشق کی ڈہنی روپٹ گئی تھی۔ اب اس
 کا انداز خود کلامی کا سا تھا، جس میں ایک سرشاری بھی
 تھی۔ آنکھیں غیر مرئی لفظوں پر مرکوز ہو گئیں، وہ
 حاضر ہوتے ہوئے غائب ہو گیا تھا۔

”ایسے لے جاؤ یہاں سے۔“ انسپکٹر کی آواز
 تکان زدہ تھی مگر اس میں ایک محسوس کی جانے والی
 شکستگی بھی تھی۔ عاشق گھسٹتا ہوا با مشکل چل سکا۔
 انسپکٹر نفیشتی کمرے میں تنہا رہ گیا۔ سامنے رکھی خالی
 کرسی، درمیان میں رکھی میز پر پانی کا آدھا گلاس
 تھا۔ کمرے کی تاریکی کو ایک زرد بلب کا سہارا تھا۔
 جو میز کے عین اوپر جھول رہا تھا۔

انسپکٹر نے میز پر رکھے بال پوائنٹ کولٹو کی
 طرح گھمانا شروع کر دیا۔ اس کا دماغ اس سے بڑھ
 کر گھوما ہوا تھا۔ یک دم اس نے پن کو گھمانا چھوڑ
 دیا۔ اس نے اسی نیم دراز کیفیت میں ڈھیلے پن سے
 میز کی سطح پر نام لکھنے شروع کر دیے۔

”عاشق..... فخر..... فیض..... صدیق.....
 بدتر..... اور..... اور..... زورا..... زہرہ سیف اللہ۔“

اس نے قلم کو جھٹکے سے چھوڑ دیا، وہ ذرا سا چکرا
 کر تھم گیا۔ وہیں انسپکٹر کا چکرا تا دماغ بھی ایک نقطے
 پر آ کر رک گیا تھا۔ حالات واقعات، وجوہات نتیجے
 سب اپنی جگہ..... مگر وہ جو اصل بات تھی، فساد کی
 جڑ..... یہاں اور کہیں اور بھی ہو سکتی تھی، وہ تھا ذکر۔

عاشق نے کہا ماں نے کہا تھا۔ زہرہ جیسی بہو
 لا کر دوں گی، پھر اس نے بیٹے کے آگے زہرہ کی
 تشریح کی۔ جیسے عورتیں رضائی کو کھول کر روئی کو
 دھوپ میں سکھاتی ہیں اور پھر دنوں ہاتھوں سے روئی
 کے کٹھوں کو توڑ توڑ کر ریشہ ریشہ کر دیتی ہیں۔

تو ماں نے عاشق کے سامنے زہرہ کو ایسے کھول
 دیا تھا۔

فیض نے کہا تھا، میری ماں کہتی تھی نوں (بہو)
 ہو تو زورا جیسی۔ میں نے سوچا زورا میں ایسا کیا ہے،
 پھر جب اسے دیکھ لیا تو قسم کھالی۔

”زورا جیسی کیوں..... زورا ہی کیوں نہیں۔“

فیض کی بہنیں بھی کہتی تھیں؟ ہم زورا جیسی۔
بھابھی لائیں گی۔

”زور میں کیا ہے؟“

”آپ نے اسے دیکھا نہیں ہے اس لیے،
ایسی بات کر رہے ہیں۔“ بہنوں نے ٹھٹھا اڑایا تھا۔
درحقیقت اسے اکسایا تھا۔ شوق کا سمندر اتنا چڑھ آیا
کہ بڑھتے بڑھتے فیض کو بہا لے گیا۔

مدثر اور صدیق نے ایک دوسرے کو معنی خیزی
سے دیکھا اور پھر انسپکٹر کو.....

(ابتدائی تفتیش کے زمانے میں) ”لگتا ہے

آپ نے زہرہ کو دیکھا نہیں ہے؟“

انسپکٹر نے دونوں کی رانوں پر چھری برسائی۔
”مجھے چھوڑو..... تم نے کب دیکھا، میری معلومات
کے مطابق تو وہ گھر سے کم نکلتی ہے، بولو۔“

”سارے ہی اس کی مثالیں دیتے ہیں۔ میں
ڈش ٹھیک کرنے کے بہانے چھت پر چڑھ گیا۔ وہ
ویڑے میں برتن دھو رہی تھی۔“ مدثر نے کہا۔

”اور تو.....“ انسپکٹر نے صدیق کو چھری کھبوائی۔
”میں.....“ اس نے حلق تر کیا اور چورنگا ہوں
سے مدثر کو دیکھا۔

”میں ڈش کو خراب کرنے چھت پر گیا تھا۔ سن
سن کر ہمیں صرف دیکھنے کا شوق تھا بس جی ایویں
ہی.....“

ہماری نیت خراب نہیں تھی، بس فیض کا دل
بدل گیا، قسم خدا کی۔“

رائے عامہ تفتیش کے راستے کے خار چننے میں
معاذین ثابت ہوتی ہے۔ انسپکٹر نے کسی کو نہ چھوڑا، کیا
بڈھے کیا جوان، کیا مرد کیا عورت۔

”بڑی سوہنی کڑی تھی جی، ایویں ای تے نہیں
منڈپاں تو کچھے لالیا سی (بہت خوب صورت تھی ایسے
ہی تو ہمیں لڑکوں کو پیچھے لگایا تھا)۔“

”سوہنی کڑی۔“ انسپکٹر نے دہرایا اور ساتھ
بڈھے باپ کو دیکھا۔

”نسی دیکھی سی؟“ (آپ نے دیکھی تھی)۔

”اونہیں جی ایس عمر بچے اکھاں نوں کج نہیں
دسدا۔ بس سنیاں ہی سی۔“ (نہیں جناب اس عمر میں
آنکھوں سے کچھ نہیں دکھائی دیتا بس سنا ہی تھا)۔

”جناب ایسے ہی تو حسن کو فتنہ نہیں کہتے سارا
خاندان برباد ہو گیا۔“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے قصہ سمیٹا
تھا۔

انسپکٹر سوچنے لگا۔ حسن فتنہ نہیں تھا، تذکرہ حسن
نے حشر اٹھا دیا۔

’ذکر..... ذکر..... اور ذکر..... ذکر خیر..... ذکر
شر۔‘

فساد کی جڑ حسن نہیں تھا۔ وہ عورتیں تھیں،
جنہوں نے زہرہ کا ناک نقشہ اپنے شوہروں، بیٹوں
بھائیوں کو رٹوا دیا تھا۔

لپچا دیا تھا، انہیں مجبور کر دیا تا کہ وہ ایک بار
دیکھیں تو سہی کیا بلا ہے۔

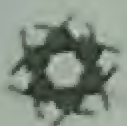
مشہور ہے کہ ایک چور نے پھانسی چڑھتے
وقت اپنی ماں کے لیے بھی پھانسی چڑھا دینے کی
فرمائش جڑ دی کہ اس نے اسے پہلی چوری پر سزا ہونے
کے بجائے ٹوکا کیوں نہیں۔

انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ پتلون اوپر
چڑھا رہا تھا، کف بند کر رہا تھا۔

تو کیا وہ یہ کرے کہ عاشق اور فیض کی ماں پر فرد
جرم عائد کرے یا ان سب عورتوں پر جو زہرہ کے حسن
کو مثال بنا کر زہرہ کے لیے خار اور اپنے بیٹا
بھائیوں کے لیے قبریں کھودنی رہیں۔

نظر جھکا کر خود کو ڈھانپ کر نکلنے والی زہرہ د
لفظی تشہیر نے حشر اٹھا دیا مگر سب سے افسوس کی
بات یہ تھی، اصل مجرم اب بھی آزاد گھوم رہی تھیں۔
کسی اور گھر محلے، شہر میں کسی اور زہرہ کا جمال ضرب
المثل بن رہا تھا۔

آسمان سے باتیں کرتے شعلے ابتدا میں فقط
چنگاری ہوتے ہیں۔ مسلسل ملنے والی ہوا انہیں بھڑکا
دیتی ہے۔



حکایت

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکے ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکے نکالوا لیتی ہے، مگر سکے اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لادیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش یہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔





مگر وہ اسے پیچھے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاریح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاریح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاریح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفن کر دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کر لیا تھا۔ ایڈم ملا کہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاریح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاریح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاریح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاریح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔ راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ فاریح اور ایڈم پر اپنے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاریح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔ جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھارہی ہے اور اس نے تالیہ کے باپا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاریح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاریح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاریح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنادے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملا کہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملا کہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاریح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملا کہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پگھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایکینس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اچھ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پہلے گلاب اور سکے کا ایک شعبہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اس کا مرے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آتا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اچھ بنوائی ہے۔ تو وہ غلط اچھ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔ تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس یتیمی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاریح کو ”ابوالخیر“ نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملا کہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کر لیتی ہے۔ مگر فاریح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو

جاتی ہے۔ وہ دونوں فاح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک ”ایڈم“ قیدی کے ساتھ براسلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جمل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاشہ کیسے اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاح نہیں بتاتا۔ ایڈم ”بنگاریا بلایو“ کے رائٹر کا تھیلا چرالیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو ”وانگ لی“ کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔

وان فاح، سن پاؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن پاؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سازش کرتی ہے۔ فاح کو یہ بات ناگوار گزر ریت ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مؤرخ تعینات کرتی ہے۔ فاح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کالیقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مؤرخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ غیر طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابو

رجہ سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو تیار دیتا ہے۔ فاح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کافی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کر دیتی ہے مگر تالیہ بائوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ یاد شاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔ فاتح کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کرواتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔ ملکہ یان سو فو کی کنیز یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

اٹھارہویں قسط

معائنہ کیا جا رہا تھا۔ عصرہ کی رنگت زرد تھی اور وہ اضطراب سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ دفعتاً طے صاحب نے سر اٹھایا اور سادگی سے عصرہ کو دیکھا۔ یہ نقلی ہے۔

عصرہ نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ اب وہ صاحب بتا رہے تھے کہ کس طرح اس نقلی پینٹنگ کو غالباً کسی ادون میں بیک کر کے ایج کیا گیا تھا، پینٹ سال ڈیڑھ پرانا تھا۔

”اور یہ پینٹنگ؟“ تالیہ نے بیک سے نکال کے چھوٹی سی پینٹنگ سامنے کی تو انہوں نے اسے احتیاط سے تھاما پھر اونچا کر کے دیکھا۔ پھر میز پر رکھا اور اپنی ٹول کٹ کھول لی۔ عصرہ اب بالکل خاموشی سے سینے پر بازو لپیٹے لب بھنجے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”یہ اصلی ہے۔ سو فیصد اصلی۔ یہ دیکھیں۔۔۔“ ماہر نے پینٹنگ پر جھکے جوش سے بتانا شروع کیا تو مزے کے کونے پر بیٹھا فاتح تیزی سے بولا۔

”شکر یہ طے صاحب۔“

ماہر کی بولتی بند ہو گئی۔ اس نے گہری سانس لی اور چیزیں سمیٹنے لگا۔

اس کے جاتے ہی عصرہ نے اپنی پینٹنگ اٹھائی اور زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

فاتح آنکھیں چھوٹی کر کے اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ”سو تم بلیک مارکیٹ سے چیزیں خریدتی ہو۔ یہ جرم ہے۔ Tax evasion یونو۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ پینٹنگ میں نے وہاں سے خریدی ہے۔“ وہ سچ بول رہی تھی۔

”ایک ہی بات ہے۔ خیر۔۔۔ اگر یہ شہزادے جاسم کے ہاں سے چوری ہو ہی گئی تھی تو اس نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی۔“

”رپورٹ کر کے وہ کیا کہتے؟ یہ وہ پینٹنگ ہے جو اس نے خود بلیک مارکیٹ سے خریدی تھی اور اس پر کبھی ٹیکس ادا نہیں کیا۔“

”اچھا مان لیا کہ تمہاری پینٹنگ اصلی ہے اور تم میری بیوی کو ایک اسکیئنڈل سے بچانے آئی ہو مگر تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟“

”شاید آپ کو ہماری ملاقات کے آخر تک معلوم ہو جائے کہ میں پینٹر سے زیادہ بھی کچھ ہوں۔“ اس نے مسکرایے کندھے اچکائے۔

فاتح نے بے رخی سے سر جھٹکا اور ساتھ رکھی سنگھار میز کے کنارے پر جا بیٹھا۔ وہ بے زار ہونے کے ساتھ ساتھ مشکوک بھی لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عصرہ اور ایک معمر صاحب اس کمرے میں موجود تھے اور عصرہ کی گھائل غزال کا

”اب یہ پیٹنگ نیلامی کے لیے نہیں جائے گی۔“ اس نے پیٹنگ کو زور سے ردی کی ٹوکری میں پھینکا۔ چھناکے کی آواز آئی اور شیشہ چکنا چور ہو گیا۔
”اس طرح تو آپ کو کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا

کہ یہ سب آپ کے ساتھ کس نے کیا ہے؟“
عصرہ نے بھگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔
”میں نئی پیٹنگ کو کیسے نیلامی پہ لگا سکتی ہوں؟“
تالیہ نے مینے رکھی اصلی پیٹنگ دو انگلیوں سے اس کی طرف دھکیلی۔

”آپ اس پیٹنگ کو نیلامی پہ لگا دیں۔ میں اس کی بولی لگاؤں گی۔“

”تم اپنی پیٹنگ خریدو گی؟“
”نہیں۔ آپ پہلے اس لڑکی کو بولی لگانے سے منع کریں گی جو غالباً کوئی عام سی ورکر ہے اور آپ نے اسے اچھا لباس اور زیور پہنا کے باہر معزز مہمانوں میں بٹھا رکھا ہے تاکہ وہ میرے مقابلے میں بولی لگائے اور قیمت بڑھائے۔“

فاح کے کندھے سیدھے ہوئے۔ اس نے ہلکے کے عصرہ کو دیکھا۔ عصرہ کی پلکوں میں لرزش ہوئی۔ اس نے تھوک اٹھا۔

”اچھے حیران مت ہوں فاح صاحب۔ نیلامیوں میں اتنا تو چلتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ کوئی گھروالی ہر قیمت پہ نیلامی جیتنا چاہتی ہے تو اپنا بندہ بٹھا ہوتا ہے تاکہ وہ قیمت بڑھاتا جائے۔ شاید آپ نے کبھی کوئی نیلامی انینڈ کی ہو مگر آپ کو یاد نہ ہو۔“
بولی سنا کر عصرہ کی طرف دیکھا۔

”جس نے بھی یہ کیا ہے اس کا خریدار بھی وہاں بیٹھا ہوگا۔ میں صرف قیمت بڑھاؤں گی اور وہ مجھ پہ ہنس پلے جائے گا کیونکہ اس کو معلوم ہو گا کہ اس کی قیمت نہیں ادا کرنی۔ لیکن اگر

اس کی اصل نقل آئے تو قانوناً اس کو لازماً قیمت ادا کرنی ہوگی۔ نہ صرف آپ کو مالی فائدہ ہوگا بلکہ اس کے بعد آپ اصل سازشی شخص کو ٹریس بھی

کر سکتی ہیں۔“

عصرہ بے بس سی بیڈ کے کونے پہ جا بیٹھی اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

”اور تم مفت میں ہمیں اتنی قیمتی پیٹنگ دے دو گی؟“ فاح عور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا کھڑا ہوا اور سامنے آیا۔ اب وہ دونوں بد مقابل کھڑے تھے۔ تالیہ جتانے والے انداز میں مسکرائی۔

”مفت میں تو صرف پندرہویں صدی کے چائے خانوں میں غلاموں کے لیے کھانا ملا کرتا تھا“ فاح صاحب۔ دو ہزار سولہ میں مفت کچھ نہیں ملتا۔“

سر پکڑے بیٹھی عصرہ نے بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔ ”یعنی تمہیں کچھ چاہیے؟ کیا؟ نیلامی والی رقم؟“
”نہیں۔ چے تاشہ کو میرا گھر چاہیے۔“ وہ اس کے چہرے کو بغور پڑھ رہا تھا۔

تالیہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ”آپ کا گھر اس پیٹنگ سے کافی مہنگا ہے اس لیے آپ اسے مجھے نہ بیچیں۔ صرف کرائے پہ دیے دیں۔“
”کرائے؟ یہ؟“ فاح نے تعجب سے ابرو اچکائے۔ ”تم اس کا کیا کرو گی؟“

”مجھے اس گھر میں بیٹھ کر ایک پیٹنگ بنانی ہے۔ آپ ایک ماہ کے لیے اسے مجھے کرائے پہ دے دیں اور اگر درمیان میں آپ اسے بیچنا بھی چاہیں تو میں وہ گھر خالی کر دوں گی۔ بھلے آپ اسے اگلے ہفتے ہی بیچ دیں۔“

”اور جب تک میں وہ گھر نہ بیچوں تم اسے استعمال کرتی رہو گی؟“

”جی۔ آج میں جولائی ہے (اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے وہ تاریخ یاد نہ تھی۔) میں اگست کو اسے خالی کر دوں گی۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو ہاں کرنے میں دیر نہ لگاتی“ فاح صاحب۔“

”تم میری جگہ پہ نہیں ہو۔“ وہ درشتی سے بولا تو تالیہ نے شانے اچکا دیے۔

”گھائل غزال آپ کی میز پہ ہے۔ میں اب باہر جا رہی ہوں۔ اگر آپ نے اسے نیلامی پہ لگا دیا تو پارٹی کے اختتام پہ آپ گھر کی چابی میرے حوالے کر دیں گے۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں۔ تو؟“ فاح ماتھے پہ ہل ڈالے پوچھ رہا تھا۔

”تو نہ کریں۔ ویسے بھی یہ پینٹنگ میں نے آپ کو نہیں دی۔ مسز عصرہ کو دی ہے۔ اسے میری طرف سے اس نیلامی کے لیے عطیہ سمجھ کر قبول کر لیں جیسے عرب شہزادے سے قبول کی تھی۔“ اسی کے لہجے میں الفاظ لوٹا کے وہ مڑی اور باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی عصرہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پہ بے حد پریشانی تھی۔

”فاح۔“ اس نے جلدی سے فاح کے دونوں ہاتھ تھامے اور اس کے سامنے آئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”اگر میں نے اب نیلامی سے پینٹنگ ہٹائی تو بہت بدنامی ہوگی۔ پلیز فاح، گھر اس کو دے دو۔۔۔ وہ کریزی سی سوشلائٹ ہے۔ وہ اسی پہ خوش ہو جائے گی۔“

”تم اس لڑکی کے ساتھ کیسے کوئی سودا کر سکتی ہو جس نے میری فائل چرائی تھی۔“

”کیا پتا اس نے نہ چرائی ہو؟ اور وہ الگ بات ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ فاح نے جھنجھلاہٹ سے سر جھٹکا۔

”مجھے اس گھر کو بیچنا ہے عصرہ!“

”وہ ایک ماہ میں گھر خالی کر دے گی فاح۔ اس کی بات کا اعتبار کرو اس نے ہمیں اسکیئنڈل سے بچایا ہے۔ یا اللہ۔ ہم تباہ ہو سکتے تھے۔“ اس نے نم پیشانی کو چھوا۔ وہ اندر تک ہل گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اسے گھر دے دیتا ہوں لیکن آج کے بعد تم کبھی بھی امریکہ جانے کی بات نہیں کرو گی۔ سنا تم نے؟“

عصرہ کچھ کہنے لگی پھر سر ہلا دیا۔ ”جو تم کہو۔ بس

ابھی مجھے اس پروجیکشن سے نکالو۔“

”جمعے کو میں کاغذات نامزدگی جمع کروا رہا ہوں عصرہ۔ اور تم مجھے نہیں روکو گی۔ از دیٹ کلیئر!“

”تم بھی تالیہ کی طرح موقعے کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔ واقعی۔ مفت میں کچھ نہیں ملتا لیکن خیر۔۔۔“

عصرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مجھے ہر شرط منظور ہے۔“

”عصرہ تم راضی نہ ہو تب بھی۔ مجھے یہی کرنا ہے۔ اگر پینٹنگ نہ رکھی تو خواہ مخواہ باتیں بنیں گی اور ہم یہ نہیں جان سکیں گے کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ دیکھو عصرہ۔۔۔“ وہ چہرے پہ نرمی لائے اس کے ہاتھ تھامے سمجھانے لگا۔ ”تم کسی کو بھی پینٹنگ کے بدلے جانے کا نہیں بتاؤ گی۔ یہ جس نے بھی کیا ہے وہ پینٹنگ کے اصلی نکلنے پہ حیران ہو گا اور کسی طریقے سے تم سے اگلوانے کی کوشش کرے گا۔ وہ یقیناً کوئی قریبی دوست وغیرہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”اوکے پھر؟“ وہ اس کی بات سمجھ رہی تھی۔

”تم غور کرنا کہ نیلامی کے بعد تم سے کون آ کر غیر ضروری سوالات پوچھتا ہے۔ کوئی پوچھے گا عصرہ۔ کوئی ضرور پوچھے گا۔“ وہ اسے غور سے دیکھتا دھیرے دھیرے سمجھا رہا تھا اور عصرہ سمجھتے ہوئے سر ہلا رہی تھی۔

☆☆☆

”سو آپ نے سر درد کی دوا لینے کے بہانے جا کر ان کو سب بتا دیا۔ میں سمجھا آپ کے سر میں واقعی درد ہے اور آپ اندر تھوڑی دیر آرام کرنے گئی ہیں۔“

تقریب میں واپس آئے تو اسٹیج پہ نیلامی جاری تھی اور پہلی قطار میں بیٹھا ایڈم دانت پیستے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ مجھے اپنا پلان بتا بھی سکتی تھیں لیکن نہیں۔ آپ ابھی تک خود کو شہزادی سمجھتی ہیں اور مجھے ایک غلام۔“

”اور بھگواؤ افوجی بھی۔“ اسٹیج کو دیکھتی تالیہ نے تصحیح کی۔

”مگر آپ نے ان کو اشعر کے بارے میں

ہوں نہیں بتایا کہ یہ سب اسی کی سازش تھی؟“ ایڈم نے تالیوں کی گونج کے دوران سرگوشی کی۔ تالیہ نے انہیں گھما کے اسے گھورا۔

”اگر وہ اپنے دوست اور دشمن میں خود تفریق نہیں کر سکتے تو وہ اس قابل نہیں کہ ان کی مدد کی جائے۔“

ایڈم نے جواباً پتلیاں سکوڑ کے اسے گھورا۔ ”بارج گواہ ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ اندھیرے میں رہنے دیتے ہیں اس لیے اس کے پیچھے بھی کوئی اور وجہ ہو گی۔“ اور منہ بنا کے چہرہ سیدھا کر لیا۔

تقریب ختم ہوئی تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ لان میں نصب تمام برقی قمقمے جلادے گئے تو سارے میں روشنی پھیل گئی۔ بونے ٹیبلز پہ کھانا چن دیا گیا تھا اور مہمان اب ٹہلتے ہوئے کھانا لینے میں مصروف تھے۔

فاح ایک ٹیبل کے سامنے کھڑا پلیٹ اٹھائے ساتھ کھڑے ایک دوست سے بات کر رہا تھا۔ کھانا ڈال کے وہ مڑا تو دیکھا، سامنے ایڈم کھڑا ہے۔ فاح مسکرایا اور بات ختم کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیسے ہو ایڈم؟“

”کنفیوزڈ ہوں سر۔ سوچا آپ سے ایک مشورہ مانگ لوں۔“ وہ متانت سے کہنے لگا۔

”پوچھو۔“ فاح سلاد کے پتے کو کانٹے میں پھنسا رہا تھا۔ ایڈم کی نظریں سبز پتے پہ جھکیں تو اسے گھوڑے کو چارہ کھاتے سیلف اسٹیم پہ لپکھتا غلام یاد آیا۔ ماضی ہر قدیم پہ ایسے کیوں یاد آتا ہے؟ بھول یوں نہیں جاتا جیسے فاح کو بھول گیا تھا؟

”ایک کام ہے جو میں کرنا چاہتا ہوں اور مجھے اس سے متعلق جاب ملے گی۔ مگر ایک کام ہے جو میں کرنا چاہتا ہوں مگر اس کام میں نوکری تلاش کرنا ناممکن سا لگتا ہے۔“

”کرنا کیا جانتے ہو اور کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ لب پلیٹ پہ چہرہ جھکائے چاولوں کو سلاد میں مکس کر رہا تھا۔

”گارڈ بن سکتا ہوں بس۔ مگر مجھے لکھنے کا شوق

ہے۔“ وہ جینپ کے بولا۔ شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ فاح نے چاولوں کا چمچ سز میں رکھا اور چند لمحے خاموشی سے ان کو چھایا۔

”گارڈ کا کام کیا ہوتا ہے ایڈم؟“

”اسنے مالک کی حفاظت کرتا۔“

”مگر کس طرح؟ ہاتھ سے پستول تو وہ خطرے کی صورت میں نکالتا ہے اس سے پہلے وہ سارا وقت کیا کرتا ہے؟“

ایڈم نے لمحے بھر کے لیے سوچا۔ ”وہ ماحول پہ گہری نظر رکھتا ہے اور اپنے مشاہدے سے ہر غیر معمولی بات کو نوٹس کرتا ہے۔“

”اور لکھنے والے کیا کرتے ہیں؟“

”وہ۔“ ایڈم اٹکا۔ ”وہ اپنے ماحول پہ گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے مشاہدے سے ہر غیر معمولی بات کو نوٹس کرتے ہیں۔“ الفاظ ادا کر کے جیسے وہ خود کم صم ہو گیا تھا۔

”مل گیا جواب؟“ فاح مسکرا کے پلٹنے لگا، پھر مڑا اور اسے غور سے دیکھا۔

”مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے پاس پستول بھی تھا۔ مگر تم نے اس دن ان لڑکوں پہ پستول نہیں اٹھایا۔ کیا تم واقعی اچھے گارڈ ہو؟“

ایڈم چونکا۔ پھر ہونٹوں کی طرح اس کی شکل دیکھی۔ ”کون سے لڑکے؟“

”اس رات ملا کہ میں جن چور لڑکوں نے ہمیں روکا تھا اور مجھے زخمی کیا تھا۔ کیوں؟ تمہیں یاد نہیں؟ تم اس وقت میرے ساتھ تھے ایڈم!“

وہ غور سے ایڈم کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا، مگر ایڈم کو یاد ہوتا چاہیے تھا۔ کیا واقعی وہی سب ہوا تھا جو اس نے پولیس کو ویڈیو میں بتایا تھا یا کچھ اور ہوا تھا؟ فاح کے اندر جو چار دن سے کھٹک رہا تھا وہ اب زور پکڑ رہا تھا۔

”مجھے، مجھے یاد ہے سر!“ ایڈم اٹک اٹک کے بولا۔ ”اور میں نے پستول نکالا تھا مگر آپ نے مجھے منع کیا تھا کہ میں.... گولی نہ چلاؤں۔“ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

ذہن میں جنگل کا منظر گھوم رہا تھا جب قدیم ملا کے میں وہ غیر مانوس زبان بولنے والے لوگ ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ اس نے پستول نکالا تھا مگر فاح نے اسے ہتھیار ڈالنے کا کہہ دیا تھا۔

”کیا آپ کو نہیں یاد سر؟“ اب کے ایڈم نے غور سے اسے دیکھا۔

فاح نے سر جھٹکا۔ ”مجھے کیوں یاد نہیں ہوگا۔“ پھر بات پلٹ دی۔ ”تم اچھے گارڈ ہو مگر کام وہ کرو جو تمہارے دل کو پسند ہو۔“ سرسری سا کہتا وہ مڑ گیا۔ اندر کی کھٹک خاموش ہو گئی۔ سب ویسا ہی ہوا تھا یقیناً بس اسے یاد نہ تھا۔

”تعجب کی بات ہے کسی کو گھائل غزال پہ کیسے شک ہو سکتا ہے۔“ عصرہ اور تالیہ ایک بونے ٹیبل کے ساتھ کھڑی تھیں جب اشعر کی آواز نے دونوں کو چونکایا۔ تالیہ نے گردن موڑی تو وہ اپنی بہن کو مخاطب کرتا قریب آ رہا تھا، ایک مسکراتی نظر تالیہ پہ ڈال کے سلام میں سر کو جنبش دی۔ ”کیسی ہیں آپ بچے تالیہ؟“

”ہمیشہ کی طرح چوکتی اور ہوشیار!“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے بولی۔ وہ ہلکا سا ہنسا۔ سرمئی سوٹ اور ٹائی میں ملبوس اس نے اپنے وجیہہ چہرے پہ ایسی مصنوعی مسکراہٹ سجا رکھی تھی جس کی ایک لکیر بھی مدہم نہ پڑتی تھی۔

”کا کا.... یہ کیا حرکت تھی تمہارے خریدار کی؟ وہ تم پہ شک کیوں کر رہا تھا؟“ وہ پھر سے موضوع کی طرف آیا۔

عصرہ جو پلیٹ پکڑے کھڑی تھی ذرا متذبذب ہوئی۔ سیاہ رات میں اس کے پچھماتے لباس کے باوجود ایک دم مرجھا جانے والا چہرہ چھپ نہ سکا۔ ”وہ.... شاید....“ (اسے فاح کی تنبیہ یاد آئی۔)

”میں بتاتی ہوں۔“ تالیہ نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ”جو گھائل غزال مسز عصرہ کو کسی نے تحفے میں دی، وہ نقائی تھی کیونکہ اصلی گھائل غزال کافی عرصہ

قبل ہلک سا ریٹ میں پک پکاتی ہے۔ عرب شہزادہ بھی لٹلی تھا اور ماہرین بھی۔ سو میں نے مسز عصرہ کو اصلی پینٹنگ لاد دی اور لٹلی کو ہم نے ڈسٹ بن میں پیک دیا۔“

اشعر لمحے بھر کوٹن ہو گیا۔ پھر آنکھوں میں تشویش ابھری۔ فوراً عصرہ کو دیکھا جو حذب بذب نظر آ رہی تھی۔ ”کا کا کیا یہ سچ ہے؟“

”اشعر آپ کے بھائی ہیں مسز عصرہ۔“ ہال نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا۔ ”وہ آپ کی بیٹی ہیں۔ ان کو نہیں بتائیں گی تو کسے بتائیں گی کہ کتنے بڑے کرائمز سے آپ لوگ ہال ہال بنے ہیں۔“

عصرہ کے سارے بوجھ جیسے ہلکے ہو گئے۔ وہ ہم آنکھوں سے مسکرا دی اور فوراً۔ اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب وہ تیزی سے اس کو ساری بات بتا رہی تھی اور وہ تشویش سے سن رہا تھا۔

تالیہ ان کو چھوڑ کر کمر کے بیرونی حصے کے سامنے آئی جہاں وان فاح چلا آ رہا تھا۔ اس نے تالیہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ مسکراہٹ دبائے چلی آئی۔

”جی تو ا....“ (تو انکو کہتے کہتے رکی۔) ”جی فاح صاحب۔“ مسکراہٹ سمٹی۔ یہ وہ شخص نہیں تھا جو بالائی منزل کی کھڑکی سے اسے دیکھتا تھا جب وہ اس قدیم خان میں مجسمہ بنارہی ہوتی تھی۔ یہ کوئی اور شخص تھا۔

فاح نے مٹھی میں بند ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ جسے تالیہ نے تھام لیا۔

”تم نے آج جو بھی کیا اپنی مرضی سے کیا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اس کا احسان رکھوں گا یا مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میری رائے تمہارے متعلق اب بھی وہی ہے، ناشہ۔ تم کبھی سیدھی بات نہیں کرتیں۔ پتا نہیں اب تمہیں میرا گھر کیوں چاہیے۔ لیکن....“ اس کے مقابل کھڑے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے تنبیہ کی۔ ”اگر میرے گھر کے ایک انچ کو بھی نقصان پہنچا تو میں تمہیں وہاں سے فارغ کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

اس کو کھری کھری سنا کے فاح کی نظر اس کے عقب میں پڑی جہاں بونے ٹیبل کے ساتھ عصرہ اور

اشعر کھڑے سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ فاتح کی پیشانی پہ بل پڑے۔
 ”بے فکر رہیں۔ اشعر صاحب آپ کی فیملی ہیں۔ اس لیے میں نے پینٹنگ والا معاملہ ان کو بتا دیا۔ آخر ایسے موقع پہ فیملی کام نہیں آئے گی تو کون آئے گا ہوں؟“ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ فاتح نے بہت ضبط سے اسے دور جاتے دیکھا اور پھر عصرہ اور اشعر کو۔
 اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

حالم کے بنگلے پہ اندھیرا چھایا تھا۔ کالونی کے دوسرے گھروں کی بتیاں روشن تھیں مگر آج داتن نہیں تھی اس لیے تالیہ کے پورچ کی بتی بجھی تھی۔ اس نے کار اندر کھڑی کی اور پھر پرس کہنی پہ ٹکائے سست روی سے باہر نکلی۔ موبائل پہ ساتھ ہی کچھ ٹائپ کرتے سوچ بورڈ پہ ہاتھ مارا تو سارا پورچ روشن ہو گیا۔
 وہ موبائل پہ چہرہ جھکائے گیٹ بند کرنے پیچھے آئی تو کسی احساس کے تحت گردن اٹھائی۔
 گیٹ کے اندر کی طرف سمیع کھڑا تھا۔ سینے پہ بازو لپیٹے، کچھڑی بالوں کو پی کیپ سے ڈھانکے، سانولی رنگت والا سمیع اس کو گھور رہا تھا۔
 تالیہ بالکل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔
 ”اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم اس موٹی عورت کو بھیج کے مجھے ڈرا دھمکا کے خاموش کروادو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔“ وہ اپنی چمکتی سیاہ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

پھر ایک قدم آگے آیا اور سینے پہ لپٹے ہاتھ کھول کر دونوں پہلوؤں پہ رکھے۔

”میں تمہارے ماضی سے واقف ہوں۔ جو تم یہاں مرحوم امیر باپ کی بیٹی بنی پھر رہی ہونا جس کو ترکے میں اتنی دولت مل گئی میں جانتا ہوں کہ تم یہ نہیں ہو۔ تمہارے اشعر محمود کے خاندان میں جتنے چکر لگ رہے ہیں امید ہے جلد وہ تمہیں اپنا حصہ بنالیں گے

لیکن.....“

وہ دانت پیس کے ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ تالیہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی۔
 ”اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم ایک فیک ہو۔ ایک یتیم خانے سے نوکرائی کے طور پہ ایڈاپٹ کی جانے والی لڑکی جس کو بوجھ کی طرح اس کے فوسٹر پیرنٹس نے اتار پھینکا تھا اور جس کی پہلے ہی شادی ہو چکی ہے مگر طلاق کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور جانے کن کن طریقوں سے تم نے یہ دولت بنائی ہے۔“ تحقیر سے سر سے پیر تک ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”تو وہ تمہیں فوراً سے دور کر دیں گے۔ تمہاری ساری عزت ختم ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھے میرا شیئر دو۔“

کالونی کی مدہم روشنیوں اور خالی سڑک سے ہٹ کے وہ دونوں تالیہ کے گیٹ کے اندر آ منے سامنے کھڑے تھے۔ وہ کچھ بھی بولے بنا اسے سنتے ہوئے وقفے وقفے سے پلکیں جھپکتی تھی۔

”تمہیں ملائیشیا میں لایا تھا۔ تمہاری اس ترقی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ مجھے..... اپنا حصہ..... چاہیے۔“ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

چند ثانیے کے لیے پورچ میں سناٹا چھا گیا۔ سمیع نے دیکھا وہ بس اسے دیکھے جا رہی ہے... دیکھے جا رہی ہے اور پھر..... ایک دم..... وہ ہنس پڑی۔
 ”یا اللہ سمیع....“ وہ گردن پیچھے پھینک کے ہنستی جا رہی تھی۔ سمیع کے تاثرات بدلے۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”تم میرا حصہ.....“

”تم کتنے فنی ہو، سمیع۔“ بامشکل ہنسی روک کے اس نے سمیع کو دیکھا تو آنکھوں میں بے تحاشا ہنسنے کے باعث پانی آ گیا تھا۔

”میں تو تمہیں بھول ہی گئی تھی۔ اتنا عرصہ ہو گیا تمہاری شکل دیکھے، مگر یا اللہ سمیع..... تم تو ابھی تک وہیں ہو۔“ وہ پھر سے ہنس دی۔
 ”تم مجھے جانتی نہیں ہو تالیہ۔“ وہ غرایا۔

”اونہوں۔“ اس نے انگلیوں سے نم آنکھیں رگڑیں۔ ”بلکہ تم مجھے نہیں جانتے۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے طمانیت سے مسکرائی اور دو قدم آگے آئی پھر چہرہ اس کے قریب جھکایا اور سرگوشی کی۔

”تالیہ نے ٹوٹے جوتوں کے ساتھ جنگلوں میں سفر کیا ہے۔ اس نے کچے جانور ان دانتوں سے کھائے ہیں۔ وہ رسیاں تڑوا کے انسانی پنجروں سے اندھیری رات کو نکل کے بھاگی تھی۔ اس نے اپنے گدھ جیسے باپ کو ان انگلیوں پہ بچایا ہوا ہے۔ اسے وقت کے امراء اور رؤساء کے خلاف کھڑا ہونا بھی آتا ہے اور اسے تنہا سمندروں کا سینہ چیر کے وحشی جزیروں کو سر کرنا بھی آتا ہے۔ وہ ایک دنیا پہ حکومت کر کے آئی ہے سمیع اور تم ابھی وہیں کھڑے ہو۔“

وہ بھنویں بھنجنے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔

”جو تالیہ تم سے ڈرتی تھی وہ کہیں پیچھے رہ گئی۔ جو تمہارے سامنے کھڑی ہے اسے کچھ کھونے کا خوف نہیں ہے۔ جاؤ جس کو جو بتاتا ہے بتا دو۔“ پھر ہاتھ اٹھا کے انگلیاں ہلائیں۔ ”Bubye“

”ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں وارننگ نہیں دوں گا۔ اب میں جو کروں گا وہ تم دیکھ لو گی۔“ وہ تنفر سے اسے دیکھتا مڑا اور باہر نکل گیا۔

تالیہ نے مسکرا کے گیٹ بند کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لاؤنج تنہا ویران پڑا تھا۔ اس نے بتیاں جلائیں اور بڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ پیر میز پہ رکھ دیے اور موبائل کھول لیا۔

”آج آپ سے ٹھیک سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ کیا ہم دوبارہ مل سکتے ہیں۔“ اشعر کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

”شیور اشعر صاحب۔ صبح ناشتے پہ ملتے ہیں۔“ اشعر کو شاید اتنی جلدی مثبت جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے فوراً پوچھا۔

”کہاں؟“

”صبح بتاؤں گی۔“ اس نے فون پر سے ڈال دیا۔ ایک دم فون کی گھنٹی بجی تو اس نے مسکرا کے فون اٹھایا مگر پھر چونکی۔ بجنے والا فون یہ نہیں تھا۔

تالیہ ایک دم سیدھی ہوئی اور پرس میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرا فون نکالا جو ”حالم“ کا تھا۔ آج ہی اس نے یہ دوبارہ ایکٹو کر دیا تھا۔

اس پہ غیر شناسا نمبر جگمگا رہا تھا۔ شاید حالم کا کوئی کلائنٹ تھا۔ تالیہ نے فون کان سے لگایا۔ ”ہیلو؟“

”السلام علیکم! وان فاتح بات کر رہا ہوں۔ یہ میرا نیا نمبر ہے۔ کیا ہم تھوڑی بات کر سکتے ہیں حالم؟“

تالیہ لمحے بھر کو بالکل سُن رہ گئی۔ اس سارے گورکھ دھندے میں اسے ایک بات بالکل بھول گئی تھی۔

اگر وان فاتح تالیہ کی ساری اچھائیاں بھول چکا ہے تو اسے حالم کی شناخت بھی یاد نہیں رہی تھی۔

وہ تالیہ پہ اعتبار نہیں کرتا تھا مگر حالم پہ کرتا تھا۔

”شیور فاتح صاحب۔“ اس نے ٹیک لگائی اور پیر لمبے کر کے قینچی صورت میز پہ رکھے پھر سنہری لٹ

کو انگلی پہ مروڑتی، چھت پہ چمکتے فانوس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”حالم آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے؟“

کھیل تو ابھی شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

وان فاتح کے گھر کے لان کا منظر بدلا ہوا۔

کیٹرنگ والے ہر چیز صاف کر کے جا چکے تھے اور لان اصلی حالت میں واپس آچکا تھا۔ اندر لاؤنج میں سناہ

تھا۔ گھر ذرا بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسے میں فاتح اپنے کمرے سے نکلا۔ رات کی مناسبت سے اس نے ٹراؤزر

پہ سادہ نی شرت پہن رکھی تھی اور پیروں میں سلپرز تھے۔

وہ عصرہ کے ادھ کھلے دروازے پہ رکا اور دستک دی۔

سامنے عصرہ میز پہ کاغذ اور لیپ ٹاپ پھیلائے

حساب کتاب میں سرویے بیٹھی تھی۔ آہٹ پہ سر اٹھایا

اور مسکرائی۔ ”تقریباً سب کچھ بک گیا۔ نیلامی نفع

بخش رہی۔“

تالیہ۔“

”وہی تالیہ جس نے تمہارے بقول ہماری

چاہیے؟“

فائل چرائی تھی۔“

عصرہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی، پھر کندھے اچکا دیے۔ ”اپنی آنکھوں سے تو میں نے نہیں دیکھا تھا اسے فائل چراتے ہوئے۔ میں نے تو صرف کہا تھا کہ وہ اپنی کار لینے ہمارے گھر ہماری غیر موجودگی میں آئی تھی۔ تم نے ہی فرض کر لیا تھا کہ فائل اس نے چرائی ہوگی۔“

”خیر..... فائل میرے پاس واپس آگئی ہے اس لیے میں اس قصے کو فی الوقت نہیں چھیڑ رہا۔“ پھر وہیں چوکھٹ یہ ہاتھ رکھے رکھے ٹھہرا۔ ”امید ہے تم اسنو وعدہ یاد رکھو گی۔“

”میں نے امریکہ جانے کی بات نہ کرنے کا یا تھا فاتح۔ تمہارے کسی بھی الیکشن میں تمہیں پیورٹ کرنے کا نہیں۔ اس کی توقع مجھ سے نہ رکھنا۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”شب بخیر عصرہ!“ اس نے ڈور ناب سے دروازہ اپنی طرف کھینچا اور اسے بند کر دیا۔ چہرے پہ گہری سوچ کا عکس پھیل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ اوپر اسٹڈی کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ ٹھنڈے شیشے پہ ایک ہاتھ رکھے دوسرے سے موبائل کان سے لگائے وہ نیچے نظر آتی اندھیر کالونی کو دیکھتے عالم کو سن رہا تھا۔

”عالم آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے فاتح صاحب؟“

”تم نے مجھے کہا تھا کہ میری فائل تالیہ نے چرائی تھی۔ کیا تمہیں یقین ہے؟“

بنا توقف کے عالم کی مردانہ آواز گونجی۔ ”تمام واس کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ آپ کی ملازم کی حرکت نہیں ہے۔ صرف تالیہ مراد وہ اجنبی تھی جو آپ کے گھر آئی تھی اور جو اشعر محمود کے گھر اور آفس بھی آتی جاتی رہی تھی۔“

”ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن کیوں عالم؟ سن باؤ کے گھر میں ایسا کیا ہے جو اس کو

”میں پتا کر کے بتا سکتا ہوں۔“

”نہیں تم اس کو چھوڑو۔ ایک آدمی کی تفصیلات تمہیں بھیج رہا ہوں۔ اس نے میری بیوی سے گھائل غزال خریدی ہے، مگر وہ پیسٹنگ دراصل.....“ اس نے مختصر اسرار واقعہ کہہ سنایا۔

”ٹھیک ہے سر۔ میں اس آدمی کو چیک کرتا ہوں۔ آپ کو کس پہ شک ہے۔“

”پچھلی دفعہ میں نے تالیہ مراد پہ شک کا اظہار کیا تو تم نے بھی اسی کا نام لے دیا۔ اس لیے میں اپنا شک محفوظ رکھوں گا۔ مجھے ثبوت چاہیے۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا اور اس نرمی کے اندر خشکی بھی تھی۔

”آپ مجھے ہمیشہ مخلص اور نیک نیت پائیں گے فاتح صاحب۔“ پھر عالم نے توقف کیا۔ ”کچھ اور؟“

”اتوار کی رات ملا کہ میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے۔“

”کیسا حادثہ؟“

”تم انو۔سٹی گیٹر ہو، عالم۔ تم تحقیقات کر کے مجھے بمع ثبوت آگاہ کرو کہ میرے ساتھ اتوار کی رات کیا ہوا تھا اور کس نے کیا تھا؟“

”کیوں؟ کیا آپ کو نہیں یاد کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”اگر میں کہوں کہ ایک پوری رات میری یادداشت سے محو ہو چکی ہے تو تم کیا کہو گے؟“

”یہی کہ آپ ایک سچے انسان ہیں۔“ اور کال کٹ گئی۔

فاتح نے کھڑکی سے ہاتھ ہٹایا تو اس پہ پانچ انگلیوں کا نشان ثبت ہو چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی تو دھواں سا شیشے پہ بکھر گیا اور وہ نشان دھندلا ہو گیا۔ دھندلے شیشے کے پار نیچے سیاہ رات میں ڈوبی کالونی خاموشی سے وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی۔

☆☆☆

بارین نیشنل کا آفس دیکھ کے معلوم نہیں ہوتا تھا

کہ اس کے فرش تلے ایک بڑا سا مال بنا ہے۔ جہاں دفتری ماحول کے برعکس رنگوں اور روشنیوں کی بہار ہے۔

مال کی گیلریز میں شاپنگ کرتے لوگ ٹہل رہے تھے۔ دکانیں کھل چکی تھیں اور فوڈ کورٹ میں کھانے کی خوشبو پھیلی تھی۔

ایسے میں اشعر محمود مسکراتا ہوا فوڈ کورٹ کی طرف چلتا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی رفتار سے بامشکل ملٹاری ٹی ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”سر.... جعفر صاحب... وہ خریدار... بہت سیخ پا ہیں۔ قانوناً ان کو پینٹنگ کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ پینٹنگ نکلے گی اور....“

اشعر ایک دم رکا اور اس کی طرف گھوما۔ رملی بھی ہڑبڑا کے رکا۔ اشعر نے اس کے سینے پہ انگلی رکھی۔

”میں نہیں.... تم.... تم نے وعدہ کیا تھا اس سے۔“ دانت پیس کے مسکراتے ہوئے اسے گھورا۔ ”واللہ اگر اس آدمی کا مجھ سے کوئی بھی تعلق ثابت ہوا تو تمہیں اس مال کی چھت سے کود جانے پہ مجبور کر دوں گا۔“

”نہیں ہوگا سر۔ کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ جلدی سے کہنے لگا۔ دونوں آمنے سامنے فوڈ کورٹ کے دہانے پہ کھڑے تھے اور اطراف میں لوگ آ جا رہے تھے۔

”میں نے ہر چیز بہترین انداز میں پلان کی تھی اور....“

”ہاں تب ہی عین وقت پہ پینٹنگ کا راز کھل گیا ایڈیٹ!“ اشعر مصنوعی مسکراہٹ برقرار رکھے پھر سے چلنے لگا تو رملی پیچھے لپکا۔

”سروہ چے تالیہ نے پتا نہیں کیسے....“

”چے تالیہ دکھاوے کی شوقین بگڑی امیر زادیوں میں سے ہے۔ اس کے پاس اصلی پینٹنگ تھی تو اس نے دکھاوا کرنا ہی تھا۔ اپنی ناکامی اس کے سرمت ڈالو۔“

پھر ہاتھ جھٹاکے اسے دفعتاً ہونے کا اشارہ کیا تو رملی گہری سانس بھر کے وہیں رک گیا اور اشعر آگے بڑھتا گیا۔ مسکراہٹ کو مزید گہرا کر لیا اور ٹائی کی ٹاٹ

درست کی۔ سرمئی سوٹ اور سفید شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح وجیہہ لگ رہا تھا۔

فوڈ کورٹ میں ایک میز پہ تالیہ بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ سنہرے بالوں کا جوڑا بنائے وہ گرے اسکرٹ پہ سفید منی کوٹ پہنے گردن میں گرے رویال کی گرہ باندھے بیٹھی، کافی کے گھونٹ پی رہی تھی۔ ایک

ٹھنکریا لیٹ گال پہ جھول رہی تھی۔ اشعر کو آتے دیکھ کے مسکرا کے لٹ پچھے کی اور کپ رکھا۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ آپ کی صبح کا مطلب واقعی صبح ہوگا۔“ وہ ہشاش بشاش سا کہتا سامنے بیٹھا۔

”مجھے وعدے اور دوستی دونوں کو نبھانا آتا ہے۔ اشعر صاحب۔“ وہ مسکراتے ہوئے تازہ دم سی لگ رہی تھی۔

”سب سے پہلے تالیہ....“ اشعر نے دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ”آپ کا بہت شکریہ.... کل آپ نے ہمارے خاندان کو جس کرائمز سے بچایا.... آبنگ (بھائی) نے تو ٹھیک سے شکریہ کہا نہیں ہوگا اس لیے میں....“

”شکریہ کہنا تو درکنار وہ تو آخر میں بھی خفا ہی تھے۔“ اس نے اداسی سے سر جھٹکا اور کپ اٹھا لیا۔ پھر رکی۔ ”آپ کافی لیں گے؟“

”نہیں، شکریہ۔ جب آپ کا ٹیکسٹ ملا میں کافی ہی پی رہا تھا۔ خیر آبنگ خفا کیوں تھے؟“

”کیونکہ انہوں نے عصرہ کو کسی سے یہ بات بتانے سے منع کیا تھا اور میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ تو فیملی ہیں نا۔ مطلب وہ آپ کو کیونکر اپنے دائرے سے نکال سکتے ہیں؟“ اس نے خفگی سے سر جھٹکا اور گھونٹ بھرا۔

اشعر مسکراتا رہا البتہ اس کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھری۔

”انہوں نے جلد یا بدیر مجھے بتانا ہی تھا۔ ہم ایک فیملی ہیں۔“

”ظاہر ہے ان کو بتانا چاہیے تھا۔ اب اگر وہ عرب شہزادہ حقیقتاً شہزادہ نہیں تھا تو اس میں آپ کا کیا

تصور؟ لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ کے بہنوئی اور آپ کے درمیان کوئی بدگمانی پیدا ہو۔ آپ اپنے فیس بک سے وہ تصویر ہٹا دیں۔

”کون سی تصویر؟“ وہ چونکا۔ تالیہ نے جواب میں حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کپ نیچے رکھا۔

”ارے۔ ایک سال پہلے ایک سفارت خانے کی تقریب کی تصویر جس میں آپ شہزادہ جاسم کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے ہیں اور ساتھ میں اس کا وہ مینیجر بھی ہے جو عصرہ سے شہزادہ جاسم بن کے ملا اور بعد میں اس کے مالک نے کہہ دیلے کہ یہ میرا کزن ہے۔ اگر فلاح صاحب نے وہ تصویر دیکھی تو وہ بدگمان ہو جائیں گے حالانکہ دیکھا جائے تو آپ دن میں سینکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں۔ آپ کو ہر ایک کی شکل تھوڑی یاد رہتی ہوگی۔“

اشعر نے بدقت مسکراہٹ قائم رکھی۔ ”میں نہیں جانتا آپ کس تصویر کی بات کر رہی ہیں۔ لیکن میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں کوئی تصویر کیوں ہٹاؤں؟“ وہ براعتاً دھڑکا۔ ”اور آنگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں وہ بھی میرے لیے اتنا برا نہیں سوچ سکتے۔“

”اوہ... پھر میں مطمئن ہوں۔“ پھر جیسے یاد آیا۔ ”شاید وہ تصویر آپ کے نہیں کسی ٹوارزم کے پیج پہ دیکھی تھی میں نے۔ خیر جانے دیں۔“

ارد گرد ٹہلتے لوگ مال کی رونقیں اشعر کو اپنے اور اس کے درمیان پھیلے تناؤ میں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ جبراً ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔

”خیر آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“ وہ معصومیت سے بولی تو اشعر نے اطراف میں دیکھا۔ ”تھوڑی دیر قبل میں شاید کہتا کہ ناشتے کے لیے۔ یہاں کارنر والا ریستوران میرا پسندیدہ ہے۔۔۔“

مگر آپ شاید ناشتے کے بجائے بات چیت کرنا چاہیں گی۔ تو کیوں نا آپ بتائیں چے تالیہ کہ کل رات والے آپ کے ”احسان“ کے بدلے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟“

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھ رہا

تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ کل رات والے احسان کی نہیں اس تصویر کو فلاح کو نہ دکھانے کی بات کر رہا تھا۔

”میرے پاس دولت مقام جاؤ ادا سب ہے اشعر صاحب۔ لیکن ہاں ایک چیز ہے جو آپ مجھے دلوا سکتے ہیں۔“ وہ کہیاں میز پر جمائے آگے ہوئی۔ ”حکم کیجیے۔“

”مجھے باریسن نیشنل....“ ابرو سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ مال کی چھت سے اوپر ایک فلور باریسن نیشنل کا ہیڈ آفس تھا۔ ”میں..... جاب چاہیے۔“

”جواب؟ واقعی؟“ اس نے تعجب سے ابرو اچکائے۔ ”آخری دفعہ جب ہم میرے آفس میں ملے تھے تو آپ نے کہا تھا آپ کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

”اس بات کو ایک زمانہ بیت گیا ہے۔“ ”چھ دن بھی نہیں گزرے تالیہ۔ خیر۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ سوشل ورک کی شوقین ہیں اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ سیاسی پارٹی میں یہ کام کر سکتی ہیں۔ اچھی سوچ ہے مگر یہ یاد رکھیے گا کہ سیاسی پارٹی میں کام کرنے یہ آپ کو ملے گا کچھ نہیں۔“

”تو آپ کیوں کرتے ہیں؟“ ”کیونکہ صرف دو عہدے ایسے ہیں جو بے بیک کرتے ہیں۔ ایک سیاست دان ہونا یا دوسرا کسی سیاست دان کا کنگ میکر ہونا۔ ایک میں ہوں اور ایک میں رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ تمام جائز بے کار ہیں۔“

”تو کوئی بے کار جاب ہی دلوادیں آپ مجھے۔ کوئی اعلیٰ عہدہ۔“ اس نے کافی پیتے ہوئے شانے اچکائے۔ اشعر نے تھوڑی کوتاہی سے رگڑتے سوچا۔ ”فنانس ڈیپارٹمنٹ میں یا میڈیا اسٹریٹیجی کمیٹی میں آپ کو بہت اچھی جاب مل سکتی ہے۔ آپ کو میڈیا اسٹریٹیجی میں ہونا چاہیے۔ سیلری بھی اچھی ہوگی اور جاب بھی اسٹیٹس والی ہے۔ آپ سی وی لائی ہیں؟“

”جی۔ بالکل۔“ اس نے پرس کی طرف اشارہ

کیا۔
”او کے تو پھر میرے ساتھ اوپر آئیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی کوٹ کا بٹن بند کیا۔

”مگر امید ہے ایک بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگی کہ میں باریسن نیشنل میں کسی کو جواب نہیں دے سکتا۔ میں صرف سفارش کر سکتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ بھی مسکرا کے پرس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ ”اگر کوئی آؤٹ آف دی وے جای کر مجھے ایک اچھی پوسٹ پہ ہائر کر سکتا ہے تو وہ وان فارچ ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ آپ میری سفارش کریں تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں۔“ اس کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔

”شیور۔ آبنگ آفس میں ہوں گے۔ چلیں۔ ان سے ابھی بات کر لیتے ہیں۔“ وہ فوراً تیار ہو گیا تھا۔ اسے فارچ کے آفس میں صرف اشعری کی سفارش سے جابل مل سکتی تھی اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ فارچ یہ جان پائے کہ اشعری نے گھائل غزال والی حرکت کی تھی۔ اشعری محمود اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا اور پہلی دفعہ اس کی رائے تالیہ کے بارے میں بدل رہی تھی۔

☆☆☆

مرغی آج صبح سے ہی مسلسل کٹ کٹا رہی تھی۔ چوزے چوں چوں کرتے باغیچے میں بھاگتے پھر رہے تھے۔ بلی نے صبح حملے کی کوشش کی تو ایڈم کی ماں نوکیلی تار لے آئیں اور چھوٹی دیواروں کی منڈیر پہ لگانے لگیں۔ اسکارف لپیٹے آستین چڑھائے ایبو ٹھنڈی میٹھی دھوپ میں کھڑی تار لگا رہی تھیں۔ دفعتاً کسی احساس کے تحت پیچھے دیکھا تو ایڈم کو برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھے پایا۔ وہ نوٹ پیڈ گھٹنوں پہ رکھے قلم کا کنارہ لبوں پہ دبائے دور افت کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک شب خوابی کی ریف ٹی شرٹ پہن رہی تھی۔

”کیا لکھ رہے ہو؟“

”اپنے ارد گرد کے ماحول کا گہرا مشاہدہ کر کے کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کیا لکھوں۔“

”اصلی لکھاری کو قلم اور کاغذ اٹھانے سے پہلے

معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا لکھنا ہے، اگر وہ خالی کاغذ کو گھوریں تو یا ان کا سوڈ نہیں یا وہ لکھاری نہیں۔“

”اور تمہیں لکھاریوں کے بارے میں اتنا کیسے معلوم ایبو؟“

”تمہارے تایا کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی چائے قہوے بناتے بناتے اتنی سمجھ تو آ ہی گئی تھی۔“ وہ اس کی طرف پشت کیے تار پلیٹ رہی تھیں۔

ایڈم نے سست روی سے ہاتھ کی پشت سے جمائی روکی۔ پھر اداسی سے دور آسمان کو دیکھنے لگا۔

”کہانی لکھنا چاہ رہا ہوں ایبو۔“

”یہ تمہیں لکھنے کا شوق کب سے ہو گیا۔“

”جب سے ملا کہ گیا ہوں تب سے۔“

”میں دیکھ رہی ہوں ایڈم۔ جب سے واپس آئے ہو بدلے بدلے لگ رہے ہو۔ کوئی بات ہے کیا؟“ وہ میخ کے ساتھ تار کو پلیٹ کے گرہ باندھتے ہوئے بولیں۔

”نہیں۔ میں تو ویسا ہی ہوں۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کندھے اچکائے۔ مرغی کٹ کٹاتی ہوئی اس کے قدموں کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ چوزوں کا غول بھی پیچھے لپکا۔

”پھر اس لکھنے کے شوق کو چھوڑو اور نوکری تلاش کرو۔ بغیر نوکری کے فاطمہ کے گھر والے شادی نہیں کریں گے ایڈم اور شادی میں صرف دو ماہ رہتے ہیں۔“

”پیسے آجائیں گے ماں۔ بہت جلد۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا اور پیڈ پہ جھک گیا۔ قلم کھولا اور الٹا اتارنے لگا۔

ایبو نے تار کا آخری سرا باندھا اور پھر ستائش سے اسے دیکھا۔ دیوار کی منڈیر پہ سرحدی علاقے جیسی گول گول تار لگ چکی تھی۔ اب بلی کوئی جسارت کر کے تو دکھائے۔

”ایبو۔“ ایڈم کا دماغ بھٹکنے لگا تو انہیں پکارا۔ وہ مڑ کے اسے دیکھنے لگیں۔ نکھری دھوپ میں برآمدے

کی سیر میوں پہ بیٹھا ایڈم بن محمد غزوه لگ رہا تھا۔ کسی اور کے لیے غم زدہ۔

”اگر کوئی انسان کسی دوسرے کو بھول جائے ایسے بھول جائے جیسے یادداشت کھوجاتی ہے۔ جیسے سمندر میں جہاز ڈوب جاتا ہے اور دوسرا انسان مسلسل تکلیف میں ہو تو اس دوسرے کو کیا نصیحت کرنا چاہیے؟“

”دوسرا تکلیف میں کیوں ہے؟“ ایو اس کے سامنے آریں اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”دوسرے کو پہلے سے محبت تھی اور اب اس کی بے اعتنائی اس کے لیے تکلیف بن رہی ہے۔“

”اور تیسرا کیا چاہتا ہے؟“

ایڈم نے چونک کر ان کو دیکھا۔ وہ تیز دھوپ میں کھڑی تھیں اس لیے ان کا چہرہ واضح دکھائی نہ دیتا تھا۔

”تیسرا بس یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔“

”پھر اس کو چاہیے کہ دوسرے کو بتائے کہ زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے۔ کبھی جو دل کے بہت قریب تھا وہ لا پرواہ ہو جاتا ہے جیسے ہم اس کے پیر کی خاک برابر بھی نہ تھے۔ لوگ ہمیں بھول کے اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہم ان کی بے اعتنائی سے مسلسل اذیت میں رہتے ہیں۔“

”تو ایسے وقت میں کیا کیا جائے؟“

”یہ سمجھ لیا جائے کہ کوئی تیسرا یا چوتھا کسی دو لوگوں کے رشتے کو بڑوا نہیں سکتا۔ رشتوں کو وہ دو لوگ خود بھی نہیں توڑتے۔ یہ ہمارا مالک ہوتا ہے ہمارا اللہ تعالیٰ جو لوگوں کو ہماری زندگی میں لاتا ہے اور ہمارے دلوں میں ان کی محبت ڈالتا ہے۔ وہی ہنساتا ہے وہی ملاتا ہے۔ وہی مردہ ہوئے دلوں کو محبت سے زندہ کرتا ہے اور وہی ان لوگوں کو پھر ہماری زندگی سے لے بھی جاتا ہے۔ دل اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہی ان کو الگ کر دیتا ہے۔“

”اللہ تعالیٰ ایسا کیوں کرتا ہے؟“

”کیوں کا جواب ڈھونڈنے سے اذیت کم تو نہیں ہو جائے گی بیٹا۔ جسم میں تکلیف ہو تو ہم جان جاتے ہیں کہ کوئی شے درد دے رہی ہے۔ پھر ہم اس شے کو جسم سے دور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کبھی دوا لے کر کبھی چبھنا ہوا کاٹنا نکال کر کبھی گرم تو سے ہاتھ دور لے جا کر۔ جب بھی کچھ تکلیف دیتا ہے تو ہمیں اپنے آپ کو اس سے دور کرنا ہوتا ہے۔“

”میں انسانی رشتوں کی بات کر رہا ہوں۔ محبتوں کی۔“

”محبت تو راحت دیتی ہے تکلیف نہیں۔ اور اگر یہ تکلیف دینے لگے تو یہ بھی ایک نشانی ہوتی ہے کہ خود کو اذیت دینے والے شخص سے دور کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔“

”کیا فرار اس کا واحد حل ہے؟ جس سے محبت ہے اس کو نہ دیکھو اس سے دور چلے جاؤ۔ کیا ایسے دلوں کے روگ ٹھیک ہو جاتے ہیں؟“

”اکثر کے ہو جاتے ہیں۔“

”میں چاہتا ہوں وہ اس سے دور چلی جائے تاکہ اس کے دل کا روگ دور ہو سکے مگر اس نے اسے ایسی مجبوری اور وعدے کے رشتے میں باندھ دیا ہے کہ وہ تکلیف سہتی رہے گی مگر اس کے ساتھ رہے گی اور ساتھ رہنے کے بہانے ڈھونڈے گی۔ وہ ایسے کانٹے کی طرح ہے جو اس کے دل میں چبھا ہے مگر وہ اسے نکال کے تکلیف کو کم بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ اب باغیچے میں بھاگتے چوزوں کے ننھے پیروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو پھر تیسرے کو چاہیے کہ ان دونوں کو ان کے حال پہ چھوڑ کے اپنی تکلیف کی فکر کرے۔“

ایڈم نے سر جھٹکا اور پھر نگاہیں چرا کر چہرہ کاغذ پہ جھکا دیا۔

”شکر یہ ماں۔ مجھے لکھنے کے لیے موضوع مل گیا ہے۔“ وہ ماں سے نظر ملائے بغیر تیز قلم کاغذ پہ تھپتھپانے لگا۔ ایو دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے انہیں سے اسے دیکھتی رہیں۔

جس وقت اشعر محمود نے آفس کا دروازہ کھولا، فاتح اپنی کرسی سے اٹھ کے کافی ٹیبل کی طرف جا رہا تھا۔ کوٹ اسٹینڈ پہ ٹنگا تھا اور وہ سفید شرٹ اور اسٹراپ والی ٹائی میں ملبوس تھا۔ دروازہ کھلنے پہ گردن موڑ کے دیکھا۔ اشعر کو وہاں پا کے ہلکا سا مسکرایا اور کافی اسٹینڈ تک آیا۔

”خیریت؟“

”میرا ایک کام کرنا ہے آپ کو۔“ اشعر بٹا شت سے کہتا سامنے آیا اور کھڑے کھڑے بولا۔ ”کسی کو جاب چاہیے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کو ہمارے آفس میں کوئی اونچا عہدہ دیں۔ ڈیپارٹمنٹ ہیڈ بنا دیں یا کوئی بھی اچھی جاب۔ آپ یہ کر سکتے ہیں۔“

فاتح نے پانی کی بوتل اٹھائی اور ڈھکن اٹکیوں سے گھما کے کھولا۔ ”میرٹ بنتا ہے اس کا؟“

”وہ ٹیلنڈ بھی ہے اور اہل بھی۔ مجھے یقین ہے وہ بہت اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔“ وہ وہیں میز کے کنارے کھڑا کہہ رہا تھا۔

”ایش..... یوں ایک دم کسی کو رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے ایچ آر کو مطمئن کرنا ہوگا۔ پھر آٹھکس کمیٹی کو بھی مسئلے ہو جاتے ہیں اس طرح کی تقرریوں سے۔“ کہتے ہوئے فاتح نے کافی میکر کا ڈھکن اٹھایا اور بوتل اس کے اندر انڈیلی۔ پانی کی دھار گرنے لگی تو وہ بوتل اوپر لے گیا۔ کافی اوپر۔ پانی اب لمبی دھار کی صورت نیچے گرتا خانے کو بھر رہا تھا۔ اشعر نے گردن اونچی کر کے پہلے اس کے ہاتھوں کی مہارت دیکھی۔ پھر اس کو دیکھا۔

”آبنگ..... صاف بات کرتے ہیں۔ میں نے اتنے سالوں میں آپ کے کہنے پہ بہت سے غریب لوگوں کو اپنی فرم میں نوکریاں دی ہیں۔ پارٹی میں کارکنوں کو اپنی طاقت کے مطابق اکو موڈیٹ کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے مجھے آپ ایچ آر کے حوالے مت دیں۔ مجھے زبان دیجیے کہ آپ میری امیدوار کو ایک بہت اچھی جاب دلوا دیں گے۔ اپنے آس

پاس۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

”شیور۔ میں اس کی اہلیت کے مطابق اس کو یہاں جاب دلوا دوں گا۔ اسے بھیجوں۔“

پھر فاتح نے کین کھول کے کافی نکالی اور کافی میکر کے اندر لٹی۔ ہر خانے کو جگہ پہ فکس کیا اور بٹن آن کیا۔ اسی دوران دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ بوتل اور فلٹر پیپرز کو اپنی جگہ پہ سیٹ کر کے اسی بے نیازی سے مڑا تو دیکھا۔

اشعر کے ساتھ وہاں تالیہ کھڑی تھی۔ گردن میں رومال کی گرہ لگائے سنہرے بالوں کو جوڑے میں سمیٹے وہ سادگی سے کبھی اس کو دیکھتی کبھی اشعر کو۔ فائل سینے سے لگا رکھی تھی۔

وان فاتح نے دونوں ابرو اٹھا کے اسے دیکھا۔

”سیر یسلی؟“ پھر جیسے تعجب سے سر جھٹک کے ہنسا۔

”تالیہ.... آبنگ نے مجھے زبان دی ہے کہ وہ تمہیں اپنے قریب بہت اچھی جاب دلوا دیں گے۔“ ساتھ ہی اشعر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی تو فاتح نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ اور تالشہ.... تم بیٹھو۔“ اشعر نے جانے سے قبل اس کی آنکھوں میں دیکھ کے یاد دہانی کروائی جیسے کہہ رہا ہو۔ (آبنگ.... آپ یہ ضرور کریں گے کیونکہ میں بھی آپ کے کام کرتا رہا ہوں۔) فاتح نے خاموشی سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تو تالیہ کرسی پہ بیٹھی اور فائل سامنے رکھ دی۔ کندھے اور گردن سیدھی رکھے۔ اب وہ خود اعتمادی سے فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

”تو تمہیں بی این (بارسین نیشنل) میں اچھی جاب چاہیے؟“ عینک لگاتے ہوئے سامنے کرسی پہ بیٹھا اور فائل اٹھا کے کھولی۔ انداز پر فیشنل ہو گیا۔ رات والے واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

”جی سر!“

”ہوں!“ وہ اس کے کاغذات کو پڑھ رہا تھا۔

کوئی میں رکھے کافی میکر سے پانی ابلنے کی آواز
آئی تھی۔

”ماسٹرز میں تم نے پلٹ کر کل سائنس یا آئی آر یا
سوشالوجی نہیں پڑھی لیکن کوئی بات نہیں۔“ اس نے
صفحہ پلٹا دیا۔ ”تمہارے مارکس اچھے تھے۔ لاہور سے
کیا تھا تم نے ماسٹرز؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ
رہا تھا۔ ”کے ایل سے تم نے چند آرٹ کورسز کیے
ہیں۔ پینٹنگز اور جسے بنا سکتی ہو۔ رائل شوٹنگ کا
کورس جمناسٹک۔ ہوں۔“

پانی ابلنے کی آواز بلند ہوئی تو کافی کی مہک اس
کے نٹھنوں سے ٹکرانے لگی۔ وہ خاموشی سے اس کو اپنی
فائل پڑھتے دیکھے گئی۔

”سی دی اتنی متاثر کن نہیں ہے تمہاری لیکن
اشعر سے وعدہ کیا ہے میں نے۔“ اب اس نے واپس
پہلا صفحہ پلٹا دیا اور رک کے اس کا نام پڑھا۔ ”تالیہ مراد
بنت مراد راجہ۔“ پھر عینک کے اوپر سے آنکھیں اٹھا
کے اسے دیکھا اور مسکرایا۔

”تمہارے دادا کو بھی تمہاری طرح تاریخ سے
دلچسپی تھی کیا؟ کیونکہ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ملا کہ
سلطنت کے ایک بندہ ہارا کے نام پر رکھا ہے۔“
تالیہ کی گردن میں گٹھلی سی ڈوب کے ابھری مگر
تاثرات ہموار رہے۔ ”مراد راجہ صرف سلطان مرسل
شاہ کے بندہ ہارا کا نام نہیں تھا یہ عام سا نام ہے۔“ پھر
توقف کیا۔ ”اور ویسے بھی بندہ ہارا مراد راجہ اتنا مشہور
نہیں کہ اس کے نام کے اوپر لوگوں کے نام رکھے
جائیں۔“ آواز تلخ ہو گئی۔ اندر جیسے اپنے باپ کے
لیے غصہ ابلنے لگا۔

”مشہور ہونے کی بات نہیں ہوتی‘ تاہم۔ مراد
راجہ تاریخ کا ایک عظیم کردار تھا اور اس کو میرا خیال ہے
لوگ misunderstand کرتے آئے
ہیں۔ وہ ایک اچھا اور آراہیل آدمی تھا۔ مگر ہماری
سوشلائٹ لڑکیوں کو تاریخ کی گہرائی میں جانے کا
شوق نہیں ہوتا۔ افسوس۔“ قانع کی نظریں فائل پہ
جھک گئیں تو وہ بہت ضبط سے بولی۔

”تاریخ ویسی نہیں ہوتی جیسی مورخ قلمبند
کرتے ہیں۔“
مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

”تمہارے والد حیات ہیں؟“ پھر یاد آیا۔ ”ادہ
رائٹ، ان کی وفات ہو چکی ہے جس کے بعد تمہیں یہ
سب تر کے میں ملا تھا۔ عصرہ نے بتایا تھا۔ خیر۔ کیا
کرتے تھے وہ؟“

”وہ سیاست دان تھے۔ بہت دانا، بہت
زیرک انسان تھے۔ اور ان کی وفات نہیں ہوئی۔“
قانع نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ سادگی سے کہہ
رہی تھی۔ ”جب آخری دفعہ میں نے انہیں دیکھا تھا تو
وہ زندہ تھے اور صحیح سلامت تھے۔ ہاں، اب ان کی قبر
بھی ہے اور دقت کی دھول میں وہ قبر ملیا میٹ ہو چکی
ہو گی مگر میرے لیے وہ ابھی بھی زندہ ہیں۔“
”ہاؤ نائس!“ اس نے بغیر اثر لیے صفحہ پلٹا دیا۔
پھر کچھ پڑھ کر چونک کے اسے عینک کے اوپر سے
دیکھا۔

”میریٹل اسٹیٹس۔ میرڈ؟ تو تم شادی شدہ ہو؟
پھر ہم ابھی تک تمہارے شوہر سے کیوں نہیں ملے؟“
فائل بند کرتے ہوئے عینک اتار کے رکھی اور پیچھے کو
ٹیک لگائی۔ تالیہ مراد کے اندر تک کانٹے سے چبھ
گئے۔ تکلیف بہت زیادہ تھی۔

”میں اور میرے شوہر۔ ہم ساتھ نہیں رہتے۔“
وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہنے لگی۔ وہاں کوئی
جذبہ، کوئی بے چینی کچھ نہ تھا۔ یادوں کے ساتھ
احساس بھی مر گئے تھے۔

”کیوں؟“ اس نے تعجب سے ابرو اکٹھے کیے۔
”ہم ایک لمبے سفر سے لوٹے تو میں نے جانا
کہ وہ واپس نہیں آیا۔ وہ ایک دوسرے سفر پہ نکل گیا۔
شاید خود غرض تھا، شاید مجھے پروجیکٹ کرنا چاہتا تھا۔
ساتھ بھی نہیں رہا اور چھوڑا بھی نہیں۔ اب اس کے
آگے اوپچی منزلیں ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ وہ ان
کو پالے۔“

کرسی پہ ٹیک لگائے، گال تلے انگلی رکھے بیٹھے

فاتح نے سوچنے والے انداز میں پوچھا۔ ”واپس آئے گا کیا؟“

وہ مسکرائی اور آگے کو جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں تالیہ بنت مراد راجہ ہوں۔ اگر وہ خود سے واپس نہ آیا تو اس کو گردن سے دبوچ کے واپس کھینچ لاؤں گی۔ پھر چاہے مجھے کسی کی قبر بنانی پڑے یا پرانی قبر کھودنی پڑے، ایک بات تو طے ہے کہ تالیہ کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔“

”او کے کول... خیر... باریسن نیشنل میں کیوں کام کرنا چاہتی ہو؟ حالانکہ تم جانتی ہو میں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتا۔“

ابلتی کافی قطرہ قطرہ جگ میں گر رہی تھی اور اس کی کڑوی خوشبو سارے آفس میں پھیل چکی تھی۔

(میں چاہتا ہوں وہ میرے ساتھ رہے کیونکہ اسے میری اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔ چار ماہ قبل میں تالیہ کو ایک بددیانت اور سطحی سوشلائٹ کے طور پر جانتا تھا جس نے میری فائل چرائی تھی۔ اگر چیزیں واپس اسی مقام پہ پہنچ جائیں، تب بھی یہی چاہوں گا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ بھلے میں اسے ناپسند کروں، اسے دھتکاروں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ تب بھی میرے ساتھ رہے۔ امید ہے اسے وعدے نبھانے آتے ہوں گے۔)

اس نے بہت سی کڑوی مہک اندر اتاری اور مسکرا کے گویا ہوئی۔

”آپ کے ساتھ کام کرنا میری سی وی کو چار چاند لگا دے گا۔ کچھ عرصے کی جاب سے مجھے مستقبل میں بہتر جاب مل جائیں گی۔ اور میں ایک اعلیٰ عہدہ اس لیے بھی چاہتی ہوں کیونکہ مجھے لیڈ کرنے کی عادت ہے، لیڈ ہونے کی نہیں۔ مجھے لیڈی باس بن کے حکم چلانا اچھا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے میں ماتحتی کرنے کے بجائے ایک اچھی پروجیکٹ ہیڈ بن سکتی ہوں۔ مجھے سیاست کی سمجھ بوجھ بھی ہے اور مجھے عالمی سیاست سے دلچسپی بھی ہے۔ آپ مجھے کام دیں، میں ہر کام کر سکتی ہوں۔“

”اعلیٰ عہدے کا مطلب ہے، کام کا بہت زیادہ بوجھ اور جہاں تک میں اپنے معاشرے کو جانتا ہوں، نازک سوشلائٹس دن کے بارہ بجے اٹھتی ہیں اور ان کی ساری زندگی شام کو ہونے والی پارٹی کا گاؤن منتخب کرنے تک محدود رہتی ہے۔ اگر میں تمہیں کوئی بہت بڑا عہدہ دے بھی دوں تو کیا تم کام کر لو گی؟“ وہ سنجیدہ تھا۔

کافی ابل ابل کے جگ کو بھر چکی تھی اور پھر مشین ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

”میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ مجھے جو کام جب بھی اور جتنا بھی دیں گے، میں بغیر شکایت کے اسے مکمل کر کے دوں گی۔ میں سب کر سکتی ہوں۔ آپ جلد جان جائیں گے۔“

”سو تمہارا کوئی سوشل ورک، لوگوں کی بہبود وغیرہ کے عزائم نہیں ہیں؟“

”میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ گو کہ مجھے بہت اچھی سیاسی سمجھ بوجھ ہے، مگر میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں بی این میں اس لیے آنا چاہتی ہوں کہ ملائیشیا جیسے ایک تیسری دنیا کے ملک کو دنیا کا بہترین ملک بنا دوں، وغیرہ وغیرہ، یا پھر۔۔۔۔۔“

”تیسری دنیا کیا ہوتی ہے تاش؟“

اس نے ایک دم پوچھا تو وہ بولتے بولتے رکی۔

ابرو بھنج کے پوچھا۔ ”سوری؟“

”تیسری دنیا کا ملک ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا، کرسی دھکیلی اور کافی ٹیبل تک گیا۔

”ترقی پذیر ملک۔ گو کہ ملائیشیا اب ایسا نہیں ہے مگر میری بات کا مطلب تھا کہ۔۔۔۔۔“

”سرد جنگ ایک بہت طویل جنگ تھی جو ہماری دنیا میں ہوئی تھی۔ یہ دراصل جنگ نہیں تھی، بس امریکہ اور روس کے درمیان ایک تناؤ، ایک ٹی ٹی کہ کس کا نظام بہتر ہے۔ امریکہ کا لیپٹل ازم یا روس کا کمیونزم۔“ وہ کیبنٹ کھول کے کافی کا گنگ نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تالیہ کرسی پہ ترچھی ہو کے اسے دیکھنے لگی۔

”ایک طرف مغربی بلاک تھا۔ امریکہ اور نیٹو ممالک کا۔ دوسری طرف مشرقی بلاک تھا۔ سوویت یونین (روس) اور اس کے اتحادیوں کا۔ کئی سال یہ دونوں بلاک اپنے نظام کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔“ اس نے کافی میکر کے اندر سے گرم جگ نکالا اورنگ میں اسے انڈیلا۔

”جن ممالک نے اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا، ان کو پہلی دنیا کے ممالک کہا جاتا تھا۔ جنہوں نے روس کا ساتھ دیا، وہ دوسری دنیا کے ممالک کہلائے اور۔“ اس نے جگ لگ لگ سے دو تین فٹ اوپر اٹھا دیا۔ لمبی سی سیاہ دھاریں نیچے گرتی دکھائی دے رہی تھی۔ تالیہ کی نظریں اس دھاریں پر جم سی گئیں۔ اندر ہی اندر کچھ ڈوب کے ابھرا تھا۔ ابوالخیر کا بہترین غلام قہوے کو دھار کی صورت پیالے میں بھرا کرتا تھا۔

”اور جو ممالک نیوٹرل رہے۔۔۔ انہوں نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔ ان کو تیسری دنیا کے ممالک کہا جاتا تھا۔“ اس نے جگ رکھا اورنگ اٹھائے کرسی تک واپس آیا۔ سیٹ سنبھالی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”آج لوگ غلط العام انداز میں تیسری دنیا کے ممالک سے مراد غریب ترقی پذیر ممالک لیتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی تحقیق آمیز اصطلاح نہیں تھی۔ مگر اب لوگوں نے اس کا مطلب بدل دیا ہے۔ جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں۔ آرٹ اور تاریخ کو کمرشل فائدے کے لیے استعمال کرنا الگ چیز ہے اور اس میں دلچسپی لے کر اس سے کچھ سیکھنا الگ۔“ پھر گھونٹ بھر کے میز پر رکھا اور اسی جتنا مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ ”سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والوں کو سرد جنگ کے بلاکس کے بارے میں عموماً معلوم ہوا کرتا ہے مگر خیر..... تم یہاں کام کرو گی تو سیکھ جاؤ گی۔“ پھر اس کی فائل اس کی طرف دھکیلی۔ ”تم سوموار سے جوائن کر سکتی ہو۔“

اس کی ساری بکڑواہٹ کو پی کے وہ سپاٹ سا

مسکرائی اور فائل لیے اٹھی۔

”سوموار بہترین رہے گا کیونکہ ویسے بھی مجھے ویک اینڈ پہ ملا کہ جانا ہے۔ اپنے نئے گھر کا جائزہ بھی تو لینا ہے۔“ جتنا تے ہوئے کہا تو اس نے لیپ ٹاپ کھول لیا اور عینک ناک پہ جمائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نہ خدا حافظ، نہ الوداع۔ بس بے رخی کافی تھی۔ اور وہ یہ پہلی دفعہ تھوڑی کر رہا تھا۔

مگر یہ طے تھا کہ تالیہ کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے خود سے دہرایا تھا۔ ”کیسا رہا انٹرویو؟“ وہ آفس سے نکل کے کارڈور تک آئی تھی کہ اشعر جو سامنے سے دو افراد کے ساتھ چلتا آ رہا تھا، اسے دیکھ کے رکا اور مسکرا کے پوچھا۔

”توقع کے برخلاف، بہت اچھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ اسے واقعی امید نہ تھی کہ فلاح اتنی آسانی سے جاب دینے پر راضی ہو جائے گا۔

اشعر کو الوداع کہہ کر وہ راہداری کے دہانے تک آئی تو کونے میں اس کی طرف پشت کیے کھڑے آدمی نے ایک دم رخ موڑا۔ تالیہ جو فائل سینے سے لگائے چلتی جا رہی تھی، ٹھٹک کے رکی۔ پھر اس کا چہرہ دیکھ کے سن رہ گئی۔

وہ سمجھ گیا تھا۔

ڈریس شرٹ پہنے وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا جتانے والے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ تالیہ نے فوراً اس طرف دیکھا جہاں سے وہ آئی تھی۔ وہاں اشعر ابھی تک کھڑا ان دو افراد سے کوئی بات کر رہا تھا۔ آگے پیچھے دوسرے لوگ بھی آ جا رہے تھے۔

”اشعر صاحب سے میرا تعارف نہیں کرواؤ گی ڈیر وائف؟“ وہ گہری نظریں اس کے چہرے پہ جمائے ہوئے تھا جو ایک دم فق ہوا تھا۔ پھر وہ ہنسی۔ ماتھے پہ بل پڑے۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”تم نے خود کہا تھا کہ میں ان کو سب بتا دوں۔ وہی بتانے آیا ہوں۔“ بے نیازی بھری مسکراہٹ

سے کہتا وہ اس کے ساتھ سے گزر کے اشعر کی طرف بڑھا تو تالیہ جلدی سے بولی۔

”رکو۔ پلیز رکو، سمیع۔“ وہ جیسے پریشانی کو چھپاتے ہوئے سوچ سوچ کے کہہ رہی تھی۔
سمیع رکا اور مسکرا کے پلٹا۔

”ادھر آؤ۔۔۔ یہاں بات کرتے ہیں۔“ وہ تیزی سے ریٹ رومز کی طرف بڑھی۔ سمیع پیچھے آیا۔

وہ ایک طویل ہال تھا جس میں سنک بنے تھے اور دوسری طرف ہاتھ رومز کے دروازے تھے۔ سمیع جیسے ہی اندر آیا تالیہ نے دروازہ بند کیا اور غصے سے اس کی طرف گھومی۔

”تم میری جان چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“
”تم اب بھی مجھ سے ڈرتی ہو۔“ وہ دونوں وہاں اکیلے تھے۔

”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ جواباً سمیع نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔
”تم جاب لینے آئی ہو یہاں، ہے نا؟ میں نے اشعر صاحب کی بات سن لی تھی۔ تم جتنی بہادر رہنے کی اداکاری کر لو، تم اپنے نئے آفس میں کوئی تماشا نہیں بنانا چاہو گی۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“
”صرف اپنا اتنا سا حصہ!“ دو انگلیوں کے درمیان ذرا سا خلا بنا کے دکھایا۔

”میرے پاس اتنا کیش ہے، نہ ہوتا ہے۔“ وہ زچ ہوئی۔ ”اور بینک سے میں تمہیں ایک پیسہ نہیں بھیجوں گی۔“

”ہاں ظاہر ہے سیاسی جماعت میں کام کرنے کے بعد تمہاری بینک ٹرانزیکشنز پر کڑی نظر رہے گی۔ میں تمہیں مشکل میں تھوڑی ڈالوں گا تالیہ۔“

”سمجھ میں آ گیا نا تمہارے؟ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”یہ بات وہ عورت کہہ رہی ہے جو صرف جاب انٹرویو پر بھی لاکھوں کی جیولری پہن کے آئی ہے۔“

تالیہ بدک کے پیچھے ہٹی۔ اس کے ہاتھ خالی

تھے مگر کانوں میں پہنے ایر رنگز کے موٹے موٹے ہیرے جگمگا رہے تھے۔

”تم مجھے یہ ہیرے دے سکتی ہو۔“ اس نے اس کے کانوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ نفلی ہیں۔ یہ سب زرقون ہیں۔“ گردن اکڑا کے بولی۔

”سب اصلی ہیں اور یہ تو صرف پہلی قسط ہے۔ ایر رنگز پلیز۔“ وہ ہتھیلی پھیلانے کھڑا تھا۔

”اور یہ مت سمجھنا کہ میں ان کو بغیر رسید کے بیچ نہیں سکتا۔ میرے اتنے سنا جانے والے ہیں کہ میں صرف ہیرے الگ کروا کے بیچ سکتا ہوں۔ اب میرا وقت ضائع مت کرو اور مجھے یہ ایر رنگز دو۔“

”یہ پہلی اور آخری دفعہ ہے سمیع۔“ وہ بے بسی سے غرائی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے نوچنے والے انداز میں اپنے کانوں سے موٹے موٹے ہیروں والے ٹاپس اتارے اور اس کی مٹھی پہ پٹختے۔

”آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ ورنہ تمہاری جان لے لوں گی۔“

سمیع نے روشنی میں اٹھا کے ان ہیروں کو دیکھا، پھر مسکرا کے سر کو خم دیا۔ ”شکر یہ دوست۔“

اور انہیں جیب میں ڈالتا آگے بڑھ گیا۔ تالیہ زیر لب کچھ بڑبڑاتی رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے دھک رہا تھا اور وہ سخت جھنجھلائی ہوئی لگتی تھی۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ وہ رات اتری تو لان کی ساری بتیاں جگمگا تھیں۔ اندر لاؤنج میں عصرہ صوفے پر بیٹھی، لیپ ٹاپ کھولے کام کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سادہ سی سرمئی میکسی میں ملبوس، کندھے پہ سیاہ اسٹول ڈالے بالوں کو الجھے ہوئے جوڑے میں باندھے پوزی توجہ سے اسکرین پہ جھکی تھی جب جولیانا نہ رونی ہوئی بھاگتی آئی۔

”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ سکندر نے مجھے مارا ہے۔“ لے بالوں والی بچی بھیگی آنکھیں ملتی تیزی سے اس کے

تھمتے سے آگئی۔ عصرہ نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا اور اپنے گال پہ آئے بال پیچھے اڑے۔
”کیوں؟“

”وہ گیم میں ہار رہا تھا تو اس نے میرا جواب اسٹک چھین لیا اور مجھے مارا۔“ وہ بھاں بھاں کیے روئے جا رہی تھی۔

”سکندر!“ عصرہ نے اسکرین فولڈ کی اور پر سکون انداز میں زور سے آواز دی۔ سکندر تیوریاں بڑھائے خفا خفا سا باہر نکل آیا۔
”جی ماما؟“

عصرہ نے دو انگلیوں سے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سرخ چہرہ لیے سامنے آیا۔

”ماما..... سکندر کو بھی ماریں جیسے اس نے مجھے مارا ہے۔“ اسے دیکھ کے وہ مزید زور سے رونا شروع ہوئی۔ سکندر نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا مگر خاموش رہا۔

”سکندر.....“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ”آپ ابھی کچھ غلط کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ غلط کیا مگر کیا آپ کو معلوم ہے؟“
سکندر خاموش رہا۔

”آپ میرے کمرے میں جاؤ اور گیارہ منٹ تک سوچو کہ آپ نے کیا غلط کیا ہے کیوں کیا ہے۔“ اسے واپس آ کے مجھے اپنی ریزنز بتاؤ گے۔“ ساتھ ہی اسے جانے کا اشارہ کیا۔ سکندر خفا خفا فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جولیانا نے آنسو پونچھتے خفگی سے اسے دیکھا۔

”اسے گیارہ منٹ کیوں دیے ماما؟ مجھے ہمیشہ آٹھ منٹ ملتے ہیں۔“

”کیونکہ آپ آٹھ سال کی ہو اور وہ گیارہ سال کا۔ ہم جتنے بڑے ہو جاتے ہیں ہمیں اپنی غلطیوں پہ غور کرنے کے لیے اتنا زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اب آپ آنسو صاف کرو۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ جولیانا نے زبردستی آنسو صاف کیے اور منہ پھلا کے بیٹھ گئی۔ عصرہ نے فون اٹھایا اور نمبر ملا کے اسے کان

سے لگایا۔

”کتنا سامان بچا ہے گیلری میں؟“ اب وہ اپنی سیکریٹری سے پوچھ رہی تھی۔

”بس چند ہی آئٹمز ہیں جو بک نہیں سکے۔“
”ان کو آن لائن سیل پہ لگا دو۔ مجھے اس سارے مال سے جان چھڑانی ہے بس۔“

وہ واقعی جان چھڑانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ساتھ ہی کنپٹیوں کو دبایا۔ نیلامی کی سروردی بالآخر ختم ہونے والی تھی۔

بات مکمل ہوئی تو سکندر باہر آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ اب قدرے جھکا ہوا تھا۔ سرخی غائب تھی۔ وہ چپ چاپ اس کے دوسری طرف آ بیٹھا۔ درمیان میں ماں بھی..... جولیانا نے گردن نکال کے اس کا جائزہ لیا۔

”پھر آپ نے سوچا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟“

”جی۔“ اس نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔
”جولیانا جیت رہی تھی تو مجھے غصہ آ گیا۔ یہ گیم میں نے اسے سکھائی تھی۔ میں اس میں جیتنا چاہتا تھا۔“
”تو آپ اسے جیتنے دیتے بعد اور میں نئی گیم شروع کر کے زیادہ اچھا کھیل کے اسے ہرا دیتے۔“
”وہ تو میں اسے ہرا ہی دوں گا۔“ ابرو اچکا کے بولا پھر ماں کی شکل دیکھ کے چہرہ جھکایا۔ ”سوری ماما۔“

”جیتنے کے لیے دوسرے کو تکلیف دینا ضروری نہیں ہوتی، سکندر۔ میں آئندہ یہ نہ سنوں کہ آپ نے بہن سے ہاتھ اٹھایا ہے۔ آپ کو معلوم ہے رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی بچے پہ ہاتھ نہیں اٹھایا تھا؟ آپ مسلمان ہو۔ اور مسلمان ایسے کرتے ہیں کیا؟“
”مگر ماما۔ جولیانا چیٹنگ بھی تو کر رہی تھی۔“

عصرہ نے چونک کے گردن گھمائی۔ جولیانا یکدم پھسکی پڑ گئی۔

”سکندر سچ کہہ رہا ہے؟“ اس نے اسے گھورا۔ جولیانا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں صرف.....“

”آٹھ منٹ جولیانہ! صرف آٹھ منٹ!“ اس نے چٹکی بجا کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آنسو روکتی کمرے کی طرف بھاگی۔

سکندر نے گہری سانس بھری اور ذرا چوڑا ہو کے صوفے پہ بیٹھا۔ ”ماما..... آپ اس کو سمجھایا کریں۔ یہ جھوٹ بھی بولنے لگی ہے اور چوری بھی کرتی ہے۔“

”کیا اس نے پہلے بھی ایسا کیا ہے؟“ وہ متفکر ہوئی۔

”جی ماما۔ یہ فرینڈ کی نوٹ بک کپڑوں میں چھپا کے لے آئی۔ میں نے دیکھ لی تو کہا کہ یہ غلط بات ہے۔ مگر ماما وہ بد تمیزی سے بولی۔ ماما نے بھی تو ڈیڈ کے لاکر سے فائل نکال کے کپڑوں میں چھپائی تھی۔ ایسا کرنے سے گناہ نہیں ملتا۔“

عصرہ بنت محمود بالکل شل رہ گئی۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔

”کیا بے کار بات کر رہے ہو سکندر؟ میں نے کب کچھ چھپایا ہے؟“ پھر غصے سے اس کا چہرہ دہکا۔

”ماما مجھے پتا ہے جولیانہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ وہ فوراً بولا تو عصرہ نے تھوک نگلا۔

”اگر یہ بات آپ کے ڈیڈ کو معلوم ہوئی تو وہ آپ دونوں سے ناراض ہو جائیں گے۔ وعدہ کرو آپ یہ بات ان کو نہیں کہو گے۔ اگر وہ ناراض ہوئے تو گھر نہیں آئیں گے۔“ وہ گھبرا گئی تھی۔

”آف کورس ماما۔ میں نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے جلدی سے ماں کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ عصرہ کو ایک دم ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اب جولیانہ کو الگ سے ڈانٹتی ہوں۔“ سکندر کو تسلی دلانے کے وہ تیزی سے کمرے کی طرف آئی۔ جولیانہ بیڈ پہ بیٹھی سر ہاتھوں پہ گرائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کے چونک کے گردن اٹھائی۔

”ماما ابھی تو فائیو منٹ ہوئے ہیں اور.....“

”جولی۔“ عصرہ جلدی سے اس کے ساتھ بیٹھی

اور نرمی سے اس کے بالوں کو سہلایا۔ ”آپ نے سکندر کو یہ کہا ہے کہ ماما نے ڈیڈ کی الماری سے کچھ چھپایا تھا؟“

جولیانہ نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ ”میں نے نہیں کہا۔“

”آپ جھوٹ بھی بولنے لگی ہو جولی۔“ وہ بے بسی بھرے غصے سے بولی۔ پھر گہری سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔ ”مجھے تو نہیں یاد کہ میں نے کبھی کچھ کپڑوں میں چھپایا ہو۔“

”وہ اس رات..... میں نے دیکھا تھا۔“ انک انک کے بولی۔ عصرہ کے دل کی دھڑکن سست ہو گئی۔

”کیا؟ مجھے بتاؤ میں نہیں ڈانٹوں گی۔“

”میں ڈیڈ کے ہاتھ روم میں تھی تب آپ آئی تھیں اور آپ نے....“ وہ رک رک کے بتا رہی تھی۔

”کوئی فائل لاکر سے نکال کے کپڑوں میں چھپائی تھی۔ پھر آپ چلی گئی تھیں۔“

”اور آپ ڈیڈ کے ہاتھ روم میں کیا کر رہی تھیں؟“ ایک چوکی مجھے پتا ہے۔ آپ تو تھ پیسٹ کھا رہی تھیں ہے نا؟“ وہ ایک دم غصے سے بولی تو جولیانہ نے سہم کے سر جھکا لیا۔

”آپ کے ہاتھ روم کی ٹو تھ پیسٹ میں چیک کرتی ہوں تو آپ نے سوچا آپ ڈیڈ کی کھاؤ کی تو مجھے پتا نہیں چلے گا۔ بتاؤں میں ڈیڈ کو؟ بتاؤں؟“

”ماما سوری۔ آئندہ نہیں کروں گی۔“

”اگر آئندہ آپ نے ٹو تھ پیسٹ کو منہ میں تو میں ڈیڈ کو بتا دوں گی کہ آپ ان کا ٹو تھ پیسٹ کھالی ہو۔ اس دن بھی مجھے پتا تھا کہ آپ اندر ہو اسی لیے میں آئی مگر سوچا آپ کو خود احساس ہو جائے گا اسی لیے میں اپنی چیزیں لے کر چلی گئی۔“ وہ اب بے ربط انداز میں کہتی اسی کو ڈانٹے جا رہی تھی۔ ہتھیلیاں پسینے سے بھیک چکی تھیں۔

جب وہ دونوں باہر نکلیں تو جولیانہ نارمل لگ رہی تھی اور عصرہ بھی سنبھلی ہوئی تھی۔ فاح گھر آچکا تھا اور

کچن سے آوازیں آرہی تھیں۔

”میں نے پارٹی چیئر مین شپ کے لیے
کاغذات جمع کروادیے ہیں۔ دو ماہ بعد انکیشن ہے۔
سوموار سے ہم کمپین شروع کریں گے۔“
”کیا پھر آپ پارٹی چیئر مین بن جائیں گے۔“

”کیا آپ پردھان منتری بن جائیں گے؟“
دونوں بچوں نے یکے بعد دیگرے سوال پوچھا۔ عصرہ
کے ہاتھوں میں مزید تیزی آگئی۔

”جب کوئی اسکول کی فٹ بال ٹیم میں شامل
ہوتا ہے تو اس کا خواب ہوتا ہے کہ وہ بہترین پلئیر
بنے۔ پھر وہ کیپٹن بنے، پھر وہ قومی لیول پہ کھیلے۔ اور
آخر میں وہ قومی ٹیم کا کیپٹن بنے۔ جب کوئی فوج
میں بھرتی ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ ایک دن وہ آرمی
چیف بنے۔ اپنے ملک کی اعلیٰ ترین سطح پہ نمائندگی
کرنے کا خواب دیکھنا بری بات نہیں ہے۔ ہر
سیاست دان اعلیٰ ترین مقام پہ پہنچنا چاہتا ہے۔ اور
میں.....“ اس نے باری باری تینوں کو دیکھا۔ ”اس
کے بہت قریب ہوں۔ تم لوگوں سے میں صرف اتنا
چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔“

بچے چپ ہو گئے۔ جولیانا نے ماں کو دیکھا اور
سکندر کا چہرہ جھک گیا۔

”جب بھی سیمپن شپ شروع ہوتی ہے ڈیڈ، ہر
طرف سے مسئلے شروع ہو جاتے ہیں۔“ اس کو
”مسکوں“ کے علاوہ کوئی لفظ نہیں مل رہا تھا۔

”تم یہ یقین رکھو سکندر کہ تمہارا باپ ہر موقع پہ
تمہاری حفاظت کرے گا اور۔“

”جیسے آریاناہ کی حفاظت کی تھی؟“ عصرہ نے
ایک دم میٹ بال ڈش میں پٹخی اور اس کی طرف گھومی
تو آنکھوں میں بے بسی بھرا غصہ تھا۔ ”اور اگر میں
آریاناہ کو بھلا بھی دوں تب بھی ہر سیمپن کے شروع
ہوتے ہی منفی مہم شروع ہو جاتی ہے۔ میرے بچوں
سے رپورٹرز سوال پوچھتے ہیں۔ مجھے ہر جگہ مسکرا مسکرا
کے لوگوں سے وعدے کرنے پڑتے ہیں۔ انٹرویوز“

وہ جولیاناہ کا ہاتھ تھامے قدرے تعجب سے
راہداری میں آگے بڑھتی گئی، یہاں تک کہ کچن کا کھلا
دروازہ سامنے آیا تو اس نے چوکھٹ سے اندر جھانکا۔
کچن کھلا اور سفید ٹائلز سے آراستہ تھا۔ کاؤنٹر پہ

سکندر بیٹھا تھا اور دوسرے کے ساتھ فاح فیک لگائے
بازو سینے پہ لیٹے کھڑا تھا۔ ٹائی ڈھیلی کیے شرٹ کے
کف موڑے وہ تھکا تھکا لگتا تھا مگر مسکرا کر سکندر سے
کچھ کہہ رہا تھا جب وہ اندر داخل ہوئی۔

”تم آج کچن میں کیسے؟“
فاح نے نگاہیں پھیر کے اسے دیکھا اور
مسکرایا۔ ”بھوک لگی تھی۔ کھانا لینے آیا تھا۔“

”کھانا ملازمہ نے ٹیبل پہ لگا تو دیا تھا۔“ عصرہ
تعجب سے اندر آئی۔

”ڈیڈ کو کھانے کا ذائقہ نہیں پسند آرہا، ماما۔“
سکندر نے نوڈلز کے پیالے سے سر اٹھا کے اطلاع
دی۔

”کھانا ہمیشہ صبحی ہی بناتی ہے۔ آج کیا ہو گیا
ہے اچانک؟“

”عجیب سا کھانا بناتی ہے وہ۔ میرے معدے
میں جلن ہو رہی ہے۔“ وہ کندھے اچکا کے بولا تو
عصرہ آگے آئی۔

”میں تمہیں کچھ اور بتا دیتی ہوں۔“
”ہاں شیور۔“ وہ بس مسکرا دیا۔ تکان کے
باوجود موڈ اچھا لگ رہا تھا۔ جولیاناہ شرمائی شرمائی باپ
کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔ فریج سے پیکٹ نکالتی
عصرہ نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے
لیے چلتا پھرتا نام بم بن چکی تھی۔

”مجھے تم لوگوں سے ایک ضروری بات کہنی
ہے۔“

نوڈلز سوپ پیتے سکندر نے گردن موڑی۔
جولیاناہ جو کیپیٹ سے فیک لگائے کھڑی اپنے لمبے
بالوں سے کھیل رہی تھی چہرہ اٹھا کے دیکھنے لگی۔ عصرہ
البتہ نیم رخ موڑے سلیب پہ قیہ رکھ کے تیز تیز اس

اخبارات.... اور پھر آئے روز اخبارات میں تمہارے اوپر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ بچے اسکول جانے سے ڈرنے لگتے ہیں۔ تم گھر کی شکل دیکھنا بھول جاتے ہو۔ ہم تمہارے لیے ترس جاتے ہیں اور اس ساری بھاگ دوڑ کے آخر میں فاح بن رامزل تم ہار جاؤ گے تو کیا ہوگا؟ ہاں؟“

بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔
”اور اگر ہم جیت گئے تو؟“ وہ اتنا ہی پرسکون کھڑا تھا۔ عصرہ نے تاسف بھری نظر اس پہ ڈالی پھر ڈش پر بے کھسکائی اور پیر پختی وہاں سے نکل گئی۔
فاح نے گہری سانس بھری اور خاموشی سے سنک تک گیا۔ ہاتھ دھوئے اور قیے کی ڈش کو اپنے قریب کیا۔ پیڑہ اٹھایا اور اسے گول شکل دینے لگا۔ اس کے ہاتھ مہارت سے چل رہے تھے۔ ذہن عصرہ کی باتوں میں الجھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خاموشی سے پاستہ کے اوپر میٹ بالز پلیٹ میں سجائے میز پہ رکھ رہا تھا تو ٹوکری میں پڑی سبزیاں دیکھ کے چونکا۔
”پہلے خیال کیوں نہیں آیا۔“ ماتھے کو چھوا پھر چھریوں کے اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ سب سے بڑا چھرا نکالا اور سلاد کی سبزیاں الگ کر کے کٹنگ بورڈ پہ رکھیں۔ اب وہ تیز تیز ہاتھ چلاتے ان کو کاٹ رہا تھا۔ سکندر آہستہ آہستہ سوپ پیتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ڈیڈ..... آپ کو یہ کرنا آتا ہے۔“
”نہیں..... لیکن تمہاری ماں ناراض ہو چکی ہے اور ملازم گھر جا چکے ہیں۔ خود ہی کرنا پڑے گا۔“ اس نے سلاد پلیٹ میں ڈالا اور جھک کے پیچ سے پاستہ کا ذائقہ چکھا۔ مگر چہرے پہ بد مزگی پھیلی۔ ”بس گزارے لائق ہے۔“

اسے ذائقہ پسند نہیں آ رہا تھا۔ پراسیس کیے گئے پیکٹ والے کھانے بے تاثیر بے سواد۔
معلوم نہیں کیوں مگر ذہن میں کوئی ”موازنہ“ سا تھا جس کے سامنے یہ کھانا بے کار لگ رہا تھا۔

اپنے کمرے میں عصرہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی اور ساتھ بیڈ پہ آڑی ترچھی لیٹی جو لیانہ کوئی کلرنگ بک کھولے رنگ بھرتی، کہہ رہی تھی۔

”آج ڈیڈ خود کیوں کھانا بنا رہے ہیں؟ وہ تو پانی مینے بھی کچن میں نہیں آتے تھے اور آج کہہ رہے تھے تجھے پکتے سوپ کی مہک اچھی لگ رہی ہے۔ ماما..... ڈیڈ ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔“ پھر رک کے انگلیوں پہ کچھ گنا۔ ”آپ ان سے ناراض ہیں تو کیا آپ ان کو فوری ایٹ منٹس دیں گی؟“

”مجھے تنگ مت کرو جولی۔“ ناگواری سے کہتے اس نے کروٹ بدل لی۔ ایک آنسو آنکھ سے گرا اور تکیے میں جذب ہو گیا۔
(ساری اداکاری تھی فیملی مین بننے کی تاکہ وہ لوگ یقین کر لیں کہ اس کو ان کی پرواہ ہے۔ ہونہہ۔)
عصرہ کے اندازے لامحدود تھے۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں اکثر کلاسز ختم ہو چکی تھیں اس لیے طلبا طالبات کا جم غفیر گیٹ سے باہر نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ پارکنگ میں حسب معمول بے حد رش تھا اور سب اپنے اپنے بیگز اٹھائے اپنی مطلوبہ سواری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسکارف، اسکرٹ، باجو کرنگ، مغربی لباس غرض ہر طرح کا لباس پہنے لڑکیاں باہر آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں ایک پھول دار اسکارف والی لڑکی بیگ کندھے پہ ڈالے، موبائل کے بٹن دباتی سڑک کر اس کرنے لگی تو عقب سے آواز آئی۔
”فاطمہ!“

وہ چونک کے گھومی۔ پھر اس نے نوجوان کو وہاں کھڑے دیکھ کر تعجب سے ابرو اکٹھے کیے۔
”ایڈم..... تم؟ ادھر؟“ وہ حیران رہ گئی تھی دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے دیکھا۔ واقعی ایڈم ہی تھا۔ چھوٹے بالوں اور نکھری رنگت والا ایڈم۔ سیاہ پینٹ پہ سفیدی شرٹ پہنے سنجیدہ لگ رہا تھا۔
”فاطمہ! ہم بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں؟“
”ہاں... ادھر آ جاؤ۔“ فاطمہ سنجیدگی سے کہتی

آگے بڑھ گئی۔

دونوں فٹ پاتھ پہ چلتے بس اسٹینڈ تک آئے
جہاں چھپر تلے بیچ رکھا تھا۔ فاطمہ قدرے تکلف سے
ادھر بیٹھی درمیان میں کتابیں اور بیگ رکھا اور ہاتھ
سے اسے کتابوں کے اس طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ
سر جھکائے متانت سے بیٹھ گیا۔

”تم خیریت سے آئے ہو؟“ پھر جیسے یاد آیا۔
”تمہارا تحفہ مل گیا تھا مجھے۔ شکر یہ اس کے لیے۔“

ایڈم بن محمد نے گہری سانس لی۔ چار ماہ پہلے
بیچا گیا تھا اسے یاد بھی نہ تھا۔ بلکہ.... ایک ہفتہ قبل
بیچا گیا تھا (دل ہی دل میں اپنی سچ کی) جس کے
لپے اس نے عصرہ اور تالیہ دونوں سے مشورہ مانگا تھا۔
تب اس کے مسئلے محدود تھے۔ اور اب تو زمانہ ہی بدل
چکا تھا۔ وہ وقت اور وہ احساسات دونوں ہی گم گشتہ
سے لگتے تھے۔ پرانے اور فراموش کردہ۔

”فاطمہ..... میں ہماری شادی کے بارے میں
بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”سنو ایڈم!“ وہ بات کاٹ کے بولی تو ایڈم
نے دیکھا۔ پھول دار اسکارف کے ہالے میں مقید
چہرے پر یہ خفگی تھی۔ وہ خوش شکل اور صاف رنگت والی
براعت دگر سنجیدہ سی لڑکی تھی اور اس وقت وہ تکلف سے
بیٹھی نظر آتی تھی۔

”میں کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی
ہوں۔ تمہارا اور میرا رشتہ ارنج طریقے سے ہوا تھا تب
تم فوج میں تھے۔ میں کتنے عرصے سے تمہارے نام
پر بیٹھی ہوں۔ تم نے فوج چھوڑ دی، پھر تمہیں کوئی
نوکری نہیں ملی۔ وان فاتح کی نوکری بھی تم سے مستقل
نہ ہو سکی۔“

”وہ تو صرف چند دن کی تھی۔“ مگر وہ نہیں سن
رہی تھی۔

”اب تم بتاؤ میرے والدین کیسے تمہارے
ساتھ میری شادی کر دیں؟ ایڈم جب تک ان کو کوئی
نافضل سیکورٹی نہیں ملے گی، وہ شادی نہیں کریں
گے۔ اب خالہ بتا رہی تھیں کہ تم ایک دم سے لکھنے

لکھانے کی طرف چلے گئے ہو۔ ایڈم یہ کیا ہے؟“

ایڈم کے رخسار گلابی ہوئے۔ (یہ ایسے بھی نا!)
”وہ الگ بات ہے فاطمہ۔ میں صرف یہ کہنے
آیا ہوں کہ انکل اگر مجھے تھوڑا وقت دے دیں، بس
چند ماہ تو میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ بس وہ یہ دو ہفتے کے
اندر اندرا سٹیلش ہونے کی شرط چھوڑ دیں۔ تم خود
بتاؤ فاطمہ دو ہفتے کے اندر میں کیسے امیر ہو سکتا ہوں۔“
وہ رو ہانسا ہوا۔

”تو چند ماہ میں کیسے ہو گے؟“

ایڈم چپ ہوا۔ تھوک نکلا۔ ”مجھے امید ہے کسی
طرف سے۔ بس یہ سمجھو بہت جلد میرے پاس پیسہ آ
جائے گا۔“ (خزانہ نکالنے کے بعد بیچنے میں بھی وقت
لگنا تھا۔)

”بغیر محنت کے؟ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے؟“ وہ
طنز سے بولی۔ ”اس طرح اچانک سے کیا تمہارے
باغیچے سے تیل کا کنواں نکلے گا یا صحن میں خزانہ دفن ہوا
ملے گا؟“

بس زور سے ہارن بجاتی گزری اور ایڈم بھی
اندر تک ہل گیا۔ نظریں چرائیں۔

”بالفرض میرے گھر کی زمین سے خزانہ نکل
آئے تو کیا تب تم مجھ سے شادی کر لو گی؟“

”نکل بھی آیا تو کون سا تمہارا ہو گا؟“ وہ سر
جھٹک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ایڈم تم کوئی اچھی نوکری
ڈھونڈو اور اگر ایسا نہ ہوا تو یقین رکھو باپا یہ رشتہ ختم کر
دیں گے۔ میں پہلے ہی ماما باپا کی پریشانی دیکھ کے
ڈسٹرب ہوں۔“

”فاطمہ فاطمہ.....“ وہ ملتتی انداز میں کھڑا ہوا۔
”پلیز تم میرا یقین رکھو۔ میں محنت کروں گا اور کوشش
بھی اور.....“ یک دم وہ ٹھہرا اور ٹکڑا سے دیکھنے لگا۔
اطراف سے گاڑیاں ہارن بجاتی زن سے گزر رہی
تھیں مگر ایڈم بن محمد بالکل گم صم ہو گیا تھا۔

”کیا کہا تم نے؟“

”بাপا یہ رشتہ ختم کر دیں گے ایڈم۔“
”نہیں اس سے پہلے.... تم نے کہا خزانہ نکل بھی

”تالیہ!“ داتن نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔
پھر اسے فکر ہوئی ”تمہیں کیا ہوا ہے؟ اور یہ سب کہاں
گیا ہے؟“

”اگر اب میں سوچوں تو وہ خوف تھا۔ بچپن
میں.....“ وہ اس کو دیکھتی اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔
شاید داتن کے چہرے کی لکیروں میں اپنی زندگی کی فلم
چلتی دیکھ رہی تھی۔ ”اور وہ لالچ بھی تھا اور جبر
بھی۔ کون سا جذبہ پہلے آیا، مجھے نہیں یاد۔ لیکن جب
یتیم خانے اور بعد میں میرے فوسٹر پیئرٹس کے گھر
مجھے جبر سے دبایا جاتا، خواہشات کو پورا کرنے سے
روکا جاتا تو میں چوری کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ پھر وہ
عادت بن گئی۔ چرائینا اور پوچھے جانے پہ جھوٹ بول
دینا۔ لیکن اب اگر سوچوں تو حاوی ترین جذبہ خوف
ہوتا تھا۔“

”تالیہ..... تم ٹھیک ہو؟“ داتن اس سے لمحے
بھر کے لیے بھی نظریں ہٹائے بغیر کرسی کی چھتی قریب
آئی اور بیٹھی۔

”میں ہمیشہ خوف زدہ رہی ہوں۔ یہ ڈر
میری بات سنی نہیں جائے گی یا مجھے ڈانٹ کے خاموش
کر دیا جائے گا، مجھ سے جھوٹ بلواتا رہا اور جب ڈر
ختم ہو گیا تو یہ ان سیکورٹی پیدا ہو گئی کہ اگر میں من
گھڑت باتیں نہیں کہوں گی تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔
لوگ مجھے میرے سچ کے ساتھ قبول نہیں کریں گے۔
میں ہمیشہ خوف کے زیر اثر رہی ہوں داتن۔ میں کبھی
بہادری سے اپنے اصل کا سامنا نہیں کر سکی۔“ ابھی
بکھری سنہری لٹین اس کے گالوں پہ جھول رہی تھیں
اور وہ دیوار کو دیکھتی بے خودی بولے جا رہی تھی۔

”لیکن پھر میں ایسے انسان سے ملی جس نے
مجھے سکھایا کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اس کی
سچائی اور امانت داری ہوتی ہے۔ جو لوگ سچے ہوتے
ہیں وہ اپنی نظروں میں با عزت ہوتے ہیں۔ اپنے
قول کے پکے ہوتے ہیں۔ ان کے سارے خوف دور
ہو جاتے ہیں۔ وہ سر اٹھا کے جی سکتے ہیں۔ صرف
وہی ہوتے ہیں بہادر اور میں نے سوچا کہ میں بھی

آیا تو میرا نہیں ہوگا۔ کیوں؟“ وہ جیسے کسی خواب سے
جاگا تھا۔ پانچ سو ستاون سال قدیم خواب سے۔
”کیوں نہیں ہوگا وہ میرا؟“

”وہ تو میں روانی میں کہہ گئی۔ یہ کتابیں پڑھ
پڑھ کے دماغ خشک ہو جاتا ہے۔“ اس نے سر جھٹکا
اور بیچ سے اپنی قانون کی موٹی سیاہ کتابیں اٹھائیں۔
ایڈم یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ فاطمہ نے چیزیں
سمیٹ کے اس کو دیکھا تو وہ اسی طرح حیران اور کم صدم
ساکھڑا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

”Treasure trove Act 1995“
تمہیں نہیں معلوم ایڈم؟“

اور ایڈم بن محمد کے سارے خواب کسی ایسے
ہیرے کی طرح چمکنا چور ہوئے جس کو آسمان سے
زمین پہ پھینکا جائے اور اس کی چمکتی کرچیاں دور دور
تک پھیل جائیں۔

☆☆☆

حالم کے بنگلے پہ اندھیرا پھیلا تھا۔ پورچ کی بتی
آج پھر بجھی تھی۔ داتن اندر آئی تو پہلے پورچ روشن کیا
پھر لاؤنج کی بتیاں جلائیں۔ تالیہ وہاں نہیں تھی۔ تہہ
خانے کی طرف جاتا دروازہ کھلا تھا اور وہاں سے روشنی
آ رہی تھی۔ داتن نے گروسری کے تھیلے وہیں رکھے اور
برہمی سے ماتھے پہ ہل ڈالے زینوں کی طرف آئی۔
”تم نے لائبریری کی حد کر دی۔ دروازہ کھول
کے بیٹھی ہو۔ اتنا قیمتی سامان رکھا ہے یہاں اور.....“
داتن زینے دھپ دھپ اترتی نیچے آئی اور اس پہ
چڑھ دوڑی جو فرش پہ اکڑوں بیٹھی تھی اور اگلے ہی لمحے
وہ نکلی۔

بے یقینی سے گردن چاروں طرف موڑی۔
وہاں بنے سیف کے مختلف دروازے کھلے تھے
اور وہ اندر سے خالی تھے۔ پینٹنگز کے کارٹن بھی غائب
تھے اور خالی ڈبے اور کھڑکی کے ٹکڑے ادھر ادھر
بکھرے تھے۔ داتن پدوکا نے دہل کے سینے پہ ہاتھ
رکھا۔

”وہ خوف تھا۔“

ایسی بننا چاہتی ہوں۔“

”تالیہ؟“ داتن اسے تشویش سے دیکھ رہی

”میں نے جاب ڈھونڈ لی ہے۔ اور میرے

پاس بہت سا زیور بھی ہے۔ جو واقعی میرا ہے۔ اور مجھے ایک اور جگہ سے بھی امید ہے۔“ اس کے ذہن میں سن باؤ کا صحن گھوما۔ ”ہاں مجھے ابھی بھی بہت سارا پیسہ حاصل کرنے کا شوق ہے لیکن اب میں صرف اس پیسے کو قبول کروں گی جو واقعی میرا ہوگا۔“

پھر نم آنکھوں سے مسکرائی تو داتن نے دیکھا، اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

”رہیں تم تو میں تمہیں یہ کام چھوڑنے پہ مجبور نہیں کروں گی۔ تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔ میں اور تم ہمیشہ دوست رہیں گے۔“

داتن نے ملال سے اس خالی خالی سے کمرے کو دیکھا۔ ”ایسا کیا ہوا ہے چار دن میں جو تم اتنی بدل گئی ہو تالیہ؟“

”مجھے وان فاتح سے محبت ہو گئی ہے داتن، زخمی سا وہ مسکرائی اور کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ داتن سانس روک کے اسے دیکھے گئی۔ پھر کہنے کی کوشش کی۔

”اسی فیصد لوگوں کو ہر چھ ماہ بعد نیا کرشن ہو جاتا ہے اور وہ چار ماہ میں اتر بھی جاتا ہے مگر.....“

”تم تمہیں سمجھو گی، داتن!“ وہ مسکراتے ہوئے بولی پھر ایڑیوں پہ گول گول گھوم گئی۔ خالی کمر بہت کھلا کھلا سا لگ رہا تھا۔

”میں نے یہ سب واپس کر دیا ہے، پھر بھی میرا دل ہلکا کیوں نہیں ہوا؟“ اس نے سوچا تھا۔ بھی

موبائل بجا تو تالیہ نے اسے نکال کے دیکھا۔

”کیا ہم مل سکتے ہیں؟“ ایڈم کا پیغام وہاں جگمگا رہا تھا۔

☆☆☆

ایڈم ریستوران کی آخری میز پہ بیٹھا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تالیہ جیسے ہی دروازے سے اندر داخل ہوتی دکھائی دی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ہشاش بشاش اور تازہ دم لگتی تھی۔ سادہ باجو کرنگ پہنے، بالوں میں ہیئر بینڈ لگائے، سر پہ ترچھی

”مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔“ تالیہ اداسی سے

مسکرائی۔ ”پہلے اپنے سارے جھوٹوں کی سزا ملنا تھی۔ پہلے کفارے ادا ہونے تھے۔ میرے ساتھ زندگی نے ہی جھوٹ بول دیا، داتن!“ اس کی گم صم آنکھیں پانی سے چمکیں۔ ”مجھے کچھ اور دکھا کے کچھ اور عطا کر دیا۔ مجھے اتنا ناقابل اعتبار بنا دیا کہ اگر میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولنا چاہوں تو بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔“

”تالیہ..... کیا ہوا ہے؟“

”مگر اب نہیں، داتن!“ اس نے آنکھیں پوروں سے رگڑیں۔ ”اب میں اس خوف کے ساتھ نہیں جیوں گی۔ اب میں بھی ایڈم کی طرح سچ بولنا چاہتی ہوں اور وان فاتح کی طرح اپنے قول کو سچا بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے بہت سے قانون توڑے ہیں اب مزید نہیں توڑوں گی۔ یہ سب.....“ اطراف میں نظر دوڑائی۔ ”یہ سب میرا نہیں تھا۔ یہ سب دوسرے لوگوں اور میوزیمز کا تھا۔ میں نے ایک ایک چیز واپس کر دی ہے۔ جیسے چرانا آتا ہے ویسے ہی کم نام طریقے سے لوٹانا بھی آتا ہے۔“

داتن نے دہل کے پھر سے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

”تالیہ..... نہ کرو..... وہ سب.....“

”اور جو کچھ میں خرچ کر چکی ہوں۔“ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اس کا میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں امید کرتی ہوں کہ میری ایمان داری کے باعث اللہ تعالیٰ اور پھر وہ لوگ جن سے میں نے وہ چیزیں چرائی تھیں، مجھے معاف کر دیں گے۔“

”اب کیا ہوگا تالیہ؟ تم کہاں سے کھاؤ گی؟ کیا کھاؤ گی؟“ داتن نے دہل کے سینے پہ ہاتھ رکھا ہوا

تالیہ نے گہری سانس لی اور بال کان کے پیچھے

پھرتے لوگوں کے ہجوم میں بھی اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

Treasure trove act کے تحت

ملائیشیا کی زمین سے کوئی بھی چھپا ہوا خزانہ ڈھونڈنے یہ شہری کا فرض ہے کہ وہ اسے حکومت کے حوالے کر دے کیونکہ زمین میں چھپے خزانے سرکار کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس کی اطلاع حکومت کو نہیں دیں گے تو ہم مجرم ہوں گے اور پولیس ہمیں گرفتار کر سکتی ہے۔ خزانہ چھپانے پہ بھاری جرمانہ اور قید کی سزا ہے۔
 ”وہ خزانہ.....“ وہ ایک دم غرائی پھر آواز مدھم کی۔ ”وہ خزانہ ہمارا ہے۔ جائز اور حلال۔ وہ حکومت کا نہیں ہے۔“

”وہ صرف اسی صورت میں ہمارا ہو سکتا تھا اگر اس پہ 50 سال سے کم عرصہ گزرا ہو یا اس کو ہمارے آباؤ اجداد نے دفنایا ہو اور ہم اس پہ کلیم کر سکیں۔ مگر ہم کلیم ثابت نہیں کر سکتے۔ قانوناً وہ ہمارا نہیں ہے۔“

”میری بات کان کھول کے سنو ایڈم!“ وہ میز پہ زور سے ہاتھ مار کے بولی۔ ”میں نے سارا لوٹا مال واپس کر دیا کیونکہ وہ میرا نہیں تھا۔ میں نے پھر سے زندگی شروع کی۔ جاب ڈھونڈی۔ ایک نیلامی پہ ان سے جھوٹ بولا تھا تو وہ ناراض ہو گئے تھے۔ اس نیلامی پہ ان سے سچ بولا۔ اب میں زمین کو سوپنی اپنی امانت واپس لینے آئی ہوں تو تم کہہ رہے ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں؟ غلط۔ میں نہیں مانتی ایسے قانون کو۔ مجھے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ خزانہ ہمارا ہے اور جائز ہے تو ہم کس طرح اس کو چھوڑ دیں؟“

”مجھے بھی اس کی اتنی ضرورت ہے جتنی آپ کو لیکن میں قانون نہیں توڑوں گا۔ البتہ میں آپ کو منع بھی نہیں کروں گا نہ میں کسی کو بتاؤں گا۔ آپ خزانہ نکال لیں..... بیچ دیں..... جو بھی کریں، آپ یہ سب اپنے لیے کریں گی۔ مگر ایک فیصلہ آپ کو ابھی سے کرنا ہے۔ کیا آپ واقعی ایمان دار بننے جا رہی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ کو ملک کے قانون کا احترام کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ یہ نہیں کرتیں تو کیا آپ خود اپنے وعدوں

ہیٹ جمائے، مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آئی اور کرسی سنبھالی۔ پھر کہنیاں میز پر رکھیں اور پھر چمکتی آنکھوں میں شرارت بھر کے اسے دیکھا۔

”میں نے سارا“ ادھار شدہ“ مال اصل مالکوں کو واپس کر دیا ہے۔“ فاتحانہ انداز میں بولی تو ایڈم پھیکا سا مسکرایا۔
 ”گڈ۔“

”صرف گڈ؟ ارے اس پہ تو تمہیں اپنی شہزادی کی شان میں ایک قصیدہ لکھنا چاہیے تھا۔“
 ”جے تالیہ.....“ وہ دھیمسا بولا۔ چہرہ بجھا بجھا سا لگتا تھا اور اس نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”سن باؤ کا خزانہ۔“

”ہاں وہی بتانے لگی تھی۔“ وہ جوش سے آگے کو جھکی۔ ”فاتح صاحب نے گھر میرے حوالے کر دیا ہے۔ کل صبح ہم ملا کہ جائیں گے۔ میں نے کھدائی کا سامان خرید لیا ہے۔ ہمیں احتیاط سے کھدائی کرنی ہے تاکہ خزانہ نکال کے ہم کوئی نشان چھوڑے بغیر صحن کو برابر کر دیں اور.....“

”جے تالیہ وہ خزانہ ہمارا نہیں ہے۔“
 ایک دم سے جیسے سارے شہر میں سناٹا چھا گیا۔ تالیہ مگر کمر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
 ”کیا؟“ اسے واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
 ”وہ خزانہ ہم نہیں لے سکتے۔“

تالیہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ لوگ اپنی اپنی میزوں پہ کھانے پینے میں مگن تھے، کوئی اس طرف متوجہ نہ تھا۔

”کیوں؟ وہ ہمارا ہے۔ ہم نے دبایا ہے۔“
 ”مگر چھ صدیوں تک اس کی حفاظت ہم نے نہیں“ زمین“ نے کی ہے۔ اسے امانت کی طرح اپنے اندر ہم نے نہیں“ زمین“ نے چھپایا ہے۔“
 ”تو؟“

”تو یہ کہ“ زمین“ سرکار کی ہوتی ہے۔“
 وہ بالکل سن رہ گئی۔ ساکت، مجسم۔ ارد گرد

یہ یقین کر پائیں گی۔“

”وہ خزانہ میرا ہے۔“ وہ دونوں ہتھیلیاں میز پر جمائے اٹھی اور اس کی طرف جھٹک کے غرائی۔
”تم... تمہارے اصول... تمہارے قانون... تم سب جہنم میں جاؤ۔ مجھ سے میری زندگی لے لی گئی۔ مجھ سے فاح کو لے لیا گیا۔ میرا باپ وقت کی چابی نے مجھ سے دور کر دیا۔ میرا آخری رشتہ تھا وہ اور وہ بھی مجھ سے چھن گیا (غصے سے منہ سے نکلا)۔ میں پہلے ہی اپنی بیشتر دولت دے چکی ہوں۔ اور اب میں اپنا جائز خزانہ بھی دے دوں؟ ہرگز نہیں۔“ اس کا رنگ شدت جذبات سے سرخ پڑ چکا تھا۔

”میں نے کہا نا... آپ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔ فتویٰ بہت سی چیزوں کی اجازت دے دیتا ہے۔ لیکن جس دین کو میں مانتا ہوں اس میں تقویٰ انسان کو بہت سے غیر ضروری بوجھ سے بچا بھی لیتا ہے۔ میں اپنے ضمیر پہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔“ وہ سادگی مگر اداسی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیجی سی تھیں۔ تالیہ نے ایک غصیلی نظر اس پہ ڈالی پرس دبوچ کے اٹھایا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

ایڈم نے اسے دکھی دل کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ملال اور درد بہت تھا مگر ایک بات طے تھی کہ آدم بن محمد کا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔
ہر بوجھ سے آزاد۔

☆☆☆

اتوار کی صبح اشعر محمود کے قلعہ نما گھر کے لان میں ہرن دھوپ سینکتے دکھائی دے رہے تھے۔ صبح خوب بارش ہوئی تھی۔ سارا لان نہادھو کے نکھر گیا تھا۔ اب اچانک — دھوپ نکل آئی تو ہرن گھاس پہ لیٹ گئے تھے۔

لان کے وسط میں لٹری کی سیڑھیاں بنی تھیں جو اوپر ایک کیوبی تک جاتی تھیں۔ مخروطی چھت والی کیوبی کے اندر لٹری کے بیج آئے سانسے رکھے تھے۔ اشعر ایک بیج پہ براجمان پیر قینچی صورت میز پہ

رکھے ہوئے تھا۔ جھیر کے اور برقی شرٹ پہنے، بالوں کو عام دنوں کے برعکس ماتھے پہ بکھیرے وہ اخبار سامنے پھیلانے ہوئے تھا۔

”ایش“ اس نے زینے چڑھنے کی آواز سن لی، پھر بھی اخبار پڑھتا رہا۔ جب عصرہ سامنے آکھڑی ہوئی تو اشعر نے اخبار کا کونا موڑا اور سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اتنی صبح؟ خیریت؟“ انداز سرد تھا۔

”مجھے بات کرنی تھی۔“ عصرہ شدید پریشان نظر آتی تھی۔ اسکرٹ کے اوپر کندھوں کے گرد سادہ شال لپیٹے وہ میک اپ سے عاری چہرہ لیے ہال باندھے پوں دکھائی دے رہی تھی گویا ابھی نیند سے اٹھ کے آئی ہو۔

”فاح نے کاغذات جمع کر دادے۔ میں جانتی ہوں اس بات پہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن اس روز گھائل غزال والی مدد کے بدلے میں اس نے کہا تھا کہ.....“

”آپ نے عظیم طاعون کے بارے میں سن رکھا ہے؟“ خچی سے اخبار لپیٹتے ہوئے اس نے عصرہ کو دیکھا۔

”اب تم فاح کی طرح باتیں مت کرو۔“ وہ خفگی سے کہتی سامنے بیٹھی مگر اشعر نے بات نہیں سنی۔ اخبار میز پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”اور آپ نے وہ نظم سنی ہے Ring-a-Ring-a-roses؟ بعض کہتے

ہیں کہ وہ نظم یورپ کے عظیم طاعون کے بارے میں تھی جب لاکھوں لوگ طاعون سے مر گئے تھے۔ ان کو سرخ دانے نکلتے تھے۔ جو سرخ دائروں کی صورت نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ہاں... طاعون کے مریض جیب میں poises (پھول) اٹھا کے پھرتے تھے تاکہ خوشبو بیماری کی بو کو ڈھانک دے اور شفا دے۔ ان کے جسم سیاہ پڑ جاتے اور طاعون کے مریضوں کے مرنے کے بعد ان کی لاشیں اور ان کے گھر جلا دیے جاتے۔ یعنی آخر میں.....“ وہ آگے ہوا

اور پھر چھٹی نظروں سے عصرہ کو دیکھا۔ ”آخر میں وہ سب مرجاتے تھے۔“

پھر اس نے آہستہ سے نظم پڑھی۔

Ring around the rosies

(سرخ پھول جیسے دانے کے گرد دائرہ)

A pocket full of posies

(پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ جیب میں ہے)

Ashes Ashes

(راکھ.....راکھ)

We all fall down

(اور ہم سب ڈھاتے چلے گئے)

اس نے آخری الفاظ اتنے سرد انداز میں ادا

کے عصرہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

”اشعر پلیمز میری بات سنو۔“

”وان فاح کیا سمجھتے ہیں؟ اگر وہ چیئر مین

شپ کے لیے کاغذات جمع کرا میں گے یہ جانتے

ہوئے بھی کہ میں کہہ چکا ہوں یہ سیٹ میری ہے تو وہ

کامیاب ہو جائیں گے؟ نہیں کا کا۔ ہم سب راکھ کا

ڈھیر بن کے ایک ساتھ ڈھے جائیں گے۔“

”میں نے بہت کوشش کی ہے اشعر لیکن وہ نہیں

مانتا۔ اس نے آخر میں اپنی مرضی ہی کرنی ہوتی

ہے۔“

”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چیئر مین

میں بنوں گا۔ آپ نے کہا تھا کہ آجنگ سیاست سے

کنارہ کش ہو کے مجھے endorse کریں گے

لیکن کل میں نے سنا کہ وہ الیکشن لڑ رہے ہیں۔ واہ

کا کا۔ واہ۔“ ناگواری بھرے غصے سے کہتا وہ گردن

موڑے گھاس کو دیکھنے لگا۔ وہ سخت ناراض لگتا تھا۔

”اگر وہ گھاس غزال والا معاملہ نہ ہوتا تو.....“

عصرہ بے بسی سے بولی، پھر سر جھٹکا۔ ”مگر نہیں۔ وہ

تب بھی میری نہ مانتا۔ اسے اپنی ہی کرنی ہوتی ہے اور

اب تو وہ عجیب سا ہو گیا ہے۔ بے نیاز سا۔ جب سے وہ

طاگ سے واپس آیا ہے بدلا بدلا لگتا ہے۔“

اشعر نے چمک کے اسے دیکھا پھر تعجب سے

ابرو اٹھایا۔ ”کیا بدلا ہوا لگتا ہے؟ مجھے تو ویسے ہی لگے ہیں۔ سوائے آنکھ کے زخم کے۔“

”تم اس کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہے۔

تمہیں نہیں معلوم کہ اسے سمجھنا کتنا مشکل ہے۔ وہ

پھٹ پڑتی۔ پھر پٹنی پہ ہاتھ رکھا۔ ”اشعر..... میں

مزید کوشش نہیں کر سکتی۔ میں تھک گئی ہوں۔ تم لوگوں

کے مسئلے ختم نہیں ہوئے تھے کہ نیلامی والا مسئلہ آ گیا۔

میرے ساتھ ایسا کون کر سکتا ہے؟ تم نے پتا کروایا؟“

”کروادوں گا۔ میرے اپنے کام پھنسے پڑے

ہیں ابھی۔“ اس نے بے زاری سے چہرہ دوبارہ موڑ

لیا۔ عصرہ نے چھٹی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”فاح نے کاغذات نامزدگی کیا جمع کروائے

تم نے تو نظریں ہی پھیر لیں ایش۔ تم بھول گئے ہو

میں نے تمہارے لیے اس کی فائل تک چرائی۔ اب

اور کیا کروں میں؟“

”کا کا میرے سر میں درد ہے، میں آرام کرنا چاہتا

ہوں۔“ وہ رکھائی سے کہہ کے اٹھا میز پہ رکھا موبائل

اٹھایا لور لکڑی کے زینے اترنے لگا۔ ہر قدم کے ساتھ

لکڑی کے چٹخنے کی آواز آتی تھی۔ عصرہ بے بسی بھرے

غصے سے کھڑی ہوئی۔

”میں کیا کروں مزید ایش؟ میں تھک گئی

ہوں۔“

اشعر جواب دیے بتا لان پہ اُترا اور آگے چلتا

گیا۔ اس کے ابرو تٹتے ہوئے تھے اور چہرے پہ برہمی

تھی۔ اس نے نیلامی کے اسکیئنڈل کی تیاری کب سے

کر رکھی تھی۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اگر اسکیئنڈل نہ بن

سکا تو وہ عصرہ سے کیسا رویہ رکھے گا؟ اس بارے میں

اس کے ذہن میں کوئی اسکرپٹ تیار نہ تھا۔ فی الوقت

وہ عصرہ اور فاح کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

حالم کے بنگلے کو بھی بارش نے دھو ڈالا تھا۔

کھڑکیوں پہ قطرے جم گئے تھے مگر دھوپ نکلی تو وہ

سوکتے گئے۔ تالیہ اپنے کمرے کی کھڑکی کی ساتھ

زمین پہ بیٹھی تھی۔ شیشے سے چہرہ نکا رکھا تھا اور نظریں

باہر جی تھیں۔ رات والے سلیپنگ سوٹ میں ملبوس وہ
دیران دیران سی لگ رہی تھی۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور داتن سنجیدہ چہرہ بنائے اندر
داخل ہوئی۔ ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی جو اس نے
تالیہ کے قدموں کے پاس رکھی اور پھر اپنا بھاری بھر کم
سراپا سنبھالتی بیڈ کے کنارے جا بیٹھی۔ اب وہ تالیہ
سے دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔

”اگر اپنے سارے مال و دولت کو گنوانا تمہیں
انتا تکلیف دے رہا ہے تو تم نے ایسا کیا کیوں؟“ اس
نے تھکی تھکی سی تالیہ کا پر مژدہ چہرہ دیکھا جو گال شیشے
سے لکائے باہر جھانک رہی تھی۔

”میں دو دنیاؤں کے درمیان پھنس گئی ہوں
داتن۔“ اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

”تالیہ ہم اچھے دوست رہے ہیں مگر اب تم
راستہ بدلنا چاہتی ہو۔ تمہیں نئے نیک دوست مل گئے
ہیں اور اب تمہیں پرانے دوست گناہ گار اور بھٹکے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ پرانے
دوست برے سہی اور نئے بہت اچھے سہی مگر اس کا یہ
مطلب نہیں کہ تم پرانے دوست سے اب دل کی بات
نہیں کہہ سکتیں۔“

تالیہ نے نظریں موڑیں تو اس کی آنکھیں بھیگی
ہوئی تھیں۔ ”پرانے دوستوں جیسی میں رہنا نہیں چاہتی
مگر نئے دوست اخلاق اور کردار میں اتنے اعلیٰ ہیں
کہ ان تک میں نہیں پہنچ سکتی۔ میں کیا کروں داتن؟“

”تم میرے جیسی کبھی نہیں تھیں۔ میں تنگو کامل
کی بیوی کے سارے زیور چرانا چاہتی تھی مگر تم نے کہا
کہ اس کا تاج (تیارا) چھوڑ دوں وہ اس کی ماں کی
نشانی ہے۔ تم دھوکہ دہی اور جھوٹ کی اس دنیا میں بھی
دل دکھانے سے ڈرتی تھیں۔ تم تلخ اور زہر خند نہیں
تھیں۔ ہنس کھا اور خوش اخلاق تھیں۔“

”مگر میں ان جیسی بننا چاہتی ہوں۔“ اس کی
لگاؤ بھری نگاہ تھی جو اوچی پہاڑی پہ بنا تھا اور اس تک
ہانٹے کے لیے کوئی سڑک نہ تھی۔

”تم کردار اور اخلاق کے اعلیٰ ترین معیار پہ پہنچ
سے۔“

کے بھی ان جیسی نہیں بن سکتیں۔ جانتی ہو کیوں؟
کیونکہ کوئی کسی کی طرح نہیں بن سکتا۔ ہر انسان مختلف
ہوتا ہے اور کیونکہ انہوں نے تمہاری طرح دو زندگیوں
کے ذائقے نہیں چکھے۔ وہ سچے ہیں اس لیے انہیں
جھوٹوں سے لڑنا نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ سیدھے راستے پہ
رہے ہیں اس لیے انہیں ٹیڑھے راستے اتنی آسانی
سے دکھائی نہیں دیتے۔ تمہیں دکھائی دیں گے۔ ہمیشہ
دکھائی دیتے رہیں گے۔ تم سچی بننا چاہتی ہو شوق سے
بنو، لیکن تم ان سے ہمیشہ مختلف رہو گی۔“

تالیہ نے دھیرے سے سر اثبات میں سر ہلایا۔
”اور یہ میرا اصل ہے جس کے ساتھ مجھے رہنا ہے؟“

”ہاں۔ تم نے اتنے ٹیڑھے پن اختیار کیے
ہیں کہ اب تم انسانوں کے وہ سارے ٹیڑھے دیکھ سکتی ہو
جو تمہارے نئے دوست نہیں دیکھ سکتے۔ تم سچ جھوٹ
کی پہچان ان سے بہتر کر سکتی ہو کیونکہ تم اس سب سے
گزر چکی ہو۔“

تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ پھر سے گردن موڑ
کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

داتن چلی گئی اور کمرے میں کافی دیر خاموشی
پھیلی رہی تو اس نے فرش پہ رکھا سیاہ موبائل اٹھایا اور
ایک نمبر ملا یا۔ پھر اسپیکر آن کر کے موبائل ہاتھ میں پکڑ
لیا اور گال گھٹنوں پہ رکھ دیا۔

”کیسے ہو، عالم؟“ چند گھنٹیوں کے بعد وان
فاتح کی آواز سنائی دی۔ اس کا سانس اٹھل پٹھل لگتا
تھا جیسے وہ بھاگتا ہوا آ رہا ہو۔ یقیناً وہ صبح کی جاگنگ
کر رہا تھا۔

”فاتح صاحب..... آپ کے کام ابھی تک
نہیں ہو سکے مگر.....“

”میں نے پوچھا..... کیسے ہو تم؟“ وہ نرمی سے
پوچھ رہا تھا۔ تالیہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ سن باؤ کا
غلام مجسمہ بناتی شہزادی سے ایسے ہی نرمی سے مخاطب
ہوا کرتا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ ایک مسئلہ پوچھنا تھا آپ

سے۔“

”میرا خیال تھا تم اکثر مسئلے خود حل کر لیتے ہو۔ خیر پوچھو۔“ وہ تیز تنفس کے درمیان بولا۔ رفتار آہستہ کر دی تھی۔

”آپ legislator ہیں۔ قانون بناتے ہیں۔ خود بھی وکیل رہے ہیں۔ مجھے بتائیں یہ treasure trove کیا ہے؟“

”خزانہ ڈھونڈنے والوں کے فرائض، رائٹ؟ اس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کو ملائیشیا میں کوئی مدفن خزانہ ملے تو آپ کو فوراً اس شہر کے ڈسٹرکٹ آفیسر کو اطلاع دینی ہوتی ہے۔“

”اور اگر کوئی اطلاع دینے کے بجائے وہ خزانہ خود رکھنا چاہے تو؟“

”تو یہ جرم ہے۔“

”لیکن اگر خزانہ اس کے اپنے آباؤ اجداد کا ہو یا اس نے خود دبایا ہو..... تو یہ جرم کیسے ہوا؟“

”پچاس سال گزر جانے کے بعد مدفن چیزیں سرکار کی ملکیت بن جاتی ہیں ہاں اگر کوئی یہ ثابت کر سکے کہ اس نے خزانہ خود دبایا تھا یا واقعی اس کے آباؤ اجداد کا ہے تو وہ اسے مل سکتا ہے۔“

”ثابت نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر ہمیں خود معلوم ہو کہ ہم سچے ہیں... کیا تب بھی ہم وہ خزانہ خود نہیں رکھ سکتے؟ اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہو کہ ہم سچے ہیں تب بھی نہیں؟“

”اللہ تعالیٰ کو تو سب معلوم ہوتا ہے مگر وہی ہمیں کہتا ہے کہ ہمیں لا آف دالینڈ کی پاسداری کرنی ہے اور ملک کا قانون ثبوت مانگتا ہے۔“

”فارج صاحب!“ اس نے آنکھیں رگڑیں۔

”اگر انسان ایک راستے سے تائب ہونے کا عہد کر لے مگر پھر ایک موقع آئے۔ ایک temptation سامنے ہو تو کیا ایک آخری مرتبہ اس کو چکھا جاسکتا ہے؟ بس یہ آخری ہو اس کے بعد وہ عہد کرے کہ وہ ہر دغبت سے اجتناب کرے گا۔“

”اور اگر وہ امتحان آخری امتحان ہوا؟ اگر اس کے بعد امتحان ہی نہ ہوتا ہو اور اسی کے اوپر ہمیشہ کے

لیے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہو؟ تب؟“

کھڑکیوں پہ ایک دم سے بوندیں برسنے لگیں۔ بارش پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ تالیہ نے بے اختیار چہرہ ششے سے دور کیا۔

”توبہ کا وقت تو موت تک ہوتا ہے فارج صاحب۔“

”دیکھو حالم... کچھ امتحانات میں سہلی آ جاتی ہے اور کچھ کو فیل کرنے کی صورت میں کالج سے نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ امتحانات انٹری ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ایک نئے طرز زندگی میں داخلے کا امتحان۔ ان کو فیل کیا تو آپ داخل ہی نہیں ہوں گے۔ بعد میں توبہ کر بھی لیں تو کس نے گارنٹی دی ہے کہ توبہ قبول بھی ہوگی؟“

”اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش سامنے ہو تو اسے کیسے چھوڑا جائے فارج صاحب؟ اتنا بڑا دل کوئی کہاں سے لائے؟“

”دیکھو حالم! جب اللہ تعالیٰ ہمیں امتحان میں ڈال کے محبوب چیز اور درست چیز کے چناؤ کا موقع دیتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہمارے اندر اچھائی کی رمتن باقی ہے۔ ابھی سیدھا راستہ ہمارے قدموں سے مایوس نہیں ہوا۔ سیدھے راستے کی خود سے لگی یہ امید نہیں توڑنی چاہیے۔ ایک طرف سے رزق نہیں آئے گا تو کسی دوسری طرف سے آجائے گا۔ اتنا تو اچھائی کی طاقت پہ بھروسہ رکھو نا!“ وہ اب تیز تیز چلتے ہوئے اسے سمجھا رہا تھا۔ تالیہ سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ اس کے آنسو گرنے لگے۔ وہ ابھی بول ہی رہا تھا جب اس نے کال کاٹ دی اور فون پرے ڈال دیا۔

سارے فیصلے اس برستی بارش نے کروا دیے تھے۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

السلام علیکم قارئین! آپ کی رویا گل عید کا گوشت..... آہم..... میرا مطلب ہے کہ عید کی مصروفیات کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ امید ہے آپ کی عید بھی بہت مزے میں گزری ہو گی۔ ہم نے بھی اس عید پر بڑا ایڈ ونچر کرنے کا سوچا جب میرا دو دنوں بھائی کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئے تو شدید بوریت کے دنوں میں مجھے ایک نیا جوش چڑھا۔ کہ اس بار قربانی کا جانور ہم لڑکیاں ہی خرید کر لائیں گی اور اس جوش کو بڑھایا فیس بک کی شوخی دوستوں نے۔ اپنے جانوروں کی تصویریں شیئر کر کے اور ایک دوست نے تو رنگ برنگے دنبوں والی ڈی پی لگا کر اس جوش پر آخری کیل ہی ٹھونک دی۔ ہم کیا ان سب سے کم

عفت سحر طاہر

دھتکے دھتکے

میں جو لڑکوں کی واپسی کا انتظار کرتی رہتیں۔ یہ از میر بٹ پر اپنی دھاک بٹھانے کا اچھا موقع تھا کہ اس کی واپسی تک قربانی کا ایک بہترین جانور لان میں بندھا ہوتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بکرا منڈی کا دیدار بھی۔

☆☆☆

"دادو جان! اس بار بکرا میری پسند کا ہوگا۔" میں نے دادو سے فرمائش کی تو وہ گویا اچھل ہی پڑیں۔ "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ایک منگنی کروا لی میرے میرو سے، اس کے تو نصیب پھوڑ دیے نوج۔ اب کون سا لڑکا پسند کرو گی۔" دادو نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔

"او فوہ دادو! لڑکا نہیں، بکرا، بکرا۔" میں نے پھپھروں کا پورا زور لگا کر کہا تو دادو کی رنگت واپس



"ایونٹ" کو ایسے ہی تھوڑا جانے دیتیں۔ جبکہ چڑیا، مانو اور ماہین نے ساتھ جانے اور اس ایڈونچر سے لطف اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

بکرا منڈی پہنچ کر ہم تو حیران ہوئے ہی تھے بلکہ مجھے تو لگا شاید بکرے بھی ہمیں دیکھ کر حیران کم پریشان زیادہ ہو گئے ہیں۔ وہاں پر تو یوں لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا ہی بیل بکرے خریدنے پہنچی ہوئی

ہے۔ ہماری ہوائیاں اڑ گئیں۔ بھانت بھانت کے لوگ وہاں جمع تھے۔ مگر عورتوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جو شاید اپنے بچوں کی ضد اور خوشی کی خاطر میاں کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ ہر طرف "انا پسندوں" کی "میں میں میں میں" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ آدھا گھنٹہ گزرا تو گرمی میں ہمیں دادی، نانی سب یاد آ گئیں۔ لائبر مسکارے بہنے لگے۔ پسینہ صاف کر کر کے سب کی اللہ معاف کرے اصلی تشکلیں نکل آئیں۔

"بھئی بڑا حوصلہ ہے بھائی لوگوں کا جو ہر ماہ بکرے خرید کر لے جاتے ہیں"۔ فالقہ سب پہلے پچھتیانی۔

"قسم، مجھ سے تو اپنی اور بکرے کی بو میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے۔" زرینہ روہانسی ہوئی۔

"اوپر سے بیوپاری ایسے خرانٹ لگ رہے ہیں" میں نے بھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو فالقہ لرزی۔

"یہ لاسٹ ایڈونچر ہے میرا۔ تم لوگوں کے ساتھ"۔ کم بختو، اس طرح کی شکل مت بناؤ کہ بیوپاریوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جائے کہ تم لوگ پہلی بار بکرا منڈی کی سیر کو نکلی ہو۔" زرینہ نے ڈپٹ کر کہا۔ تو فالقہ کھنکھاری اور قریب موجود دانت نکوس کر ہمیں دیکھنے والے ایک بیوپاری سے فخر یہ بولی۔

"بالکل صحیح ریٹ لگانا بھائی۔ ہمیں کوئی لوٹ

لوٹ آئی اور ساتھ ہی رعب بھی۔

"خبردار! کوئی انٹ سنٹ پروگرام بنانے کا

سوچا تو"

"کون سا ایسا کام ہے دادو جان! جو لڑکیاں نہیں کرتیں۔ اب تو لڑکیاں چاند پر پہنچ گئی ہیں۔" میں نے مبالغہ آمیزی کی حد کر دی۔ دادو کون سا اتنی معلومات رکھتی تھیں۔

"یہ کام کرنے سے بہتر ہے کہ تم بھی چاند پر پہنچ جاؤ بی بی۔" دادو نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں جزبہ ہوئی۔

"چاند یہ کون سی بکرا منڈی لگی ہوئی ہے دادو اور ویسے کبھی آج تک ہم نے بکرا منڈی نہیں دیکھی کبھی۔" فالقہ نے لاڈ سے دادو کے کندھے پر سر رکھا جسے انہوں نے بے رخی سے جھٹک دیا۔

"دیکھی تو تم نے انجی تک قبر بھی نہیں ہے۔" دادو کی بے رحمانہ بات پر فالقہ نے زور سے جھرجھری لے کر با آواز بلند "اللہ نہ کرے" کہا تھا اور ہم نے لرز کر "آمین"۔

"جانے دیں اماں! ان کو یہ شوق بھی پورا کر لینے دیں۔ ان کو بھی پتا چلے کتنی خواری اٹھا کر میرے بچے جانور خرید کر لاتے ہیں۔ جن میں یہ ہر بار مین میکھ نکالتی رہتی ہیں۔ دیکھ لیجیے گا۔۔۔ کھوتا ہی خرید کر لائیں گی۔" امی نے طنز کیا تو جہاں دادو نرم پڑیں وہیں ہم تینوں کے حوصلے اور ارادے مزید مضبوط ہو گئے۔ اب تو اس گھر میں بکرا آ کر ہی رہے گا۔ وہ بھی ہمارے ہاتھوں۔

اگلے روز ہم نے بکرا منڈی جانا تھا تو تیاری سر شام ہی شروع کر دی۔ ہم اپنی الماری کا دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئیں اور زندگی بھر کے سلوائے ہوئے کپڑے نکال دیئے۔

"کون سا ولیمہ اٹینڈ کرنے جا رہی ہو تم لوگ۔" زرینہ کو میری اور فالقہ کی تیاریاں دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ مگر بٹ ہاؤس کی لڑکیاں کسی بھی

"ایونٹ" کو ایسے ہی تھوڑا جانے دیتیں۔ جبکہ چڑیا، مانو اور ماہین نے ساتھ جانے اور اس ایڈونچر سے لطف اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

بکرا منڈی پہنچ کر ہم تو حیران ہوئے ہی تھے بلکہ مجھے تو لگا شاید بکرے بھی ہمیں دیکھ کر حیران کم پریشان زیادہ ہو گئے ہیں۔ وہاں پر تو یوں لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا ہی بیل بکرے خریدنے پہنچی ہوئی

ہے۔ ہماری ہوائیاں اڑ گئیں۔ بھانت بھانت کے لوگ وہاں جمع تھے۔ مگر عورتوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جو شاید اپنے بچوں کی ضد اور خوشی کی خاطر میاں کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ ہر طرف "انا پسندوں" کی "میں میں میں" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ آدھا گھنٹہ گزرا تو گرمی میں ہمیں دادی، نانی سب یاد آ گئیں۔ لائسنس مسکارے بہنے لگے۔ پسینہ صاف کر کر کے سب کی اللہ معاف کرے اصلی تشکلیں نکل آئیں۔

"بھئی بڑا حوصلہ ہے بھائی لوگوں کا جو ہر ماہ بکرے خرید کر لے جاتے ہیں"۔ فالقہ سب پہلے پچھتیائی۔

"قسم، مجھ سے تو اپنی اور بکرے کی بو میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے۔" زرینہ روہاسی ہوئی۔

"اوپر سے بیوپاری ایسے خرانٹ لگ رہے ہیں" میں نے بھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو فالقہ لرزی۔

"یہ لاسٹ ایڈونچر ہے میرا۔ تم لوگوں کے ساتھ"۔ کم بختو، اس طرح کی شکل مت بناؤ کہ بیوپاریوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جائے کہ تم لوگ پہلی بار بکرا منڈی کی سیر کو نکلی ہو۔" زرینہ نے ڈپٹ کر کہا۔ تو فالقہ کھنکھاری اور قریب موجود دانت نکوس کر ہمیں دیکھنے والے ایک بیوپاری سے فخر یہ بولی۔

"بالکل صحیح ریٹ لگانا بھائی۔ ہمیں کوئی لوٹ

لوٹ آئی اور ساتھ ہی رعب بھی۔

"خبردار! کوئی انٹ سنٹ پروگرام بنانے کا

سوچا تو"

"کون سا ایسا کام ہے دادو جان! جو لڑکیاں نہیں کرتیں۔ اب تو لڑکیاں چاند پر پہنچ گئی ہیں۔" میں نے مبالغہ آمیزی کی حد کر دی۔ دادو کون سا اتنی معلومات رکھتی تھیں۔

"یہ کام کرنے سے بہتر ہے کہ تم بھی چاند پر پہنچ جاؤ بی بی۔" دادو نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں جزبہ ہوئی۔

"چاند یہ کون سی بکرا منڈی لگی ہوئی ہے دادو اور ویسے کبھی آج تک ہم نے بکرا منڈی نہیں دیکھی کبھی۔" فالقہ نے لاڈ سے دادو کے کندھے پر سر رکھا جسے انہوں نے بے رخی سے جھٹک دیا۔

"دیکھی تو تم نے انجی تک قبر بھی نہیں ہے۔" دادو کی بے رحمانہ بات پر فالقہ نے زور سے جھرجھری لے کر با آواز بلند "اللہ نہ کرے" کہا تھا اور ہم نے لرز کر "آمین"۔

"جانے دیں اماں! ان کو یہ شوق بھی پورا کر لینے دیں۔ ان کو بھی پتا چلے کتنی خواری اٹھا کر میرے بچے جانور خرید کر لاتے ہیں۔ جن میں یہ ہر بار مین میکھ نکالتی رہتی ہیں۔ دیکھ لیجیے گا۔۔۔ کھوتا ہی خرید کر لائیں گی۔" امی نے طنز کیا تو جہاں دادو نرم پڑیں وہیں ہم تینوں کے حوصلے اور ارادے مزید مضبوط ہو گئے۔ اب تو اس گھر میں بکرا آ کر ہی رہے گا۔ وہ بھی ہمارے ہاتھوں۔

اگلے روز ہم نے بکرا منڈی جانا تھا تو تیاری سر شام ہی شروع کر دی۔ ہم اپنی الماری کا دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئیں اور زندگی بھر کے سلوائے ہوئے کپڑے نکال دیئے۔

"کون سا ولیمہ اٹینڈ کرنے جا رہی ہو تم لوگ۔" زرینہ کو میری اور فالقہ کی تیاریاں دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ مگر بٹھاؤس کی لڑکیاں کسی بھی

مجھے اکڑو بٹ یاد آیا۔ وہ یہاں ہوتا تو میری گردن دبا دیتا مگر بکرے خریدنے کے لیے بکرا منڈی آنے کی اجازت بھی نہ دیتا۔ میں جل کر کباب ہوئی اور ادھر فائقہ کھل کر گلاب۔ ہک ہاہ۔۔۔

اور پھر بکروں کی تلاش شروع ہوئی۔ تو ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد بکروں کی ایک جوڑی عمران کے دل کو بھا ہی گئی۔

"یہ دیکھو۔۔۔ میرے خیال میں یہی ٹھیک ہیں۔ ان کا ریٹ کروا لیتے ہیں۔"

"آپ نے تو کہا تھا، میری پسند کے ہوں گے۔" فائقہ ٹھنکی۔

کیسی۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی جگہ تھی (ٹھنکنے کی) منگیتر کو ناز نخرے دکھانے کی۔ میں جل کر رہ گئی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنّا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

نہیں سکتا۔ ہم اکثر یہیں سے شاپنگ کرتے ہیں۔"

"آہو۔ اپنا دولہا یہیں سے پسند کیا تھا تم نے۔"

بھی بتادو۔" میں نے تقریباً گدی سے پکڑ کر فائقہ کو

ٹھیسٹ لیا اور دانت کچکچائے۔

"واٹ دا ہیل۔۔۔" وہ تلملا اٹھی۔

"خبردار جو میرے فیانی کو بکرا کہا تم نے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی اور موشگافی کرتی اور

جو لپا فائقہ اسی بکرا منڈی میں مجھے خوب

سنائی (گانے نہیں جی۔۔۔ گالیاں) ایک بے یقین

سی آواز ہمارے پیچھے سے ابھری۔

"واٹ آ سر پرائز۔۔۔ تم لوگ؟" ہم تینوں

اسی طرف گھوم گئے تو سامنے عمران عباس (یاد

رکھے۔۔۔ نی وی والا نہیں بلکہ فائقہ کا منگیتر) کو

کھڑے دیکھ کر ہماری آنکھوں میں خوشی کے وہی

آنسو آئے جو بھیڑ میں پھڑپھڑے بچے کی آنکھوں میں

اپنی ماں کو دیکھ کر آ جاتے ہیں۔

"ارے آپ۔۔۔" میں نے فٹافٹ خود کو

سنجھالا۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"بکرا منڈی میں۔۔۔؟" عمران نے

بھنویں اچکائیں۔ زرینہ نے میرے پیر پر اپنا پیر مارا

اور دانت پیس کر بظاہر بہت سمجھداری سے بولی۔

"اب بکرا منڈی آئے ہیں تو جانور ہی خریدیں

گے نا۔"

"آپ بکرے خریدنے آئے ہیں؟" فائقہ

نے شرمیلے انداز میں دوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے

پوچھا تو گھما پھرا کر بار بار ایک ہی سوال نے اتنی گرمی

میں عمران کا میٹر بھی یقیناً گھما دیا۔

"نہیں۔ بس ایک آدھ سیلفی لوں گا ان کے

ساتھ اور آٹو گراف لے کر گھر چلا جاؤں گا۔" وہ

بڑے محل سے بولا تو ہماری ہنسی بے ساختہ تھی۔ عمران

بھی ہنسا اور یوں ماحول قدرے بہتر ہو گیا۔

"ہمارے بکرے تو اب فائقہ ہی پسند کرے

گی۔" عمران نے کن اکھیوں سے فائقہ کو دیکھا تو

"ہاں ہاں۔ شیور۔ وائے ناٹ۔" عمران
عباس تو زخمی نکل۔ بلکہ زخمی بکرا بنا جا رہا تھا۔ فائقہ
نزاکت سے پلکیں جھپکتی بکرے کے مالک کی طرف
متوجہ ہوئی۔

"بھائی صاحب۔ کتنے میں دے رہے ہیں یہ
والے بکرے؟"

"آجی! اسی ہزار کی جوڑی ہے یہ۔" مالک
نے مسکین شکل بنا کر کہا۔ اب جس قد، کاٹھ اور صحت
کے وہ بکرے تھے اس لحاظ سے وہ قیمت بڑی
پرفیکٹ تھی مگر فائقہ نے اتنی بلند چیخ ماری کہ ہم تو
ڈرے ہی تھے، بکرے بھی مالک کے ہاتھ سے رسی
ترانے لگے۔

"کیا ہوا۔ اتنے مہنگے تو نہیں ہیں۔ تم پریشان
مت ہو۔ مناسب ہی ہے قیمت۔" عمران نے
حیران ہو کر اسے تسلی بھی دی۔

"قیمت کی وجہ سے کون کمبخت پریشان ہو رہا
ہے۔ آپ نے سنا نہیں۔ یہ مسٹنڈا مجھے آیا کہہ رہا
ہے۔ یعنی کہ مجھے۔" فائقہ کا تو بی پی لو ہو رہا تھا۔
میرا دل تو چاہا ایک ہاتھ اس کی گدی پر
جماؤں۔ خود عمران بھی ہونق سا مستقبل کی مسز کو دیکھ
رہا تھا۔

"بس طے ہو گیا۔ اب ہم کہیں اور سے بکرے
خریدیں گے۔" پیر پختی فائقہ کا انداز اٹل تھا۔

آپ کو تو پتا ہی ہے قارئین۔ عمر کے معاملے
میں تو لڑکیاں پشتوں کی دشمنیاں پال لیتی ہیں (بلکہ
کشتوں کے شتے لگا دیتی ہیں) مگر کئی سالوں تک
ایک ہی عمر پر مستقل مزاجی سے ڈلی رہتی ہیں۔
آہم۔۔۔ بھی مستقل مزاج جو ہوئیں۔ اب ہر سال
اپنی بات سے پھرنا کیا اچھی بات ہے۔ ہم نے تو جو
ایک بار کہہ دیا، سو کہہ دیا۔

"بکرے اچھے ہیں ویسے۔۔۔" عمران

عباس نے کہنا چاہا۔ مگر فائقہ کی "مجھ سے زیادہ اچھے
ہیں کیا؟" والی نظروں کے سامنے بس منمنا کر رہ

گیا۔ پھرتے پھرتے پھراتے ایک بکروں اور دنبوں کے
بڑے ریوڑ پر نظر پڑی تو ہم وہیں رک گئے۔
"جی سر جی! کیا چاہیے آپ کو۔" یہ اس ریوڑ کا
مالک تھا۔ جس نے عمران سے پوچھا۔
"جی، ہمیں بکرا چاہیے۔"

"کیسا بکرا چاہیے۔؟" بیوپاری نے ریوڑ کی
طرف اشارہ کیا۔ "پسند کریں۔"

"ٹھہرو، میں بتاتی ہوں۔۔۔ اونچا لمبا، اسمارٹ
اور شریف سا ہو۔ بال سلکی ہونے چاہئیں۔" فائقہ
نے گن گن کر وہ خوبیاں بتائیں جو اللہ معاف کرے
آج کل شادی کے لیے لڑکوں میں بھی نہیں ملتیں۔

"اور ہاں مارتا بالکل نہ ہو۔" میں نے اضافہ
کیا۔ تو بکروں کا مالک بڑے تحمل سے بولا۔

"با جی جی! لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ کس
محکمے میں کس گریڈ کا بکرا ہو اور تنخواہ کیا لیتا ہو؟"

"ہااااا۔۔۔ در فٹے منہ۔۔۔" زرینہ کو غصہ
آیا۔

"تو اور کیا با جی جی۔۔۔ قربانی کے لیے بکرے
بچ رہا ہوں، رشتے کے لیے نہیں۔" وہ رکھائی سے
بولا۔

"آ۔۔۔ ہم۔۔۔" عمران کھنکھارا۔ تو ہم تینوں
اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میرے خیال میں اب تم لوگ گھر جاؤ
شاباش۔۔۔ بکرا منڈی تو دیکھ ہی لی نا۔"

ہم تینوں نے خون خوار نظروں سے اسے
دیکھا۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ آج تو ہم یہ پہاڑ سر کر کے ہی
رہیں گے۔ نری بکرا منڈی تھوڑی دیکھنی تھی ہم نے۔
میر تو طعنے مار مار کر ہی مار ڈالے گا مجھے۔ بس۔۔۔
لے آئیں بکرا۔۔۔ بڑا پیارا ہے یہ "ہوائی"
بکرا۔ نہ ٹمی بھائی۔ اب آئے ہیں تو بکرا لے کر ہی
جائیں گے۔"

میں تو جذباتی ہی ہو گئی۔ عمران عباس مرتے کیا

نہ کرتے کے مصداق ہمارا ساتھ دینے پر مجبور تھا کیوں کہ وہ دل کے ساتھ ساتھ آج بکرا خریدنے کا اختیار بھی فائقہ بی بی کو دے چکا تھا۔ گہری سانس بھر کر ہمارے ساتھ چل دیا۔

ہم دوبارہ بکروں کا اتنی عمیق نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں کہ کیا ہی کسی لڑکی کے ابا نے اپنی لڑکی کے رشتے کے لیے یوں کسی لڑکے کا جائزہ لیا ہوگا۔

"آہا۔ یہ دیکھو فائقہ۔۔۔ بالکل تمہاری پسند کا بکرا لگ رہا ہے۔ لمبا، اسارٹ اور شریف۔" زرینہ کی پر جوش آواز پر ہم اس کی طرف پلٹیں۔ سیاہ رنگ کا بڑے سینگوں والا بکرا دھوپ میں چمک رہا تھا۔ عمران نے پسندیدگی سے بکرے کو دیکھا۔ اور پھر فائقہ کو۔ جو بکرے کا گہری نظروں سے معائنہ کر رہی تھی۔ اس کی نگاہ تنقیدی تھی۔ پھر اس نے بکرے کے مالک کی طرف دیکھا۔

"اس میں کوئی اور کمر نہیں ہے کیا؟" منہ بنا کر کہا تو بکرے والا نجانے کیوں ہونق سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"اور سینگ ذرا چھوٹے ہوں پلینز۔ اور دانت چیک کر لیں، پورے بتیس ہونے چاہئیں۔" مجھے بھی اعتراض ہوا۔ اتنے بڑے اور نوکیلے سینگ تھے کہ بکرے کے پاس جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے تو اس کی دم بھی چھوٹی لگ رہی ہے۔" بھائی صاحب اس کمر میں ہی تھوڑی بڑی دم والا بکرا نہیں مل سکتا؟" یہ زرینہ کی فرمائش تھی۔

بکرے والے کی آنکھیں مارے حیرت و حیرت کے ابل پڑیں۔ عمران عباس کی حالت ایسی تھی کہ بال نوچنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے؟"

"لو جی۔۔۔ اب اتنے ہزار خرچ کر کے بندہ اپنا پسند کا بکرا بھی نہیں خرید سکتا۔" فائقہ ٹھنکی۔

"یہ بکرا ہے بی بی جی! براٹڈ سوٹ نہیں جس

میں متبادل رنگ اور ڈیزائن مل جائے۔" بکرے والا نہ جانے کیوں روہانسا ہو رہا تھا۔

"اور میرے پاس صرف دو دانت والے، چار والے یا چھ دانت والے بکرے ہیں بس۔"

"ہاااااا۔۔۔۔۔" ہم تینوں کی مشترکہ ہاہ نے عمران اور بکرے والے کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

"اف اللہ۔۔۔ یہ کھانا کس طرح کھاتا ہوگا پھر۔۔۔ یعنی داڑھیں تو ہیں ہی نہیں اس کی؟" مجھے صدمہ ہوا۔

"نقص والے جانور لے کر منڈی پہنچے ہوئے ہیں آپ۔ جانے کتنے لوگوں کو یہ دو دو، چار چار دانت والے بکرے فروخت کر چکے ہوں گے۔ بھئی ہمیں تو پورے بتیس دانتوں والا بکرا چاہیے۔۔۔ ہاں ایک آدھ کم ہو تو چل جائے گا۔ مگر بے چارہ کم از کم اپنا چارہ تو چبا سکے نا۔" فائقہ تو مارے ہمدردی کے رونے والی ہو رہی تھی۔ اور عمران عباس تھا کہ دم بخود ہم سب کا باری باری منہ دیکھ رہا تھا۔

"بس اسی بکرے میں براؤن کمر دے دیں۔ سینگ ہم پیچ کر لیں گے۔ وہ تو بندہ رگڑ کر چھوٹے بھی کروا سکتا ہے۔" زرینہ نے شرائط نسبتاً آسان کیں۔

"پاء جی! تو اڑی بڑی مہربانی۔ ایہناں نوں لے جاؤ ایہتھوں۔ میرا تے منڈی چھڈ کے کپڑیاں دی دوکان کھولن دا دل کردا پچا اے" (بھائی صاحب! آپ کی بہت مہربانی۔ انہیں یہاں سے لے جائیں۔ میرا تو منڈی چھوڑ کر کپڑے کی دوکان شروع کرنے کا دل کر رہا ہے۔)

بکرے والے نے ڈبڈبائی نظروں سے ہمیں دیکھ کر عمران عباس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ سرخ چہرہ لیے تیس تقریباً گھسیٹا ہوا گاڑی تک لایا اور گویا دھکیل دھکیل کر اس میں ہمیں ٹھونسا اور ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جبرے بھنچے ہوئے تھے اور چہرے کے تاثرات ناقابل بیان تھے۔

گاڑی تھوڑا آگے بڑھی تو ہمارا سکتہ ٹوٹا اور

ہماری انا انگریزائی لے کر بے دار ہوئی۔
 "یہ عمی کو کیا ہوا۔۔ اتنے غصے میں تو کبھی نہیں
 دیکھا اسے۔" فالقہ پریشان سی ناخن چبا رہی تھی۔
 "وہی مردانہ ذہنیت۔۔ عورتوں۔۔ مطلب
 کہ لڑکیوں کو تو دیکھ ہی نہیں سکتے یہ لوگ کوئی بڑا کام
 کرتے۔ اتنا متاثر ہو رہا تھا۔ وہ بکرے والا ہماری
 بھاؤ تاؤ کی تکنیک سے۔۔ ہاتھ تک جوڑ دیے اس
 نے اور سارا کام خراب کر دیا عمران بھائی نے۔"
 مجھے خود غصہ آ رہا تھا۔ فالقہ کو تو عمران کی شکل
 یاد کر کر کے پریشانی ہو رہی تھی۔ اگر عمران عباس کو
 چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہی اتنا غصہ آتا تھا تو آگے اللہ
 ہی مالک تھا فالقہ کا۔

بہر حال ہم بے نیل و مرام گھر واپس آئے اور
 میرو کے شہر سے باہر ہونے کا کوئی بھی فائدہ نہ اٹھا
 سکے۔ گھر کی سب خواتین کو خوب نمک مرچ لگا کر
 اپنا عقل مندانہ بھاؤ تاؤ اور عمران کی خفگی والا قصہ سنایا
 تو جانے کس بات پر ان کی آنکھیں اور منہ کھلے کے
 کھلے رہ گئے۔ یوں بکرانہ خرید سکنے کی نالائق کا ٹھپہ
 ہم پر لگتے لگتے رہ گیا۔ اور اچھا ہی ہوا قارئین۔ جس
 کا کام اسی کو سا جھے۔ اتنی گرمی میں بکرانہ منڈی جا کر
 جانور خریدنا مردوں ہی کا کام اور حوصلہ ہے۔ اور جانا
 بھی لڑکوں کو چاہیے۔ ان کا کون سا میک اپ خراب
 ہونا ہوتا ہے۔ ہونہ۔

☆☆☆

میرو، عمر اور حسان گھر لوٹے تو اگلے ہی دن
 بکرے بھی خرید لائے۔

"اتنے بڑے بڑے سینگ.... اور دم تھوڑی
 تو لمبی ہوتی ان کی.... یہ جو بلیک والا بکر اتم لائے ہو
 میرو اس میں براؤن کلر نہیں تھا کیا؟" میں نے
 بکرے دیکھ کر میرو سے پوچھا تو وہ محل سے بولا۔
 "ہم نے کون سا بکروں سے کیٹ واک
 کروانی ہے رہیمپ پر.... تم بس ان کی خدمت کرو
 اور چارے پانی کا دھیان رکھو۔"

اگلے ہی دن بوئی آن ٹپکا۔ اس نے آنکھیں

گھما گھما کر پر جوش ہو کر تینوں بکروں کو دیکھا پھر کسی
 ماہر قصائی کی طرح بکروں کو ہاتھوں سے ٹٹول کر اللہ
 جانے کیا کرنے لگا۔ بکرے بے چارے اس افتاد پر
 پریشان، کبھی بدک کر ادھر تو کبھی ادھر ہوتے۔

"شرم کرو بوئی! قربانی کے جانوروں کو گدگدی
 کر رہے ہو تم۔" فالقہ نے اسے ڈانٹا۔ تو وہ
 متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"گدگدی نہیں کر رہا باجی جی.... گوشت
 چیک کر رہا ہوں...." پھر ساتھ ہی دانت نکوس کر
 فرمائش بھی جڑدی۔

"کیجی مجھے دینی ہے آپ نے۔ آپ کو قسم
 ہے"

"ابھی نکال دوں....؟" میں نے چڑ کر
 پوچھا۔

"ہیں.... سچی....؟" وہ نہال ہوا تو میرا جی
 چاہا اس کی گدی کے نیچے ایک بجائوں۔

"اللہ کے بندے جب قریانی ہوگی تب ہی کیجی
 نکلے گی نایا ابھی نکال کر دے دوں تمہیں؟" میں تپی۔
 اور ساتھ ہی اسے باہر کا راستہ دکھایا۔ مگر شام کو وہ پھر آ
 دھمکا۔

"باجی جی! امی نے کہا ہے بکروں کے پائے
 ہمارے ہوں گے"

"کیوں بھائی.... پائے کے پیسے تمہاری امی
 نے دیے تھے کیا۔"

فالقہ کی زبان پھسلی۔ ساتھ ہی دادو کی چھری
 اس کے ہاتھ کی پشت پر بجی تو وہ اچھل پڑی۔ اسے
 حسب توفیق گھور کر بڑے پیار سے بوئی کو تسلی دی۔
 "فکر مت کرو۔ پائے تمہارے ہی ہوں گے۔"

بس یاد کرو ادینا ہمیں

بوئی نے دانت نکوسے.... ہم نے بھی سوچا بلا
 ٹل گئی۔ مگر نہ جی..... دوپہر، شام روزانہ گویا
 ڈاکٹری نسخے کے مطابق وہ ہمیں یاد دہانی کروانے
 آتا.....

"باجی.... بکرے کے پائے آپ نے مجھے

دینے ہیں۔ "تیسرے دن تک دادو اس بجتے ریڈیو سے خود تنگ ہو گئیں۔ اور بو بی کے سامنے ہی بظاہر بڑے رمان سے مگر درحقیقت دانت پیس کر حسان سے بولیں۔

"جاو بیٹا! ذرا اسے تو فارغ کر دو عید سے پہلے ہی۔ بکروں کے پائے اتار کر اسے دے دو اور بکروں کو اینٹوں پر کھڑا کر دو۔"

دادو کا طنز اس قدر بر جستہ تھا کہ ہماری ہنسی چھوٹ گئی مگر لوٹ پوٹ تو ہم ساری تب ہوئیں جب بو بی نے آنکھیں گھمائیں اور دانت نکوس کر بولا۔

"دادو جی! برتن لے آؤں یا سارے پائے شاپر میں ڈال کر دیں گی؟" دادو نے تنک کر اپنی چھڑی اٹھائی تب کہیں جا کر بو بی کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا اور وہ بگٹ بھاگا۔

☆☆☆

اور قارئین! دادو جب بھی رات دیر تک ہمیں ڈائجسٹ پڑھنے پر لعنت ملامت کرتیں یا امی موٹے شیشوں کی ٹینکیں لگنے کی پیشن گوئی کرتیں تو ہم سب کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"ادوہ امی! عید پر کچھ پکانا نہیں ہے کیا؟ کھانوں کی ترکیبیں دیکھ رہے ہیں۔"

جواباً ہم بڑے اعتماد سے کہتے۔ اور وہ وقت تو رسالوں میں ناول پڑھ کر گزر گیا مگر گھر والوں کا جو ہم پر اعتبار قائم ہوا وہ اس عید پر دادو جان تو کیا گھر والوں نے بھی خواتین، شعاع کے دسترخوان کی تمام گوشت کی ترکیبوں کو ہم سے پکوا پکوا کر ثابت کیا۔ جس کے بعد ہم نے آئندہ یوں ڈنکے کی چوٹ پر جھوٹ بولنے سے توبہ کر لی۔

☆☆☆

"رویحا! عمران کی آپابی کی طبیعت خراب ہے ان کی عیادت کرنا بنتی ہے یا تعزیت؟"

فائقہ پریشان حال لیے میرے پاس آئی۔ اس بے چاری کے اپنے ہی بڑے مسئلے تھے۔ میں نے اسے کھور کر دیکھا۔

"تم تو عیادت بھی جن الفاظ میں کرو گی، وہ تعزیت ہی لگیں گے۔"

"میرد۔" میں فائقہ پر طنز کا تیر پھینکتی باہر نکلتے از میر بٹ کے پیچھے لپکی۔ وہ رکتے رکتے بھی پورچ میں پہنچ چکا تھا۔ گہری سانس بھرتا میری طرف پلٹا تو اذہیشن کی دل فریب خوشبو ہوا کے جھونکے کے ساتھ میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ موڈ خود بخود رومانٹک ہونے لگا مگر میں نے خود کو ڈیپٹ دیا۔ اس وقت میں جس موضوع پر بات کرنے آئی تھی وہ زیادہ ضروری تھا۔

"اب بول بھی دو... کیا وظیفے شروع کر دیے ہیں تم نے۔" میں ابھی دل اور دماغ کے بیچ الجھی کھڑی تھی کہ وہ تنک کر بولا۔

"وہ.... مجھے کچھ وقت چاہیے۔" میں ہڑبڑا کر ہوش میں آئی۔

"اب میں شام تک یہیں تو کھڑا نہیں رہ سکتا، جو بات کرنی ہے، جلدی سے کرو ورنہ میں جا رہا ہوں۔" اس نے نکل سے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ میں فری ہو کر تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے جلدی سے وضاحت کی مگر میرو کے بدلتے تاثرات دیکھ کر احساس ہوا کہ جملہ کچھ غلط بن گیا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ جب تم فری ہو۔" "دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا... میں کیوں فری ہونے لگا بھلا تمہارے ساتھ۔" اس کی تیوری چڑھنے لگی۔

(اللہ جی.... یہ ساری ذہین لڑکیوں کے منگیترا اتنے چغہ کیوں ہوتے ہیں) میں دل میں کرا رہی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بہت گہمیر ہے جب تم فارغ ہو، اس وقت اس پر تفصیل سے بات کریں گے۔"

"ایسا کون سا گہمیر مسئلہ ہے۔ مسئلہ کشمیر حل کرنا ہے یا مسئلہ فلسطین؟" میرو کا طنز شدید تھا، بڑے زور سے دل میں کھپا۔ ہک ہا۔ مگر کیا کیا جائے کہ اتنے ترس ترس کر اگر کھوڑے سے زیادہ ہینڈ سم

منگیترا مل جائیں تو ان کی اس طرح کی حرکتیں
نظر انداز کرنا ہی پڑتی ہیں۔
"چلو جب تم شام کو گھر واپس آؤ گے تو پھر بات
ہوگی۔" میں نے تھوڑا سنبھل کر وقت دے دیا۔
"ابھی بات کرو جو کرنی ہے، دو منٹ ہیں بس
تمہارے پاس" وہ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے
ہوئے بولا تو میرا دل ہول کر رہ گیا۔ ناراضی سے
اسے دیکھا۔

"اللہ نہ کرے میرے پاس دو منٹ ہوں ابھی
میری عمر ہی کتنی ہے، ہو سکتا ہے میں سو سال تک
جیوں۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دنیا
سے مرنے کا رواج ابھی اٹھا نہیں ہے محترمہ۔" وہ
سلگ کر بولا اور پھر سر جھٹکتا تیز قدموں سے چلتا ہوا
گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"یاد رکھنا، میں نے تم سے اپائنٹمنٹ لی ہوئی
ہے شام کی۔" میں نے پیچھے سے آواز لگائی تو وہ
تاسف سے سر ہلاتا گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ
کرنے لگا تو میں تقا خزانہ انداز میں اندر چلی آئی مگر
زرینہ کو لٹکے منہ کے ساتھ ناشتے کے برتن اٹھاتے
دیکھ کر میری ساری خوشی کا فور ہو گئی۔

بے چاری کی تو جان ہی مشکل میں پھنس
گئی تھی۔ فالقہ کے منگیترا عمران عباس کا دوست کعب
عزیز تو آپ کو یاد ہی ہوگا۔ زرینہ کے لیے اس کا
پروپوزل آیا تو پتا چلا کہ اس کا پورا نام کعب عزیز مرزا
ہے۔ لوجی بات ہی ختم۔ سب نے ہاتھ جھاڑ دیے۔
ہم بٹ وہ مرزا..... اور اسی بیچ اب نہ جانے کس
اوپرے غیرے نتھو خیرے کا پروپوزل بھی زرینہ کے
لیے آگیا، جس پر گھر والے بشمول دادو اور از میر بٹ
بہت خوش تھے۔ قیامت تو بس زرینہ پر ٹوٹی تھی۔
اب بٹ ہاؤس والوں کو کیا معلوم کہ ان کی مینا اس مرزا
کی صاحبان بننے کی کتنی مشتاق ہے۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" ماہین چشماتو کی نظر
زرینہ پر ابھی پڑی۔

"ایسے ہی بس..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر
پریشان ہونے کا شوق ہے اسے۔"
"یہ چھوٹی بات ہے تمہارے نزدیک؟"
زرینہ نے آنسو بھری آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔
"تم فکر مت کرو۔ تمہارے دکھ کا احساس ہے
مجھے۔ اسی لیے میں نے شام کو از میر کے ساتھ ایک
ملاقات رکھ لی ہے۔" میں نے تقا خزانہ مسکرا کر گویا
اس کی ہمت بندھائی تو زرینہ نے بے یقینی سے
میری طرف دیکھا اور میرے شانے پر ایک زوردار
تھپڑ رسید کیا۔
"شرم تو نہیں آئی ہوگی۔"

"لو بھلا.... اب اس میں بے شرمی والی کیا
بات ہے؟" میں نے اپنا شانہ سہلاتے ہوئے اسے
گھور کر دیکھا۔

"اتنے دکھ سے گزر رہی ہوں اور تم میرے
بھائی کے ساتھ ملاقاتیں طے کرتی پھر رہی
ہو۔" زرینہ غرائی۔

"کمینی عورت..... میں تمہاری ہونے والی
شادی روکنے کے چکر میں ہوں اور تم مجھ پر چڑھائی
کر رہی ہو۔" میں نے اس کی بات سمجھ کر آستینیں
چڑھائیں اور اس نے تیوریاں۔ انگلی اٹھا کر تنبیہی
انداز میں بولی۔

"دیکھو، یہ کمینی تک بات ٹھیک ہے لیکن اگر اگلی
بار تم نے اتنا منہ پھاڑ کر مجھے عورت کہا نا تو پھر یقین
رکھو کہ تمہارا خون میرے ہی ہاتھوں لکھا ہوا ہے۔"

☆☆☆

"اب بول بھی دو رویہ اگل! یا بس بہ زبان
خاموشی ہی ساری گفتگو ہوگی آج؟" میں اس کے
کمرے میں آ تو گئی تھی مگر بات کہاں سے شروع
کروں، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ چند منٹ تک کل
سے میرے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد تنگ آ کر
گویا ہوا۔ تو میں گڑ بڑائی۔ پھر کھنکھار کر گویا دل ہی
دل میں کچھ جملے ترتیب دیے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے ظالم ہو از میر!"

بڑے دکھ سے کہتے ہوئے میں نے شرم دلانے والی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ متحیر رہ گیا۔
 "میں....؟ اب میں نے کیا کیا ہے؟" طنز سے پوچھا گیا۔

"اپنے آپ سے پوچھو از میر بٹ!" میں بڑی کوئی سن ساٹھ کی ہیروئن بنی ہوئی تھی اس وقت۔
 "اپنے آپ سے.....؟" وہ الجھا پھرتا۔
 "نا... تو میں نے کون سے چار پانچ قتل کر رکھے ہیں جو ظلم یاد کروں اپنے۔"

"واہ از میر بٹ واہ۔" میں نے اٹھ کر تالی بجا کر کہتے ہوئے دکھیا اداکاری میں دیوداس کی پارو کو بھی مات دے دی۔

"کسی کے ارمانوں کا خون کر کے ابھی بھی پوچھتے ہو کیا کیا ہے تم نے؟"
 وہ بھونچکا رہ گیا۔

"کیا بگو اس ہے یہ؟" مجھے دلی خوشی ہوئی۔
 اس جیسے فطین بندے کو آج میں نے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"تم ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ نہیں کر سکتے۔" میرا حوصلہ بلند ہوا تو ڈائلاگ ڈیلیوری میں بھی بہتری آئی۔

"اووہ....." وہ گویا اب جا کر معاملے کی تہہ تک پہنچا تھا۔ "تو یہ بات ہے یعنی کہ تم اس رشتے کے حق میں نہیں ہو۔"

میں نے اوپر دیکھ کر گویا اللہ کا شکر ادا کیا کہ دیر سے ہی سہی مگر وہ سمجھا تو۔ اور پھر شاہانہ انداز میں اسے شورہ دیا۔

"اب تم جا کر یہی بات دادو کے کان میں بھی ڈال دو۔۔۔۔۔ بلکہ سب کو کہہ دو کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ لڑکی اس شادی پر راضی نہیں۔"

"وہ تو میں ابھی جا کر کہتا ہوں۔ ایک تو دادو نے سب سے نکمی پوتی میرے پلو سے باندھ دی اور پھر سے وہ آکر مجھے ایسے باتیں سناتی ہے جیسے افغانستان کی موجودہ ملکہ وہی ہو۔" وہ بھڑک کر اٹھا تو

اس کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔
 قارئین آپ بھی وہی سمجھے نا جو میں سمجھ رہی ہوں..... یعنی جو میں نے سمجھایا، میرا اس کے بجائے کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ وہ دروازے کی طرف لپکا تو برا فروختہ ہو کر میں تیزی سے اٹھی اور دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"پیچھے ہٹو.... آج یہ کام بھی ہو جانے دو۔"
 اس کی رگوں میں بٹ خون تھا۔ پل بھر میں اس کا چہرہ سفید سے لال ہو گیا۔

"کک.... کیا کرنے جا رہے ہو.... میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم کیا سمجھ رہے ہو۔" یہ اچھی رہی۔ "میرے تو حواس ہی اڑ گئے۔ اچھا بھلا ہاتھ لگا منگیتر نکلنے والا تھا۔"

"آج میں فساد کی جڑ اس رشتے کو ہی ختم کر دوں گا۔" وہ خونخوار ہوا اور میری کھلھی بندھ گئی۔
 "بات تو سنو.... میں کچھ اور کہہ رہی تھی۔"
 "میں نے جو سنا ہے وہی کافی ہے فیصلہ کرنے کے لیے۔" اس کا انداز اٹل تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے" میں نے بھی جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے اندر جذباتی ہیروئن کی روح جگاتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔
 "پھر تم میری لاش پر سے ہی گزر کر جا سکتے ہو۔"

"میں گزر جاؤں گا رویا گل!" دانت پیس کر اس نے کہا۔ اس کے ارادے خطرناک تھے۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ دیوار پر ٹنگی دادا جان کی تاریکی بندوق اتار رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میرو! رویا گل کو علم ہو چکا ہے کہ اس کی تاریخ بھی اسی بندوق سے لکھی جائے گی۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ خوب صورت، بے گناہ لڑکیوں کی روحیں ساری عمر ڈراتی ہیں قاتلوں کو۔" میں اداکاری کی بلندیوں پر تھی۔ آنکھوں میں اپنی جوانی کی موت کا سوچ کر آنسو بھی آ گئے۔ کوئی ناولوں کا

ہیرو ہوتا تو ان آنکھوں میں ڈوب مرتا.... مگر ہک
ہاہ.... مجھے ملا بھی تو از میر بٹ... اکڑو۔ اس نے
بندوق کی نال میری طرف تانتے ہوئے چپا کر کہا۔
"خوب صورت لڑکیوں کی رو حیں واقعی ڈراتی
ہوں گی مگر تمہارے کیس میں ایسا کچھ نہیں ہوگا یقیناً۔
"لو جی.... سنگ دل منگیترا آپ کو اتنی بے
دردی سے خوب صورتوں کی کیٹگری سے نکال پھینکے تو
آپ کا مرنا واقعی بنتا ہے کہ نہیں۔

"اب تو تم واقعی مجھے مار ڈالو میرو!" میں نے
دکھ سے کہا تو اس نے نشانہ باندھا۔

"مگر میں زرینہ کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ دل
سے اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔ کیا ہوا کعب عزیز
مرزا ہے تو.... مرزوں کو تم ایویں نہ سمجھو.... بلکہ
تالاق تو ہم بٹوں کے لڑکے ہیں۔ مجال ہے جو آج
تک کسی بٹ کا تاریخ میں نام آیا ہو۔

بھی رسالے پڑھے ہوں تو تمہیں پتا چلے
شعاع میں اتنی مزے کی مزاحیہ سیریل شروع کی ہے
ہماری پیاری رائیٹرام طیفور نے.... کس کی بھلا؟
نہ شیخ نہ بٹ کی.... بلکہ مرزا صاحب کی.... اور
ادھر پنجابی ادب کو دیکھو.... صاحبان کا مرزا اپنی
محبت کی داستان میں امر ہو کر ساری دنیا کے لیے
مثال بن گیا۔ آج ساری دنیا اسے یاد کرتی ہے۔ کبھی
کسی نے کسی شیدے بٹ یا گلوبٹ کو یاد نہیں کیا۔
سب کو وہ مرزا یاد ہے۔

اور تم مانویا نہ مانو، میرا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ
کعب مرزا بھی اسی مرزا صاحبان والے مرزا کے
خاندان کی لڑی میں سے ہے اور مستقبل میں ضرور
کوئی نہ کوئی کارنامہ سرانجام دے گا۔"

میں جوش خطابت میں بھول گئی کہ کہاں اور کس
کے سامنے کھڑی ہوں اور کیا اول فول بک رہی
ہوں۔ وہ متحیر سا دادا جی کی بندوق سے گولی چلانا
بھول کر میری زبان سے برسٹ نکلتے دیکھ کر گنگ
تھا۔ میں نے اسے ساکت دیکھ کر ہمت کرتے
ہوئے انگشت شہادت سے بندوق کی نال کا رخ

دوسری طرف پھیرا۔

"آہم...." میں کھنکھاری تو وہ لال آنکھوں
سے مجھے گھورنے لگا۔

"تو پھر.... اب تو تمہیں مرزوں کی ساری
تاریخ یاد ہوگئی ہوگی؟" میں نے معصومیت سے پوچھا
اور جوابا اس نے دھاڑ کر مجھے کمرے سے
دفع.... آہم مطلب چلے جانے کو کہا۔ میں بندوق
کی گولی کی مانند وہاں سے نکلی اور اپنے کمرے میں
آ کر دم لیا۔ اور اب میرا دل خوف سے دھڑک رہا
ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے قارئین! اس ساری تقریر
سے میری قائم مقام منگنی کو تو کوئی خطرہ نہیں نا؟

☆☆☆

"در فتنہ منہ تمہارا رویا گل! یہ کرتوت کر کے
آئی ہو تم۔" زرینہ ساری داستان سن کر اللہ جانے غم و
غصے سے لرز رہی تھی کہ ڈر سے۔ مگر مجھے رج کے تپ
چڑھی۔

"ہاہ.... ایک تو تمہارے اس شیر بھائی کی
کچھار میں جا کر تمہارے ایکس وائی زیڈ مرزا کی
تاریخ کو مرزا صاحبان سے ملا کر رکھ دیا میں نے اور
تم مجھ پر چڑھائی کر رہی ہو۔ اتنی محنت کر کے تو میں
پیداوئی کے مقابلے کی فلم بنا سکتی تھی، جتنی محنت سے
تمہارے اس مرزے کی کہانی بنائی میرو کو سنانے کے
لیے۔" میں نے اسے ناخن دکھائے۔

"چلو... آج ایک بات تو اچھی طرح ثابت
ہوگئی کہ نندوں کی جڑوں میں اکثر بھابیاں ہی بیٹھتی
ہیں۔" یہ تبصرہ کتاب میں کھوئی ہوئی ماہین چشما ٹوکا
تھا۔

"اچھا ہوا پتا چل گیا... بہت جلد تم بھی ایسی ہی
ایک بھابی بن کر کسی کی جڑیں خراب کرنے والی
ہو۔"

میں نے اسے رگیدا تو وہ یوں مسکرائی جیسے میں
نے بہت بچکانہ بات کہہ دی ہو اور بے نیازی سے
کتاب کا صفحہ پلٹ کر اس میں گم ہوگئی۔

(ایک تو جب سے اس کی منگنی وزیراعظم نام سے ہوئی تھی، اس نے خود کو گویا پاکستان کی منگیتر سمجھنا شروع کر دیا تھا، میں تھلا کر زرمینہ کی طرف پلٹی۔

"ایک تو تمہاری وجہ سے میری اپنی منگنی ٹوٹے ہوئے تھی ہے اور پر سے تم باتیں بھی مجھے ہی سنار ہی

"او بہن... میں باز آئی ایسی ہمدردی اس نے اکتا کر کہتے ہوئے آخر میں کھٹاک سے ہاتھ میرے منہ کے آگے جوڑے۔ تو میں منہ پر رو پھر کر رہ گئی۔

"اب آتا میرے پاس یہ روئی شکل لے کر۔" اور پھر اگلی شام کو میرد کے کمرے میں زرمینہ کی ہوئی اور کچھ دیر بعد میں نے زرمینہ کو روٹے اس کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو میری ہمدردی زرمینہ سے اتنی بے عزتی کر والینے کے باوجود بے چین ہوا تھی۔ زرمینہ سے کل سے بات چیت اسی سے پتا چلا کہ لڑکے والوں کو چائے پر بلایا تو دل دکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

ازمیر بٹ میرے جذبات کا قاتل تو نکلا ہی اس نے تو اپنی بہن کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ سب اس سے آنے والے مہمانوں کو ڈسکس کر رہے اور میں سوچ رہی تھی کہ آنے والے مہمانوں کو کھانا کیا جائے کہ زرمینہ میری شکر گزار قسم کی تند تمام عمر میرے پیار و انتہی رہے۔

شام کو مہمان آگئے اور میں جوڑھیٹ بن کر لیٹی تھی، سب سے پہلے اٹھ کر بالوں میں برش پھیرنے لگی تھی، سب سے پہلے کپڑوں کی سلوٹیں دیکھ کر ڈرائیگ روم کی طرف پلٹی۔ لڑکے کی سویر اور کیوٹ سی بھائی کو تائی جان اور امی سے ملنے کے بعد صرف دیکھ کر ایک بار تو دل میں خیال آیا کہ مجھے خاندان سے آیا رشتہ لگتا ہے۔ رہنے ہی

دوں..... پھر یاد آیا کہ زرمینہ کا دل کعب عزیز کو نہ پا کر مرجھا جائے گا..... تو ایک بار پھر سر دھڑکی بازی لگا دینے میں کیا جاتا تھا۔ وہ مجھ سے بھی بہت پیار سے ملیں۔ اور ابھی میں ان کو اپنے مطلب کی طرف لانے کی کوشش میں تھی جب میرو ڈرائیگ روم میں داخل ہوا۔

(لو جی.... گئی بھینس پانی میں.... اب تو نہ نومن تیل ہوتا اور نہ ہی رادھانا چ پانی..... کیونکہ سرمندواتے ہی مجھ پر از میر بٹ نام کے اگلے پڑھکے تھے) میرا منہ بن گیا۔ کورس میں پڑھے تمام منجوس قسم کے محاورے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

"ہمیں تو بس گھر کو جوڑ کر رکھنے والی خوش مزاج سی لڑکی چاہیے بہن جی۔" لڑکے کی ماں سادگی اور اپنائیت سے بولیں۔ تو امی کی بات میں نے اچھی۔

"جی آنٹی جی! آپ فکر ہی نہ کریں زرمینہ کو عادت تو ہے لڑنے جھگڑنے کی مگر دو دن منہ بتائے رکھنے اور کوئی کام نہ کرنے کے بعد فوراً ہی مان بھی جاتی ہے، ہماری منتوں ترلوں سے۔"

"ہائیں..." امی نے مجھے گھورا۔ تائی جان کھنکھاریں۔ چچی جان کو تو سکتہ ہی ہو گیا۔ اور یقین کریں قارئین از میر بٹ کے تاثرات دیکھنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔ رشتے والی آنٹی بدقت مسکرائیں۔

"کوئی بات نہیں... لڑکیوں کو میسے میں عادت ہوتی ہے چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض ہونے کی۔"

"جاؤ رو سنا ادیکھو چائے بنالی زرمینہ نے یا نہیں؟" تائی جان نے مجھے ٹھہلانا چاہا۔

"آپ کو پتا تو ہے تائی جان! ان دنوں اسے اپنی اسکن کا کتنا خیال رہتا ہے۔ وہ تو چوہے کے نزدیک بھی نہیں جارہی۔ خیر فائدہ کو چائے کا کہا ہے اس نے۔ باقی ساری چیزیں تو یوں بھی بازار سے

آ رہی ہیں۔ "میں نے آنٹی کا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر دل ہی دل میں خود کو شاباشی دی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ساری عمر یہی کام تو کرنے ہوتے ہیں بچیوں نے۔ یہی دن ہوتے ہیں آرام کرنے کے ماں باپ کے گھر میں۔"

اب کی بار لڑکے کی بھابی نے مسکرا کر بات آئی گئی کر دی اور ہمت بندھانی نظروں سے اپنی ساس کو دیکھا تو میری ہمت جواب دینے لگی۔ یہ دونوں تو نہ جانے کون سی بوٹی سو نگھ کر آئی تھیں کہ مسکراہٹ لبوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی گویا ہر حال میں زمینہ کا رشتہ لے لے رہی چھوڑنا تھا انہوں نے۔

اسی وقت از میر بٹ کھنکھارا۔
"آنٹی! مرزا صاحب نہیں آئے آپ کے ساتھ... انہیں بھی لے آئیں۔"

"بس بیٹا! ان باپ بیٹے کو تو بزنس سے فرصت نہیں ملتی۔ مگر خیر۔ اللہ کوئی نیک سبب بنا دے گا تو ضرور چکر لگائیں گے مرزا صاحب بھی۔" آنٹی مسکرا کر بولیں تو میرے کان کھڑے ہوئے۔
(مرزا صاحب)

"اچھا!..... تو آپ بھی مرزا ہیں۔" میں نے بدقت مسکرا کر پوچھا آنٹی سے تھا اور دیکھا از میر بٹ کی طرف تھا۔ جو سینے پر بازو لپیٹے کھا جانے والی نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میرا دل گہری کھائی میں ڈوب کر ابھرا۔

"جی ہاں..... یہ وہی مرزا ہیں.... صاحبان والے۔" جواب بہت چبا کر مگر بظاہر مسکرا کر از میر نے دیا تو میری بس ہو گئی۔

"کعب بھی یہی کہتا ہے۔" آنٹی ہنسیں تو مجھے رونا آنے لگا فسمے۔ تو یہ کعب عزیز مرزا کے گھر والے ہی تھے۔

یعنی کلہاڑی اٹھا کر نہ صرف میں خود لائی تھی بلکہ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر دے بھی ماری تھی۔

(تو اس روز میرو کے کمرے سے زمینہ خوشی

کے آنسو لیے نکلی تھی)

"اوو وہ... آنٹی ڈر گئیں... آنٹی ڈر گئیں۔" میں نے فوری فیصلہ کر کے تالی بجائی اور جبراً مسکرا کر کہا۔ تو وہ ساس بہو پریشان سی مجھے دیکھنے لگیں۔

"ہماری لڑکی تو ہر فن مولا ہے۔ صبح سے کچن میں کھسی آپ کی خاطر داری کا انتظام ہی تو کر رہی ہے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ میں ابھی بھیجتی ہوں چائے سمیت اسے۔" جلدی سے کہا اور پھر معذرت کرتی تیزی سے باہر کو لپکی مگر دروازے تک پہنچتے ہوئے آنٹی کی دھیمی سی متفکرانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ کی یہ بچی مینٹلی تو ٹھیک ہے نا بہن جی۔"

"لو دسو....." میں نے دانت کچکچائے۔ میں ان کے بیٹے کا ٹانگا فٹ کرنے کی کوشش میں مر رہی تھی (اب مجھے کیا پتا کہ پوری سلامتی ہی غلط لگنے جا رہی ہے۔) اور یہ محترمہ مجھے ہی پاگل کہہ رہی تھیں وہ بھی میرے منگیترا اور ساس کے سامنے۔

"بندہ کم از کم کسی سے کچھ پوچھ ہی لیتا ہے۔" میں نے تو سوچا تمہیں سر پرانزدوں کی۔ "زمینہ مجھ پر الٹ پڑی۔ اس کی مسکراہٹ ہونٹوں کے گوشوں اور آنکھوں کی چمک سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مگر مجھے تو از میر اور اپنی تینوں خواتین کی آنکھوں سے لپکتے شعلے یاد آ رہے تھے۔

زمینہ اندر جا چکی ہے اور میں مسلسل "جل تو جلال تو از میر بٹ کو ٹال تو" کا ورد کر رہی ہوں۔ قارئین میرے لیے غائبانہ ایصال ثواب کر دیجیے گا۔ اگر میرو کی بندوق کا نشانہ خطا ہو گیا تو اگلے کسی ماہ آپ کو اپنی اگلی آپ بیتی بھی ضرور سناؤں گی۔



اتر الیسی

جیسے وہ اس کی آنکھ ہی تو دیکھ رہے تھے۔ زیر لب گالیاں دیتے ہوئے وہ تو اس کی آنکھ پھوڑ دینا چاہتے تھے۔ جو ان کے درمیان سے اپنی گاڑی کو ایسے نکال کر لے گئی تھی کہ خود بھی مرنے والی تھی اور ان کی گاڑیاں بھی الٹ دینے والی تھی۔

گاڑی کی رفتار بڑھی تو اس کے بلونڈ بال ہوا کے ساتھ اوپر کی طرف لہرائے۔ فٹ پاتھ پر چلتے کتنے ہی لوگوں نے کھلی چھت کی کار میں بیٹھی اس لڑکی کو دیکھنا چاہا تھا۔ بہت دور سے ہی اس کی شبیہ بتا رہی تھی کہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ایٹم بم بیٹھا ہوا ہے۔ ایسے چھچھورے لوگوں کو جتنی بھی گالیاں دی

ہدی..... یہ اس کا نام ہے.....
اور اس کی کھلی چھت کی گرے آڈی کار، سگنل کو تقریباً توڑتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے اپنی رفتار کو ہوا سے ملا دینے کو ہے۔ امریکیوں کو کوئی چیز اتنا غصہ نہیں دلاتی، جتنی تیز رفتار گاڑیاں۔ شکاگو کی سڑک پر اس نے اپنی گاڑی کو قابو میں رکھتے ہوئے بے قابو ہو جانے دیا۔ ”گرلز لائیک یو“ کا دایوم تیز کیا۔ بیک ویو مرر میں اس نے سگنل پر بیک لگانے والوں کو منہ بناتے، کھڑکی سے سر باہر نکال کر گالیاں دیتے ہوئے دیکھا۔
مرر میں دیکھ کر ہی اس نے انہیں آنکھ ماری۔

مکمل ناول





جانی چاہئیں، دیکھ کر دینی چاہئیں..... وہ تو بس اسی لیے اسے دیکھنا چاہتے تھے۔

سڑک پر کاروں کو ڈچ کرتے، رفتار بڑھاتے ہوئے، اس نے مرر میں سر کو ذرا سا جھکا کر خود کو دیکھا۔
”واؤ..... کلنگ.....“ اس نے خود پر کمنٹ

پاس کیا۔

گاڑی کی رفتار کچھ ایسی اندوہناک ہو چکی تھی کہ فٹ ہاتھ پر چلتے بچے کے ہاتھ سے غبارہ چھوٹ گیا، آئس کریم گر گئی۔
”سوری کڈ.....“

وہ بہت آگے نکلی آئی تھی، پھر بھی مرر میں دیکھتے ہوئے، ہاتھ لہرا کر بچے سے کہا جو منہ بسور کر آسمان پر

اڑتے غبارے اور زمین پر گری آئس کریم کو دیکھ رہا تھا، بچپن کے غم چھوٹے اور تکلیف بڑی ہوتی ہے۔
بچے کے چہرے کے تاثرات نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

مسکرانے کے لیے اسے بہانوں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پاس سب یقین موجود تھے۔

وہ کیسی بھی اسٹوڈنٹ رہی تھی لیکن کانووکیشن تقریب کو پوری اہمیت دینا چاہتی تھی۔ ایگزمز کا دریا اس نے تیر کر نہیں، جل بھن کر پار کیا تھا۔ دنیا میں چار سیزن موجود تھے، تو دنیا والوں کو پانچواں سیزن ”ایگزما سیزن“ دریافت اور ایجاد کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ سردیوں میں ٹھنڈ لگنے کا ”صرف خطرہ“ رہتا ہے جبکہ ایگزما سیزن میں موت آنے کا امکان عام دنوں سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ چند ایک لائق اسٹوڈنٹس کو چھوڑ کر سب ”فوت نیا“ (موت نمونیا) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہی سیزن جس سیزن میں برے سے برے اسٹوڈنٹ کو منہ لگانا پڑتا ہے کہ کیا پتا وہ ایگزما میں کسی کام ہی آجائے۔

تو ایگزما اس نے کیسے بھی دیے تھے، کانووکیشن کی تفریب کے لیے اس نے ایسے تیاری کی تھی جیسے اقوام عالم کے لیڈر کی حیثیت سے کل عالم

کے سامنے تقریر کرتی تھی۔

اقوام ناکارہ عالم کی لیڈر..... پدی..... کی آڈیو نیورسٹی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کی گاڑی سے کچھ اسٹوڈنٹس بس ہلاک ہوتے ہوتے بچے تھے۔ انہیں سویری کہتے ہوئے وہ پارکنگ میں کار کو پارک کر چکی تھی۔ ڈلیش بورڈ سے مرر نکال کر اس نے ہاتھ میں لیا، اور سب سے پہلے اپنے بال سیٹ کیے۔ کار سے باہر نکل کر، گلاسز اتار کر لپ کلوں کا ایک کوڈ کیا۔ مرر کو کار کی سیٹ پر اچھال دیا۔ اس کے موبائل پر اس کی فرینڈز کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال پک کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

ڈائر کی پنک فرائ کی دونوں پاکٹس میں اس نے اپنے ہاتھ ڈالے۔ خود کو، اپنی چال کو، ڈائر کے

ڈریس کے مطابق کوڈ کیا۔ ہر لباس کی ایک چال ہوتی ہے۔ ڈائر کے ہر ڈریس کی چال ”شاہانہ“ تھی اور وہ ہر چال پر قادر تھی۔ فرائ کی پشت، وی شپ میں کمر تک کھلی تھی۔ اس وی میں بیک نیک نیپلس کی لمبی چین ہلکورے لے رہی تھی۔ جس کے آخری کنارے لگا سفید پنڈولم اس کی چال کے ساتھ ساتھ ڈول رہا تھا۔

کمر اور شانوں کو سیدھا رکھ کر، ٹھوڑی اور چہرے کو غیر محسوس خم دیتے ہوئے، اونچی ایڑی کے جوتوں میں مقید اپنے پیروں کو اس نے روش کی سمت بڑھا دیا۔ دھوپ میں چمکتا اس کے بالوں کا ملا جلا گہرا سنہرا رنگ، آنکھوں پر رکھے گلاسز، نئی ہوئی گردن اور اٹھی ہوئی ٹھوڑی۔ وہ حسن اور فیشن کی دنیا میں راج کرنے کے لیے بے تاج بنی تھی۔

ہیل کی ٹک ٹک روش پر سنائی دے رہی تھی۔ راستے میں آنے والا ہر اسٹوڈنٹ ترچھی یا ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھنے کی کوشش یا جسارت کر رہا تھا کہ دیکھ بھی لیا جائے اور پکڑا بھی نہ جائے۔ وہ اکیلی ہی یونیورسٹی میں خوب صورت لڑکی نہیں تھی، لیکن وہ اکیلی ہی اتنی پاپولر اور فیشن ایبل تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی تھی، نہ ہی اس کے استعمال کے طریقوں کی۔

اس کے فیشن ٹرینڈز سے انپائر ہے۔ آج کی انشا
اسٹوری تو آگ لگا دینے والی تھی.....
”ہیلو ہڈی.....“ اس کا کلاس فیلو لائم اس آگ
سے جھلنے آیا تھا۔ پیچھے سے تو وہ بھاگتا ہوا آیا تھا لیکن
اس کے قریب آ کر ایسی نارمل چال چلنے لگا تھا جیسے چلتے
چلتے اس پر نظر پڑ گئی، تو سوچا ہائے کہہ دوں۔
”ہائے.....“ اس نے پاکٹس میں سے ہاتھ نہیں
نکالے تھے۔ سن گلاسز بھی نہیں اتارے تھے۔ مطلب
ہائے کر لیا ہے، اب آگے دفع ہو جاؤ۔ تم اگر تھوڑے
بہت ضروری تھے بھی تو صرف ایگزامز تک۔ اب تو
تمہارا نام یاد کرنے میں پانچ منٹ لگیں گے اور پھر بھی
چھٹے منٹ میں ”ہودا ہیل از ہی۔“ ہی نکلے گا۔
”تمہیں بیک سے دیکھا تو ایسا لگا جیسے کیلی جینر
جاری ہے۔ پھر سوچا اس کا ہماری یونیورسٹی میں کیا
کام۔ بلکہ کسی بھی یونیورسٹی میں کیا کام..... ویسے تمہارا

ساری یونیورسٹی جانتی تھی کہ وہ اور اس کے گروپ
کی ہر لڑکی یونیورسٹی صرف اس لیے آتی ہے تاکہ وہ اپنا
آپ دکھا سکے۔ ان جیسا ٹرینڈ سیلنگ فیشن کر کے گھر
میں بیٹھنا کون پسند کرے گا؟ اس لیے وہ گھر نہیں بیٹھتی
تھی، اپنی نمائش کرتی رہتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے یا
ڈگری لینے سے کیا مطلب ہو سکتا تھا بھلا۔ نہ اسے
جاب کرنا تھی نہ اسکا لرشپ لینا تھا۔ نہ ہی یونیورسٹی ڈین
سے شانے پر پھکی اور ویل ڈن کی سرگوشی..... ہو..... ایسا
تو مذاق بھی نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔

اگر پیسہ زندگی کا مسئلہ تھا تو یہ مسئلہ اس کے
والدین حل کر چکے تھے۔ اگر زندہ رہنے کے لیے کسی
کرئیر کا ہونا ضروری ہے تو وہ یہ کرئیر بھی حاصل کر
چکی تھی۔ ”انجوائے منٹ کرئیر“۔ ابھی وہ صرف
بائیس سال کی تھی اور اس نے آدھی دنیا کو اپنے آگے
لگا لیا تھا، باقی کی دنیا کو وہ اپنے پیچھے رکھتی تھی..... جو
بچ جاتی تھی، اسے جوتی کی نوک پر۔

پھر اس کی زندگی کے مقاصد کیا ہو سکتے تھے
بھلا؟ ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان بننا؟ یہ سب اسے
پھر کے زمانے کی باتیں لگتی تھیں۔ جب اڑانے کے
لیے پیسہ موجود تھا تو اس پیسے کو ”کمانے“ کی کیا ضرورت
تھی۔ زندگی محفل کی سیج تھی تو اس پر ”مقصد“ کے
ٹاٹ کا پیوند لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

پاکٹس میں ہاتھ دیے بچ جانے والی دنیا کو ہیل
کی نوک سے مسلتے ہوئے وہ چل رہی تھی۔ اس کی آئی
کانک چال، انداز، اٹھان، نے اسے اتنا نمایاں کر
دیا تھا کہ دنیا کی ہر شے چھپ کر رہ گئی تھی۔ اس
ڈریس کا آرڈر اس نے سب سے پہلے دیا تھا۔ اہل
کلونی سے بھی پہلے۔ وہ تو عام دنوں میں ایسے ڈریس
پہن کر آتی تھی کہ جب وہ انشا اسٹوری شیئر کرتی تھی
تو چند دنوں بعد کوئی نہ کوئی سلبرمیٹی اس کی کاپی کرنی
ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

ایک بار نیوز پیپر میں آرٹیکل بھی آیا تھا کہ شو بز
ایکٹریس انشا اشار ”ہڈی“ کو فالو کر رہی ہیں۔ اور

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی مشال

رخسانہ نگار عدنان

مکمل ناول کتابی شکل
میں شائع ہو گیا ہے



قیمت - 500/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

بھی اس یونیورسٹی میں کیا کام؟ کیا کرتی رہی ہوتی
یہاں؟“ وہ آگے دفع نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے
ہوئے، اپنے ذلیل ہونے کے اہتمام کرنے لگا تھا۔
چلتے چلتے وہ ایک دم سے رکی۔ پاکٹ میں

سے ایک ہاتھ نکالا اور سن گلاسز اتار لیے۔
”کیلی جینر..... تم نے مجھے کیلی کہا؟“ اس کی
دلکش آنکھوں میں تندہی سمٹ آئی۔ ”ہو..... کیلی؟ وہ
سرجریوں کی دکان..... بے ہودہ چوڑی..... تمہیں لگا
وہ میں ہوں؟“ اس کا اتنا اچھا دن، ایسے برے
انسان کے منہ لگ کر خراب ہونے والا تھا۔

”اس کا باپ مرغا، ماں مرغی اور وہ خود چوڑی
ہے؟ اپنی وے! اس کی شہرت نے آگ لگا رکھی
ہے۔ مطلب ہر طرف..... اور پیاری بھی بہت ہے
وہ۔“ لائم..... شروع میں تو تھوڑا سا سہم گیا تھا۔
”پیری؟ مائی فٹ..... مجھے گالی دے دینا،
کبھی اس سے میچ نہ کرنا۔“ ہونٹوں کو بھیج کر اس نے
خود کو گالی دینے سے روکا۔

”اس مہینے وہ ٹائمز کے کور پر بھی آئی ہے۔ دنیا
کی سب سے کم عمر، امیر ترین بزنس گرل کی، دی کیلی
جینر۔ اتنی سی عمر میں اس نے کتنا کچھ کما لیا ہے۔ تم
نے بھی تو اتنی سی عمر میں ”کافی“ کچھ کر لیا ہے۔ مجھے
لگا، تم اسے پسند کرتی ہو۔ تمہاری حرکتیں بھی اس سے
میچ کرتی ہیں۔ پھر اس کے نام سے چڑیں کیوں؟“
پہلے وہ سہم رہا تھا۔ اب شیر ہو رہا تھا۔

”میں اپنی صحت کا خیال رکھوں یا نہ رکھوں، اپنے
ٹیسٹ کا ضرور رکھتی ہوں۔ تھوڑا خیال تم بھی رکھو اور
مجھے گھورنا بند کر کے سامنے دیکھ کر چلو۔ میری ہیل سے
الچھ کر گرے تو کچھ کہہ نہیں سکتی کہ ہاسپٹل کے بیڈ سے
اٹھو گے، یا مردہ ہو کر تابوت سے.....“ سن گلاسز اس
نے واپس اپنی آنکھوں پر لگائے اور چلنے لگی۔

”آں..... گرا دو..... گرا دو..... لیکن کیا ہی اچھا
ہو جو دم تمہاری بانہوں میں نکلے۔ اوہ! غصہ نہ کرو۔ ذرا
یاد کرو میں تمہارا کلاس فیلو ہوں۔ پیچانو مجھے۔“
”پیچان لیا ہے۔ اپنی طرح کے سکی اسٹوڈنٹس

کے رابن ہڈ ہوتی..... خبیث.....“

”کیا کہا..... رابن ہڈ؟ تم رابن کا نام جانتی ہو؟
واؤ! میں تو تمہیں بالکل ہی جاہل سمجھتا تھا۔ یعنی کتاب
وغیرہ جیسی چیزیں پڑھ لیتی ہو اور آخہ! خبیث.....
تمہارے منہ سے نکلا تو یہ بھی فیشن ہیل، آئی کانک
ہو گیا..... کلنگ.....“ اس نے ریپ سگر کی طرح ہاتھ
سے ہوا کو کاٹتے، گھٹنے ٹیڑھے کرتے ہوئے کہا۔

”ذلیل..... کمینے..... خبیث..... یہ تینوں
ایک ساتھ کیسے لگے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ ”سپر آئی
کانک؟“ ابرو اوپر اٹھ چکی تھی۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ”سب ٹھیک کہتے ہیں، تم
سے بات کر کے مزا آ جاتا ہے۔ پارٹیز وغیرہ میں
سننے سنانے کے لیے دو تین لطفیے ہاتھ آ جاتے ہیں۔
افسوس یونیورسٹی کے یہ سال اتنی جلدی گزر گئے۔
ویسے تم جیسی سپر اسٹار اسٹوڈنٹس نے ہم جیسے سپر
کنگال اسٹوڈنٹس کو ڈائریوں میں لکھنے کے لیے اتنا
مواد دے دیا ہے کہ اگر ہم ان ڈائریوں کی کتابیں
چھوا لیں تو وہ بیسٹ سیلر ہوں، موویز بنوا لیں تو وہ
آسکر وننگ ہوں۔“

”اور اگر تم انہیں اپنے تھوپڑوں پر سجا لو تو عالمی
منڈیوں میں تمہاری ”سپر نیلامیاں“ ہوں۔“
”ہا ہا ہا..... دیکھا، کیسی پیاری باتیں کرتی ہوتی۔
تمہیں کیا پتا، ہم تمہیں کتنا یاد کرنے والے ہیں۔ اگر
میرے بس میں ہو تو میں تمہارا ایک عدد مجسمہ بنوا کر اپنے
کمرے میں رکھوا لوں۔ جب جب بور ہونے لگوں،
تب تب تمہارے منہ لگ جایا۔ میرا مطلب تمہارے منہ
سے کھری کھری سن لیا کروں۔“

چلتے چلتے اسے پھر سے رک جانا پڑا۔ لائم زیر
لب ہنس دیا۔ وہ اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ
رہا تھا۔ اسے اور سرخ کرنے کے لیے اس نے ہاتھ
بڑھا کر اس کی آنکھوں سے گلاسز اتار لیے۔

”کافی مہنگے لگتے ہیں، کہاں سے لیے۔ اوہ
اچھا..... لیے نہیں بلکہ بنوائی ہیں۔ signature
ہے یہ بھی۔“

”تمہیں میں عجیب لگتی ہوں؟؟“ لائم کی ہاتھ بڑھا کر گلاسز اتارنے والی جرات اسے نظر انداز کرنی پڑی۔

”ناں..... لگتی تو تم مجھے بہت پیاری ہو لیکن لوگ کہتے ہیں کہ تم عجوبہ ہو..... نمونہ..... ڈالرز اور یارو کا مجسمہ آزادی..... امریکا کو تم پر فخر ہے..... مجھے بھی تم پر فخر ہے میری بچی.....“ اس نے اس کا شانہ چھپھپھایا۔

”تو اپنی غربت کا بدلہ تم مجھ پر طنز کر کے نکال رہے ہو۔ کیا وجہ ہے کہ سب غریبوں کو غریب ہونے کے فوائد رٹے ہوئے ہوتے ہیں، پھر بھی وہ امیر ہونے کی کوشش کرتے ہیں؟“

وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ اب اس نے ہاتھ بڑھا کر لائم کی آنکھوں سے آئی گلاسز اتار لیے تھے۔ حقارت سے اس سستی، گھٹیا سی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ غریبوں کی ہر چیز بری ہوتی ہے۔

”کارآمد امیر ہونے اور ناکارہ امیر ہونے میں فرق ہوتا ہے ہڈی! اب بل کیٹس کو ہی دیکھ لو۔“

”بل سے نکلے ہوئے چوہے کو دیکھ رہی ہوں۔ کم سے کم آج کے دن تو شرٹ چھینج کر لیتے۔ پارٹ ٹائم جابس کر کر کے تمہاری شکل پر بارہ نچ چکے ہیں۔ ان بارہ ہندسوں کی پھنکار تمہارے چہرے سے ہر سیکنڈ، ہر منٹ ٹک ٹک کرتی برس رہی ہے۔ بارہ سال کی بیوی سیلون میں بیٹھے رہے تو بھی شکل سے یہ پھنکار غائب ہونے والی نہیں ہے۔“

”میں یہ پھنکار غائب کرنا بھی کیوں چاہوں گا؟ مجھے فخر ہے کہ.....“

”مجھے فخر ہے کہ تم جیسے لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ مجھ سے جڑتے ہیں لیکن پھر بھی تم جیسے لوگ ”مجھ جیسا“ ہی بننا چاہتے ہیں۔ کیا میں غلط ہوں؟“

”تم غرق ہو، خوش فہمی کے سمندر اور غلط فہمی کے چھپر میں۔“

”فکر نہ کرو، مجھے سوئمنگ آتی ہے۔ خوش فہمی کا

سمندر اور غلط فہمی کا چھپر..... میں تیر کر پار کر لوں گی۔“

”اور پھر خود پسندی کے کٹر میں جا کر دو گی؟ کیا میں غلط ہوں۔“ اب وہ پوچھ رہا تھا۔

اس کی لمبی گردن کی رکیں تن گئیں۔ غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں اس کی سانس کا ردھم ذرا سا تیز ہوا۔ لائم دیکھ سکتا تھا کہ اس نے ڈائنامائٹ کے ریگولیٹر کو چھیر دیا ہے۔ اگر یہ ڈائنامائٹ پھٹا تو عالمی جنگ چھڑ جائے گی۔

”تم نے دو سال کے عرصے میں مجھ سے اتنی باتیں نہیں کیں، جتنی ان دو منٹوں میں کر لی ہیں۔ اس دو منٹ کی بات کے لیے تم نے دو سال ریہرسل کی ہوگی۔ آسان نہیں ہوتا مجھ جیسی لڑکی کو اپروچ کر کے بات کرنا۔“

”واقعی آسان تو نہیں تھا، یہی دیکھ لو کہ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا ہے۔ تمہارا کیا ہے، تمہارا گزارا تو اب تک دماغ کے بغیر ہوتا ہی آیا ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ اپنے بچوں کو سنانے کے لیے میرے ہاتھ اچھی کہانیاں لگی ہیں۔“

”اچھا..... مثلاً کیسی کہانیاں؟“

”میرے پیارے بچوں! تمہارے باپ کی یونیورسٹی میں ایک لڑکی ہوئی تھی۔ ہڈی..... میری کلاس بھی فیلو تھی۔ وہ اتنی امیر تھی، اتنی امیر تھی، کہ بد نصیب تھی۔“

”بد نصیب اور میں؟ کیسے.....؟“ اس کے ڈائنامائٹ کا پارہ اوپر جا رہا تھا۔ مس عالم سے، عالمی جنگ کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔

”جسے سب کچھ پلیٹ میں سجا سجا یا مل جائے، جسے کسی بھی چیز کے لیے کوئی کوشش نہ کرنی پڑے۔ زندگی جس کے لیے اسٹراہیری کیک کی طرح ہو۔ وقت جس کے لیے چاکلیٹ ٹیک کی طرح ہو۔ جس انسان کا مقصد شاپنگ کرنا، پیسوں کو اجاڑنا، گھومنا پھرنا، فیشن کرنا ہو..... ایسا انسان بد نصیب نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟“

اس نے قہقہہ لگایا۔ لائم کے ہاتھ سے اپنے گلاسز جھکے سے واپس لیے اور آنکھوں پر لگائے۔

”مجھے بد نصیب کہنے اور ماننے کے باوجود تم پوری شدت سے یہ خواہش کرتے ہو کہ کاش یہ بد نصیب انسان تم ہوتے۔ کاش میری جگہ تم ہوتے، یہ اسٹرابیری کیک کھانے کے لیے تمہیں ملتا۔ چاکلیٹ شیک تم پی رہے ہوتے۔“ کہہ کر وہ چند سیکنڈ تک اسے دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ گئی۔

”دولت مند ہونا اگر گناہ ہے تو ہر شخص گناہ گار ہونا چاہتا ہے۔“

لائم کے آئی گلاسز روش پر پھینک کر جاتے ہوئے وہ یہ جملہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔
روش پر اس کی ہیل کی ٹک ٹک ”زندگی“ کے شور کو دبا رہی تھی۔

حقیقی زندگی، اس کی مجازی زندگی سے بہت پیار کرتی تھی، اسی لیے جلد ہی اسے موت سے روشناس کروانے والی تھی۔

☆☆☆

وہ کانووکیشن لان میں آئی تو ادھر ادھر کھڑے تقریباً ہر اسٹوڈنٹ کی گردن ایک سیکنڈ کے لیے اس کی طرف گھوم گئی تھی۔ وہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ سب اسے دیکھ رہے ہیں۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے پوری طرح سے کھا، پی چکے تھے۔ لڑکیاں ایک ایک چیز کی قیمت کا حساب لگا چکی تھیں اور یہ جان چکی تھیں کہ وہ کتنی مہنگی تھی۔ اتنی مہنگی کہ انہوں نے اپنی ساری کمائی، پوری بچت اڑادی تو بھی وہ اس مہنگائی کو پاٹ نہیں سکیں گی۔

دور دور سے گھورنے والوں کو اس نے پاکٹ سے ہاتھ نکال کر، لہرا کر ”ہائے“ کہا۔ ویسے تو وہ صرف منہ دھو کر بھی آ جاتی تو بھی وہاں موجود بہت سے لوگوں سے زیادہ خوب صورت لگتی، لیکن چونکہ وہ اچھی طرح سے تیار ہو کر آئی تھی تو بہت سے لوگوں کے دلوں پر بجلی گرا رہی تھی۔ وہ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ بس یہ بجلیاں سہنے کے لیے ہی بنے ہیں۔ وہ انہیں گھاس ڈالے گی نہ دانہ..... جیسے ایما والسن کے وال پیپر لیپ ٹاپ کی اسکرین پر لگا لینے سے ایما فون کر کے ڈنر پر انویٹ نہیں کرنی، ایسے ہی چپکے چپکے

اس کی تصویریں کھینچ کر موبائل میں محفوظ کر لینے پر بھی وہ کسی کو ”شام کی چائے“ پر بلا نے والی نہیں تھی۔ وہ مسکرائی اور ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا۔
”دن روشن ہے..... اچھا ہی ہے..... میں بھی تو خوش ہوں۔“

اس نے دن پر رائے دی۔ دن کی روشنی سے ہائے ہیلو کیا۔ ”میں بھی تو خوش ہوں“، اس نے ایسے کہا جیسے باقی وقت وہ روتی دھوتی رہتی ہے۔ ایک ایک پنی کے لیے جان توڑ محنت کرتی پھرئی ہے۔ زندگی کے دکھوں کو حوصلے کے پہاڑ سے جھیلتی ہے۔ وہ بے چاری کتنی افسردہ رہتی ہے نا۔

کانووکیشن کی تقریب سے پہلے ان فرینڈز کو فوٹو شوٹ کروانا تھا۔ ان کا گروپ اسپاٹس گرلز کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اسے اس گندے، فرسودہ سے نام سے نفرت تھی لیکن یہ بہر حال کارڈیشن سے بہتر تھا۔ اسے کارڈیشن کلون سے ویسی ہی چڑھتی، جیسی امریکا کوروس کے خود سے پہلے خلاء میں چلے جانے سے تھی۔

جب وہ فوٹو شوٹ کروا رہی تھیں تو ان کے کلاس فیلوز انہیں ”ناقابل برداشت ہو تم“ کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ یونیورسٹی میں جتنی مشہور تھیں، اتنی ہی ناپسند بھی کی جاتی تھیں۔ وہ پانی کی طرح پیسہ بہانی تھیں۔ اندھی ہو کر فیشن کی تقلید کرتی تھیں۔ ان کے انشا گرام کسی بھی ہالی وڈ اسٹار سے زیادہ فالو کیے جا رہے تھے۔ ان کے نت نئے فیشن ٹرینڈ کا حصہ بن رہے تھے۔ وہ باغی نہیں تھیں، لیکن وہ نارمل بھی نہیں تھیں۔

ہر عقل مند ہوش مند سمجھ دار اسٹوڈنٹ انہیں دیکھ کر منہ بنا لیتا تھا۔ وہ سب عقل سے عاری، سمجھ بوجھ سے بہری، کام کی باتوں سے گونگی تھیں۔ چلتی پھرتی فیشن کی دکانیں تھیں۔ کبھی کبھی ان کا دل چاہتا تھا کہ پلاسٹک کی ان گڑیوں کے ہاتھ، پیر، گردن، سب الگ الگ کر کے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیں اور اس ڈسٹ بن کا کوڑا، ”بہر مردار“ میں پھینکوا دیں۔
ہر یونیورسٹی، کالج، اسکول میں ایک ایسا

گروپ ضرور ہوتا ہے جس کی حرکتوں سے سارا سسٹم ڈسٹرب رہتا ہے۔ وہ گروپ چھپورا نالائق نکما اور بھونڈا ہوتا ہے۔

ان کا گروپ وہی گروپ تھا۔ ہدیٰ اس گروپ کی لیڈر تھی۔ وہ عام نہیں تھی۔ اسی لیے بہت خاص لائف گزار رہی تھی۔ دولت کماتا شاید مشکل ہوتا ہوگا، لیکن اس کو اجاڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایک دماغ سے عاری جسم..... ایک حسوں سے عاری بے حسی کا سسٹم..... بس..... سب تباہ..... دولت ہو یا زندگی..... وقت ہو یا مقصد۔

وہ پوز مار مار کر نہیں تھکی تھیں، انہیں پوز مار تے دیکھ کر باقی کے اسٹوڈنٹس تھک گئے تھے۔ ان کا فوٹو شوٹ مکمل ہوا تو انہوں نے چند کلاس فیلوز کو بھی اس قابل سمجھا تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک فوٹو لے لیں۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے کوٹ اور کیپ پہن لیں۔ کانوکیشن تقریب شروع ہو چکی تھی۔ انہیں ڈگری، تقریروں، ڈین، پروفیسرز، فوجی پلاننگ وغیرہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی بھلا..... وہ جمائیاں لے رہی تھیں۔

”یو آر آسٹار آف دا ڈے.....“

اس نے ایک کلاس فیلو کے ساتھ سیلفی لی تو اس نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔ اسے بھی مسکراتا پڑا۔ کوشش کے باوجود اس کی کسی اور کلاس فیلو سے دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بد اخلاق نہیں تھی، لیکن اگر کوئی اپنے پیسے کی اتنی زیادہ نمائش کرتا پھرے گا تو پھر وہ بد اخلاق ہو یا نہ ہو مغرور ضرور مشہور ہو جائے گا۔ اگر عام انسانوں کے قریب ہونا ہے تو ان جیسا ہونا ہوگا..... ان جیسا عام.....

دنیا میں عام لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، جو واقعی خاص ہوتے ہیں وہ دوسروں کی طرح عام بن کر رہتے ہیں۔ وہ اپنے اندر یہ عظمت پیدا کر لیتی، اگر سے ضرورت محسوس ہوتی..... اس نے بھی کسی ٹیچر، پروفیسر سے بد تمیزی نہیں کی تھی، لیکن اس کے فیس ’ڈونٹ یو ڈائیر ٹو‘ (مجھے چھیڑنے کی جرات نہ

کرنا)“ اتنا واضح لکھا ہوا ہوتا تھا کہ وہ خاموش بھی رہتی تھی تو لگتا تھا بد تمیزی کر رہی ہے۔

انہیں ڈگریاں مل گئیں۔ ماما پاپا تقریب اسٹینڈ کر کے، اسے گلے سے لگا کر جا چکے تھے۔ اب وہ سب سیڑھیوں پر اوپر نیچے کھڑے تھے۔ یونیورسٹی کی بلند عمارت ان کی پشت پر تھی۔ ان کے سامنے ایک، دو، تین نہیں، پورے تیرہ فوٹو گرافرز اپنے کیمرے اسٹینڈ اسٹلکس پر ٹکا کر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ ہدیٰ کا ہی کمال تھا کہ اس نے کانوکیشن تقریب کو ”فٹ بال ورلڈ کپ فائنل“ کی شکل دے دی تھی۔ اور شہر کے ٹاپ اور مہنگے فوٹو گرافرز کو کلاس اور پروفیسرز کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا انہوں نے ڈگریاں نہیں لیں، فرانس کو ہرا کر، برازیل کو کک مار کر، فیفا ورلڈ کپ ٹرائی جیت لی ہے۔ فوٹو گرافرز انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ ساری کلاس، پروفیسرز سمیت شرافت سے ان کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ گلے میں گولڈ میڈل پہنے پروفیسر کے ساتھ کھڑا لائٹ اس ساری صورت حال پر چھوٹا سا قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”ایسے لوگوں کی وجہ سے دنیا میں رونق رہتی ہے ویسے.....“ اس نے اپنے دوست کے کان میں کہا۔ وہ ہدیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”خالی خولی رونق؟ نہیں میرے دوست..... تماشا..... ڈرامے..... ہنگامے..... مضحکہ خیزیاں کہو۔ یہ نہ ہوں تو ہم جیسے لوگ پڑھ پڑھ کر سنگی ہو جائیں اور ہمیں مسکرا نے کے لیے کوئی وجہ نہ ملے۔“

”بائی داوے..... لگتی بہت پیاری ہے یہ.....“

”نظریں پھیر لو میرے دوست! فوراً نظریں پھیر لو..... تم اس پر ذرا سا بھی کرش افورڈ نہیں کر سکتے۔ اپنی اوقات سے باہر چیزوں کو خوب صورت نہ کہو، ورنہ تمہاری زندگی خوب صورت جہنم بن جائے گی۔ تم نے اس کے قدموں میں جان بھی دے دی تو بھی یہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گی۔ یہ جو گلے میں گولڈ میڈل پہنا ہے اس کا کچھ خیال کرو، اور ہدیٰ

کے خیال کو دل سے اتار پھینکو۔“

لائم نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔ ہڈی نے گردن موڑ کر اسے گھور کر دیکھا تو وہ اسے آنکھ مارے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یو آر آ اشار آف مائی لائف، مائی چائلڈ۔“
ہونٹوں سے پچکارا بھی۔

اشار آف ہر لائف نے نفرت سے نظریں پھیر لیں۔ وہ مزید اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اسٹینڈ بائی..... میں تھری کہوں تو سب اپنی ٹوپیاں اچھالیں۔ آپ کی مسکراہٹیں نمایاں اور دلکش ہوں.....“ ہیڈ فوٹو گرافر نے انہیں ہدایات دیں۔ وہ وہی سرکس مین لگ رہا تھا، جو چھوٹی سی اسٹک لہرا لہرا کر جانوروں کو ہدایات دیتا ہے۔

”ٹھیک ہے جناب.....“ فرماں بردار بچوں کی طرح، کچھ ہڈی کو چڑانے کے لیے، کچھ ماحول سے محفوظ ہوتے ہوئے سب نے ایک ساتھ گردنیں اوپر نیچے کر کے کہا۔ فوٹو گرافر ہنس دیے۔ لائم کا قہقہہ ذرا زیادہ بلند تھا۔

”ون..... ٹو.....“ ہاتھ اٹھا کر، دو انگلیاں کھڑی کرتے ہوئے فوٹو گرافر نے کہا۔

اور تھری پر ساری کلاس نے پوری یونیورسٹی نے، ساری دنیا نے اپنی ٹوپیاں اچھال دیں۔ نیلے آسمان کے نیچے، روشن دن کی آغوش میں۔ وہ خود بھی اچھلے، ہڈی نے بھی اپنی ٹوپیاں اچھالی۔ اس کا سر اوپر اٹھا، نظر آسمان تک گئی اور وہ نظر آسمان تک ہی رہ گئی۔ خود وہ لہرا کر لڑکھرائی، اوپر سے نیچے گری، تیسری سے دوسری اور پھر پہلی سیڑھی تک آئی۔

وہ ایسے ایک دم سے گری کہ سب اپنا آپ بھول کر جلدی سے اس کی طرف لپکے۔ جوشیلے نعرے، صدیائی چیخوں میں بدل گئے۔ اس کی کیپ دُور جا گری تھی۔ اس کا سر زمین سے جا ٹکرایا تھا۔ خون کی ایک پتلی لکیر اس کی پیشانی سے نکل کر سفید گال پر نشان چھوڑنے لگی تھی۔ اس نے آسمان کی چھت کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا اور اس کی آنکھیں

بند ہونے لگیں۔

یہ آنکھیں کھلیں گی تو وہ جان جائے گی۔ جان جائے گی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا، نہ دنیا، نہ لوگ، نہ وہ خود اور نہ ہی..... زندگی.....

زندگی کی سانسوں کی تعداد مقرر ہوئی۔ زندگی نے ہمیشہ ”ساتھ“ رہنے کا وعدہ عین بہار میں توڑ دیا۔ ایک بیماری نے سب کچھ بدل دیا۔ زندگی نے اس کے پیروں تلے سے محملی قالین ہینچ لیا۔

☆☆☆

ابتدائی طبی امداد کے بعد وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے ساری کلاس کے ساتھ اپنا فوٹو شوٹ مکمل کر دیا تھا۔ ٹوپیاں کو پھر سے اچھال دیا تھا۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ اس کی پیشانی پر ایک عدد بینڈ تاج لگی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اپنی ساری خوب صورتی کے ساتھ وہ تھوڑی سی مرجھائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اسے ساری کلاس، سارے جہاں کی نظر لگ گئی تھی۔

”کلاس کے مجھ جیسے غریب غریبا را بن ہڈزل کر تم جیسے شریف لوگوں کو لچ پر بلارہے ہیں۔ ہمیں شرف ملاقات بخشیں گی؟“ دودن بعد اسے لائم کی کال آئی تھی۔

اسے ہنسی آ گئی، نجانے کیسے۔ ”ہم سب فرینڈز کو بلارہے ہو؟“

”بالکل! میرے دادا کنڑی سائیڈ رہتے ہیں۔ قصبے والوں کا کہنا ہے کہ عرصہ ہوا، انہوں نے سرکس نہیں دیکھی..... تو.....“

اس نے دانت تو پیسے لیکن فون نہیں پٹھا۔ ”اپنے دادا کو تم نے بھی اپنا تماشا نہیں دکھایا؟“ ”دکھایا تھا، کہنے لگے، بندروں کا تماشا دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں، اب.....“

”خبردار جو تم نے مجھے لومڑی کہا۔“ وہ چلا اٹھی۔ ”پر میں تو تمہیں پری کہنے والا تھا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن پھر قہقہہ لگا دیا۔

لائم کے دادا کا قصبہ، قصبے کا جنگل اور جنگل کا ماحول اچھا تھا۔ وہ سب مل کر لکڑیوں پر کھانا پکاتے رہے

لائم نے اس کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔ ”جسٹ فار آ چینج“ وہ اس کے بلانے پر چلی گئی تھی اور اس تبدیلی کو پسند کر رہی تھی۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے جس وقت وہ گیارہ لوگ جنگل میں دوڑ لگا رہے تھے۔ وہ ایسی پیچھے بھی نہیں تھی اور زیادہ آگے بھی نہیں تھی لیکن جب وہ گھائی سے گری تو اس کا رول ہوتا جسم آگے نکل جانے والوں سے بھی آگے نکل گیا۔ وہ پھر سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

اسے ہوش آیا تو سب اسے فکر مندی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔“ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا جسم آف ہو کر آں ہوا ہے۔ جیسے جلتے چراغ پر کسی نے پھونک مار دی تھی۔

”نہیں..... تمہارا پاؤں نہیں پھسلا تھا، تم نے اپنا توازن کھو دیا تھا۔ تم نے کیا محسوس کیا تھا؟“ لائم نے فکر مندی سے پوچھا۔

”میرا پاؤں ہی پھسلا تھا۔“ اسے یاد ہی نہیں تھا کہ اس نے کیا محسوس کیا تھا۔ اندھیرا..... بس..... گھر واپسی پر وہ ڈرائیو وے میں گاڑی کا روازہ بند کرتے ہوئے گر گئی تھی۔ ماما لپک کر اس کی طرف آئیں۔ وہ ”ماما“ پاپاتینوں سال میں دوبار اپنا بیڈ یکل چیک اپ کرواتے تھے۔ ابھی تین مہینے پہلے اس کا مکمل میڈیکل چیک اپ ہوا تھا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے جسم میں کوئی معمولی سی بیماری بھی ہوتی اور اسے معلوم نہ ہوتا۔ ماما نے کہا کہ وہ پھر سے ایک بار چیک اپ کروالے تو اس نے ماما نے اچکا کر بے زاری سے کہا۔

”میں بورا بورا جا رہی ہوں..... اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔“

”پھر ایک لائٹ چیک اپ کے لیے میرے ہاتھ چلو۔ ایک بار ڈاکٹر سے مل لو۔“

”ڈاکٹر سے آپ جا کر مل لیں، میرا ہائے کہہ دیجئے گا۔“

”ہڈی..... یہ لا پرواہی ہے۔“

”ماما! یہ بے جا پابندی ہے۔ مجھے نفرت ہے ڈاکٹروں کی شکلوں سے۔ ہنستے بھی ہیں تو ایسا لگتا ہے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”تمہارے فیس پر ایک پمپل بھی نکل آئے تو تم ان ہی مذاق اڑانے والے ڈاکٹروں کے پاس بھاگتی ہو۔“

”پمپل نکلا تو چلی جاؤں گی۔ ڈن۔“ اس نے ماں کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

بورا بورا جانے سے پہلے، گروپ کی فرینڈ کی پارٹی میں، اپنے اپنے گلاس اٹھا کر چیئر نہ کہتے، اس کا دماغ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ وہ لہرائی اور اپنے ہاتھ سے گر کر ٹوٹے گلاس کی کرچیوں پر ڈھیر ہو گئی۔ اس بار اسے فوراً ہوش نہیں آیا تھا۔ اس بار وہ ابتدائی طبی امداد پر اٹھ کر کھڑی نہیں ہو گئی تھی۔

اس بار اسے سولہ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل کے بیڈ پر تھی۔ اسے لگا کہ وہ کئی سال سوتی رہی ہے۔ اب جاگی ہے تو کسی اور کے جسم میں جاگی ہے۔ اس کے جسم کی زبان بدل چکی تھی۔

ماما، پاپا دونوں اس کے بیڈ کے قریب چیئرز گھسیٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی ماں کو کبھی رونے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اب کہیں وہ رونی رہی تھی تو بہت عجیب لگ رہی تھی۔ اس کی پہلی نظر ماں پر ہی اٹھی تھی۔ پہلی نظر نے ہی اسے چونکا دیا تھا۔ ماں سے اس اندوہ کی وجہ پوچھنے کے لیے اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔

”ہڈی! میری ہڈی۔“ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ جلدی سے لپک کر اس کے قریب آ گئیں۔ سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ یہ انہوں نے کس انداز میں ”میری ہڈی“ کہا تھا۔ پاپا کو کھڑا ہونے میں وقت لگا تھا۔ ان کا کیکپاتا ہوا ہاتھ ہڈی کے ہاتھ پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ بہت کچھ کہنے کی کیفیت میں، وہ کچھ بول ہی نہیں سکے۔

دونوں کے انداز و اطوار بدلے ہوئے تھے۔
دونوں نے شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ وہ کالج یونیورسٹی
کی اپورٹج اسٹوڈنٹ رہی تھی۔ اس نے کبھی اچھے
مارکس نہیں لیے تھے۔ کتابیں اسے پسند نہیں تھیں۔
ذہانت سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی ماں
باپ کے انداز نے اس کی ساری حسیں جگادی تھیں۔ وہ
پوری کی پوری بیدار ہو گئی تھی..... زندگی..... یہ تو ایک
جھٹکے میں سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

جو عورت رات کو بھی لب گلوں لگا کر سوتی تھی،
وہ اب بے رنگ ہونٹوں، مرجھائے چہرے، روئی
روئی آنکھوں کے ساتھ میک اپ سے عاری چہرہ
لیے کھڑی تھی۔ کیوں؟ اس کی آنکھیں ایک دم سے
بھر آئیں۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ماں سے بڑی
آس سے پوچھا۔

”میں تھیک ہوں نا ماما! مجھے کچھ ہوا تو
نہیں؟ برین ٹیومر؟ یا..... یا.....؟“

کھڑکی سے نظر آتا شام کا آسمان، اندھیرے
میں ڈوبنے لگا۔ ماں سسکتی ہوئی کمرے سے باہر
بھاگ گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی، بھری دنیا میں اکیلی رہ
گئی۔ ادھ کھلا دروازہ اس کے چہرے سے زندگی کے
رنگ نچوڑنے لگا۔ پاپا نے اس کا ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں
سے لگا لیا۔ اسے چوما۔ پھر وہ جھک کر اس کی پیشانی
چومنے لگے، اس کے گال، اس کا سر..... اس کا چہرہ
باپ کے آنسوؤں سے بھگینے لگا۔

”مجھے برین ٹیومر ہے؟“ اس نے پاپا کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے کر سختی سے دبایا۔

”نہیں.....“ بہت دیر بعد وہ جواب دے
پائے۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کی آنکھوں
میں دیکھتے رہے۔ وہ باپ کی آنکھوں میں بے پناہ
محبت اور تکلیف دیکھ رہی تھی۔ باپ اس کی آنکھوں
میں ”اپنی“ دم توڑتی ہوئی زندگی دیکھ رہا تھا۔

”نہیں.....؟“ وہ ایک دم سے ہنس دی۔ ”اوہ
پاپا! آپ دونوں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اب بس
بتا دیں مجھے۔ کیونکہ مجھے برین ٹیومر اور ایڈز سے ڈر

لگتا ہے۔ بس.....“

”کینسر.....“ پاپا نے ایک دم سے کہہ دیا۔ وہ
اس کی طرف سے اپنا رخ پھیر چکے تھے۔ وہ اپنی
آنکھیں رگڑ رہے تھے۔

”کینسر.....“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ”کون
سی اسٹیج ہے؟“ اس نے بہت بہادر بنتے ہوئے
پوچھا۔ وہ بالکل نارمل تھی۔

اس کے ایسے نارمل لہجے پر وہ ایک دم سے اس
کی سمت واپس مڑے۔ وہ جانچ رہے تھے کہ وہ اتنی
نارمل کیوں ہے۔ کس لیے؟

”بتائیں نا پاپا! کینسر تو قابل علاج ہے۔ اس
او کے یار پاپا! مجھے اس بیماری سے ڈر نہیں لگتا۔ میں اس
بیماری کو ہر ادویہ کی۔ ڈونٹ وری! ٹرسٹ می۔ میں
فائٹ بیک کروں گی۔“ اس کی انرجی لوٹ آئی تھی۔ وہ
مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہشاش بشاش ہونے لگا تھا۔
وہ یک ٹک اسے دیکھتے رہے۔ آنسوؤں کی
زیادتی اس کی صورت کو دھندلا رہی تھی۔

”ایسے رو کر مجھے کمزور نہ کریں۔ بتائیں نا پاپا!
کیسا کینسر ہے؟ کون سی اسٹیج ہے؟“

”سا..... سات..... ان کا کہنا ہے کہ بس چھ
سات مہینے.....“ وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگے۔ کمرے سے نکل کر روئی، ماں کی آواز،
اندروں کی آواز سے آملی۔

وہ اپنی ہتھیلی پر لگی ڈرپ کی پن سیٹ کر رہی تھی
وہ ہاتھ وہیں رک گیا۔ سارا جہاں رک گیا..... وہ
کینسر سے نہیں ڈرتی تھی، لیکن اب ایک دم سے
زندگی کے ختم ہو جانے نے اسے ڈرا دیا۔ اس نے سر
اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا۔

سات مہینوں نے انہیں ستر سال کا بنا دیا
تھا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے کی طرف پھر سے
دیکھا۔ یہاں سے وہاں بھاگ کر ایک ستر سال کی
بوڑھی عورت گئی تھی۔ اس کی ماں..... وہ پچھلے سولہ
گھنٹوں سے اس کی موت کا سوگ مناتے رہے
تھے۔ وہ زندہ بیڈ پر پڑی تھی اور وہ اس کی موت پر

سے نجات دے سکتی ہے، مردے کو زندگی نہیں۔ اس دنیا کی ساری ترقی، یہ تو بس سہولت ہے۔ آسائش ہے۔ دھوکا ہے۔

اس کا بچپن سے لے کر اب تک کا سارا میڈیکل ریکارڈ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ سال میں دو بار چیک اپ کروانے پر بھی اس بیماری نے اپنا پتا نہیں دیا تھا۔ ان کے گھر میں کلک کے ساتھ ایک نیوٹریشن تھی، وہ کچے پکے ہر فوڈ کی جانچ پڑتال کرتی تھی۔ وہ ان تینوں کو ان کی عمر، جسمانی ساخت کے مطابق کھانا دیتی تھی۔

وہ صرف اور گینک فوڈ کھاتے تھے جو اور گینک فارم ہاؤسز سے سیدھا ان کے گھر آتا تھا۔ انہوں نے صحت کے معاملے میں کبھی کوئی بھوتنا نہیں کیا تھا۔ ماما پاپا دونوں اتنے فٹ اور یٹک تھے کہ وہ اسکول جانے والے بچوں کے ماں باپ تو لگتے تھے لیکن بائیس سال کی لڑکی کے نہیں۔ خود وہ بیوی فریک تھی۔ اپنی خوب صورت اسکن کے لیے وہ جنک فوڈ اور مصنوعی ڈرنکس سے دور رہتی تھی۔ جم، اسپورٹس، یوگا، سوئمنگ، جسم کوفٹ رکھنے والی ہر طرح کی ہرائیکٹیویٹی اس کی زندگی کا حصہ رہی تھی۔

پھر..... پھر یہ بیماری اسے کیوں ہوئی..... کیسے ہوئی؟

اس نے ٹریمنٹ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ماما پاپا کے ساتھ گھر آتے ہوئے کھڑکی سے باہر کی دنیا کو دیکھتے ہوئے اسے لگا جیسے اب وہ اس دنیا کا حصہ نہیں رہی ہے۔ یہ دنیا سب کی ہے لیکن اس کی نہیں ہے۔ فٹ پاتھ پر پرانے لے کر چلتی ماں دوڑ کر سڑک کر اس کرتے ٹین ایجرز، ٹیکسی کی بیک سیٹ پر بیٹھی، مرر میں دیکھ کر لپ اسٹک لگاتی لڑکی۔ یہ سب لوگ..... یہ سارا منظر..... یہ کس دنیا کا تھا۔ اس کی دنیا کا نہیں تھا۔

سر کو دا میں بائیں گھماتے ہوئے وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے گھر کو اس نے باہر کی دنیا سے زیادہ اجنبی پایا۔ جس گھر میں وہ بائیس سال رہتی رہی تھی، وہ گھر نہیں کھو گیا تھا۔ اب یہ تو

رہے تھے۔ زندگی کی ایک گھڑی ہوتی ہے جو ہر انسان کے اندر چھپ کر ٹک ٹک کرتی ہے۔ کچھ کو وہ آواز سنائی دیتی ہے اور کچھ کو اپنا احساس بھی نہیں دلا پاتی۔ اسے لگے لگے اس ٹک ٹک کی آواز سنائی دی..... ایسی ٹک ٹک جو ختم ہونے جا رہی تھی.....

”سات مہینے.....“ وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ خون اس کے جسم میں اتنی روانی سے دوڑا کہ اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ اسی لیے اس کے جسم نے اپنی زبان بدل لی تھی۔ ایسی زبان جو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”سات مہینے.....“ صرف یہ فقرہ سنائی دے رہا تھا۔

زندگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں لگتی۔ وہ سات مہینوں بعد ختم ہو جائے گی۔

موت جو کہیں سے بھی آتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ وہ سات مہینوں بعد سامنے کھڑی ملے گی۔

”میں ایک تیز گام ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میں اپنے خوابوں، منصوبوں، جوشیلے جذبوں اور مقاصد کے ساتھ پوری طرح سے مصروف تھا کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔“

”آپ کا اسٹیشن آچکا ہے، برائے مہربانی اتر جائیے۔“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ٹرین کا سیٹھ سے کہہ رہا تھا۔

”نا..... نہیں..... ابھی میرا اسٹیشن نہیں آسکتا۔ میری منزل تو ابھی آنی ہے۔“ بے یقینی سے ٹی سی کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے جھٹلانا چاہا۔ (عرفان خان۔ کینسر فائٹر)

زندگی کی ٹرین کسی بھی اسٹیشن پر اتار سکتی ہے۔ زندگی نے ہمیں ہمیشہ اپنا مسافر بنا کر بٹھائے رکھنے کا وعدہ ہی کیا ہے بھلا؟

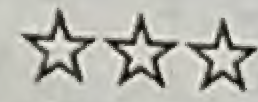
☆☆☆

سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے لیکن پھر بھی سائنس ”زندگی“ کی ہیشکی پر قادر نہیں ہے۔ یہ درد

کوئی اور ہی جگہ تھی۔ ڈرائیو دے میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے عالی شان گھر کو، اس کی بلندی تک دیکھا..... دور اوپر تک..... سورج کی روشنی شیشے کی دیواروں پر چمک چھوڑ رہی تھی۔ کرنوں سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اطراف بچھا سبزہ، کتنا بے رنگ تھا۔ کیسا عجیب رنگ تھا۔ ماما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر متوجہ کیا تو اس نے حیران ہو کر اس عورت کو بھی دیکھا۔ ساری دنیا کی طرح اسے وہ دونوں بھی خود سے الگ لگے..... اجنبی اور بے رحم.....

اس نے دنیا کی ہر چیز ہر منظر کو اجنبی پایا۔ اس نے اپنے سوا دنیا کی ہر شے کو ضروری اور متحرک پایا۔ ”جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے کینسر ہے تو میں نے زندگی سے بڑھ کر کسی شے کو قیمتی نہیں پایا۔ اس کے علاوہ میں نے ہر دوسری قیمتی چیز کو بے کار اور فضول پایا۔“ (علی بنت)۔

زندگی سے منور آپ کی آنکھ، جو یہ سطر پڑھ رہی ہے، وہ باقی جسم سے بس اتنا کہہ دے۔ ”اپنی زندگی اور تندرستی کی قدر کیجیے۔“



ساری دنیا ایک ہی زبان بول رہی تھی۔ دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر، دنیا کا بڑے سے بڑا ہاسپٹل، میٹنگ کے لیے بٹھایا ڈاکٹر زکا ہر بورڈ، ہر مشین، ہر رپورٹ، سائنس کی ہر کتاب، ہر دوا..... کوئی نو مہینے کی بات کر رہا تھا..... کوئی چار کی..... کوئی پانچ اور کوئی سات کی۔ کوئی بھی ”زندگی“ کی بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ سب سائنس، تھیوری، فیلٹس، کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ وہ اپنی زبان کیسے بدل لیتے۔ وہ آسٹریلیا گئی پندرہ دن تک ٹیسٹ کروائی رہی رزلٹ وہی تھا جو امریکا کے ہاسپٹل کا تھا۔

سارا جہاں ایک جیسا تھا..... ناکارہ بے کار۔ سائنس نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ اس نے بس لوہے کو جہاز بنا کر اڑایا ہے۔ مٹی کو اینٹ، اینٹ کو عمارت..... بس..... روشنی کو رفتار کیا ہے۔ رفتار کو قابو اور سائنس نے کیا ہی کیا ہے۔

اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ جو میک اپ کمپنیوں کو فون کر کے اپنی پسند کے میک اپ شیڈ بنوا رہی تھی تو سب کتنا آسان تھا۔ signature بیک ڈریسز، کاریں، گھر، حتیٰ کہ جسمانی اعضاء تک پالینا۔ دنیا کی ہر چیز ایک فون کال پر اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ کتنا آسان تھا ہر چیز کو اپنے لیے خاص کر لینا۔ اس کی کوئی ایک بھی خواہش ایسی نہیں تھی جس کی تکمیل سائنس نہ کر سکتی ہو۔ پھر سائنس..... یہ اس کی زندگی کو موت کے منہ میں جانے سے روک کیوں نہیں پار رہی تھی۔

اس کی فرینڈز اور یونیورسٹی سرکل میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ پیغامات کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ وہ تینوں فارم ہاؤس شفٹ ہو چکے تھے۔ فون وہ بند کر چکی تھی۔ یہ وہی فون تھا جو ہر وقت اس کی دس انگلیوں کے درمیان رہا کرتا تھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، فون کو خود سے جدا نہیں دیکھا تھا۔

اب یہ فون پچھلے پندرہ دنوں سے بند تھا۔ انشا گرام پر کوئی اسٹوری شیئر نہیں کی گئی تھی۔ اس کے کروڑوں فینز پریشان تھے کہ وہ کہاں غائب ہے۔ لاکھوں لائیکر (لائک کرنے والے) ہزاروں کنٹر لکر مند تھے کہ وہ اتنی خاموش کیوں ہے مشہور ولاگریٹک نے اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا تھا۔

ویٹکی میگزین میں اس کی گمشدگی کی نیوز آئی تھی۔ کچھ فنی میگز بنے، بہت سی افواہیں اڑیں۔ بہت کچھ ہوا۔

ایک لمحہ لگا تھا اور ہر چیز بے معنی ہو گئی تھی۔ کروڑوں فینز، لاکھوں مینٹس، ٹرینڈنگ پوسٹس، اس کی نیوز میکر حرکتیں، ٹرینڈ سیٹنگ فیشن۔ ان سب کی حیثیت ایک لمحہ بھی تو اس نے اب تک کی اپنی زندگی ان پر ضائع کیوں کر دی تھی..... ان سب کی قیمت ”کوئی قیمت نہیں“ تھی تو اس نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت ”قیمت میں ادا کیوں کیا تھا؟“

جھیل کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھے وہ پانی میں تیرتے جانوروں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس جانور کا کیا نام ہے۔ وہی جانور جو سفید سا ہوتا

جو خاموشی میں درویش لگتا ہے..... چہکار میں
اور مستی میں ”محبت“ لگتا ہے۔
”سوان (ہنس).....“ اس کے کان میں
رگڑتی نہیں ہوئی تھی۔ کلام ہوا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔
”ہر زمانے میں پرندوں نے اپنی علامتیں بدلی
ہیں۔ محبت..... یہ اس زمانے کی علامت ہے۔ محبت
ہو انسان کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔
”خود سے محبت۔“ اس نے کہا، جس کے الفاظ
احساس کی طرح اس کے دل پر اترے تھے۔ جیسے
ہوا، جو جسم کو چھوئی ہے۔ جیسے روشنی جو بس موجود ہوتی
ہے۔ جیسے فرشتے جو بہت قریب رہتے ہیں اور بغیر
لفظوں کے کلام کرتے ہیں۔
اس نے بھی یہی کلام سنا تھا۔ بغیر الفاظ کے۔
بہت قریب سے۔

☆☆☆

بیس دن بعد اس نے دنیا بھر کے ڈاکٹر زکا کہنا
بول کر لیا تھا۔ اپنی رپورٹس، اپنا کینسر اور مختصر ہو چکی
اپنی زندگی۔ وہ صدے کی کیفیت سے نکل آئی تھی۔
اس نے مان لیا تھا کہ اس کی زندگی بس اتنی ہی تھی۔
بس! یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔ وہ اپنی ماں کے پاس
آئی اور ان کے گلے میں بانہیں جمائل کر دیں۔
”میں اپنی مرضی سے وقت گزارنا چاہتی
ہوں۔ مجھے جانے دیں۔“

”تم جہاں بھی جاؤ گی ہم تمہارے ساتھ جائیں
گے..... بس..... اس کے علاوہ کوئی ڈیل نہیں ہوگی۔“
پاپا اس کی بیماری کے بعد سے سائے کی طرح
اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ ایک بھی دن
اس نہیں گئے تھے۔ ان کا ملین ڈالرز کا کنسرکشن کا
بس جوان کی سانس سے بندھا رہا کرتا تھا، اب
بلا ہی ہچکیاں لے رہا تھا۔

”مجھے مریضوں کی طرح ٹریٹ کرنا بند کر دیں
میں! مجھے نارمل لائف گزارنے دیں۔ میں آپ کو اپنا
ماریہ نہیں بنا سکتی۔“
پاپا نے ماما کی طرف دیکھا۔ کتنا مشکل تھا اسے

یہ سمجھانا کہ اس سے زیادہ تکلیف میں تو وہ خود
ہیں۔ اب وہ کہاں گھوم پھر کر اپنی تکلیف رفع
کریں..... کیسے chill کریں۔

”پھر بھی ہدی!“ ماما نے لہجے کو نارمل رکھنا چاہا
لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ اب وہ عام بات بھی کرتی
تھیں تو لگتا تھا رو دیں گی۔ صبح وہ کک سے ناشتہ
بنانے کے لیے کہتے کہتے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”اب مجھے پتا چلا کہ اصل خوش قسمت کون ہوتا
ہے۔“ ناشتے کی میز پر سر رکھ کر وہ ہچکیاں لینے لگیں۔

”مجھے لگتا تھا میں دنیا کی خوش قسمت ترین

عورت ہوں۔ اب اپنے سوا مجھے ہر انسان خوش
قسمت لگتا ہے۔ جیسے کہ تم..... جیسے کہ گھاس کاٹنے

والا..... جیسا کہ فوڈ ڈیلیوری والا۔ پٹرول پمپ پر کھڑا
لڑکا، نیوز پیپر کے اسٹال پر بیٹھی بوڑھی عورت۔ کاش

میں وہ عورت ہوتی جو ہفتے میں بیس بائیس ڈالر کمائی
ہے، اچھے گھر اور خوبصورت لباس کے خواب دیکھتی

ہے۔ یا جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگتی ہے۔ یا وہ جو
بستر پر بیمار پڑی ہے، اور اپنی زندگی کے دن گن رہی

ہے۔ لیکن جو میری طرح بیٹی کی زندگی کے دنوں کو
گننے میں مصروف نہیں ہے۔ میری بیٹی..... میری

ہدی..... دنیا کا ہر غم بڑا ہے، لیکن اولاد کا غم سب سے
بڑا ہے..... کسی کو یہ غم نہ ملے.....“

وہ ان کی اکلونی بیٹی تھی۔ ان کا اپنا تعلق قطر سے
تھا۔ شوہر پاکستانی نژاد امریکن تھے۔ ان دونوں کے

خاندان تیس چالیس سالوں سے امریکا میں آباد تھے۔
”میں ہر صورت آپ کے بغیر جانا چاہتی

ہوں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ اس کی ضدی
طبیعت واپس لوٹ آئی تھی۔

لیونگ روم میں سناٹا تھا۔ وہی سناٹا جو ان کی
زندگیوں میں سانس کی جگہ لے چکا تھا۔

بورابورا.....

وہ زندگی کے کچھ سانس یہاں لینا چاہتی تھی۔
اپنے دونوں جوتوں اور ٹریولنگ بیگ کی تصویر اس

نے انشا پر شیئر کر دی تھی۔ ایک ہی تصویر سے انشا پر

کر لے گی..... اسے لگا، ایسا ہو ہی جائے گا..... لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا۔

کننگ فو پاٹڈ ا دیکھتے ہوئے وہ مسکرا نہیں سکی۔ آئس کریم سٹی ٹو کیو میں آئس کریم کھاتے ہوئے، اس میں ایک اور کپ آئس کریم کھانے کی حسرت دم توڑ گئی۔ فرینڈز کی نظر بچا کر اپنی آئس کریم ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ یونیورسٹی اسٹوڈیو میں ریونج آف دی مئی رائنڈ اسے بوگس اور بے کار لگا۔ وہ خاموشی سے چیخنے چلانے والوں کو دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ نہیں سکی کہ ان کے خوف اور جوش کی وجہ کیا ہے۔

زندگی کے فلیٹے پر آگ لگ چکی ہو تو کسی بات پر ہنسی نہیں آتی۔ شہد ہو یا شیرنی، ہر ذائقہ کڑوا لگتا ہے۔ دنیا کی کوئی جگہ خوب صورت نہیں لگتی۔ اس ساری دنیا کی خوبصورتی ”زندگی“ کے ہونے سے ہے۔ اگر زندگی ہی نہیں ہوگی تو دنیا کی رنگینیاں کیا کمال دکھاسکیں گی؟

ایفل ٹاور کی نوک میں کھڑے ہو کر، سیلفی لیتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے رُک کر اوپر سے نیچے کی دنیا کی طرف جھانکا۔ وہ ابھی چوبیس سال کی نہیں ہوئی تھی، ایفل کی ٹکٹ اسے ہاف دینی پڑی تھی۔ تو پھر موت اس کی پوری زندگی کی ٹکٹ کیوں کاٹ رہی تھی۔ ایفل اس کی عمر کا لحاظ کر رہا ہے تو موت کیوں نہیں۔ اس نے ٹکٹ چیکر کو اپنا پاسپورٹ دکھایا تو اس نے سر ہلا کر اس کی ٹکٹ ہاف چارج کی تھی۔ وہ موت کے فرشتے کو اپنی عمر بتائے گی تو کیا وہ سر ہلا کر اس پر سے موت کا چارج اٹھالے گا؟

نیچے کی دنیا بہت رنگین تھی۔ اپنی ہی مستی میں رواں دواں تھی۔ دریائے سین اسے بیگانہ لگا لیکن حقیقت میں تو وہ جہلیں کر رہا تھا۔ نیچے کی دنیا، اوپر کے آسمان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ بہت دور بلندی پر کھڑی ایک لڑکی یہ جان چکی ہے کہ اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے صرف چند مہینے بچے ہیں۔ وہ جان چکی ہے کہ دنیا کی ساری خوبصورتی زندگی کے ہونے سے ہے..... ورنہ تو دنیا بہت بد صورت

طوفان آگیا تھا۔ لیکن اس طوفان نے بھی بورا بورا آئر لینڈ کو ویران ہی رکھا تھا۔ وہ ساحل کنارے سجائے گئے ڈزنیبل پر اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ٹکڑیوں کا الاؤ دہک رہا تھا۔ جس کے گرد لڑکے لڑکیوں کا گروپ، مقامی ثقافت کے رنگ میں، اپنے سازوں کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ یہ سب اہتمام اس کے لیے کیا گیا تھا۔ اس سے کچھ پہلے ساحل کی پٹی پر ”ہدی“ نام کے بڑے بڑے انگلش سچے آتش گیر مواد سے جلتے رہے تھے۔ بورا بورا اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

دور تک پھیلا رات کا سمندر۔ اس میں جھلمل کرتا رات کے آسمان کا چاند..... رقص کرتے لوگ، ترنم سے بجتے ساز۔

دنیا کتنی خوب صورت تھی۔ ہر چیز وہی تھی۔ ویسی ہی تھی..... پھر بھی..... پھر بھی.....

صبح اس نے بلندی سے پانی میں چھلانگ لگائی۔ شفاف سمندر میں وہ آبی جانور کی طرح دُور نیچے تک چلی گئی۔ سر باہر نکال کر، جب اس نے نیلے شفاف سمندر کو سطح سے دیکھا تو جانا کہ سمندر بھی اس کا نہیں رہا۔ اس کی نظر سمندر کے پانی پر کائی کی طرح جم گئی۔ وہ اگلے ہی دن بورا بورا سے چلی گئی۔ ماں کی دی ہوئی دوائیں وہ سمندر میں پھینک گئی تھیں۔ اس کی فرینڈز نے چپ چاپ اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ بیمار ہے اور ایٹارل بی ہیو کر رہی ہے..... پھر بھی سب صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

وہ fashionista تھی۔ ترقی یافتہ دور کی ترقی یافتہ لڑکی۔ اسے لگتا تھا کہ جیسا فلموں میں ہوتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مرنے والی ہے اس کے پاس چھ سات مہینے ہیں وہ ورلڈ ٹور کرے گی پہاڑوں پر چڑھے گی دریاؤں اور سمندروں میں نہائے گی گائے گی، ناچے گی، پوری طرح سے انجوائے کرے گی۔ سات مہینوں میں ستر سال کی زندگی جی کر، بستر پر گر کر دم دے دے گی۔ اسے لگتا تھا وہ ایسا

ہے..... دریائے سین گدلا ہے..... پیرس منحوس ہے۔ اس کی روشنیاں آنکھ کا دھوکا، اس کی رنگینیاں خوابوں کا محل ہیں۔

دو ٹین ایجرز سر سے سر جوڑے سیلفیاں لے رہے تھے، ابھی وہ زندگی کو ایک ہی نام سے جانتے تھے۔ ”خواب“ مہنی مون پر آئے جوڑے کے قہقہے ہر آواز میں نمایاں تھے۔ اس نے نئی نویلی دلہن کی آنکھوں میں محبت کی پوری چمک دیکھی۔ اس کے گال چومتے، اس کے شوہر کے انداز میں دیوانگی۔ اس نے گہرا سانس کھینچ کر منہ پھیر لیا..... ابھی تو اسے محبت کا مزا چکھنا تھا..... ابھی تو..... ابھی تو.....

لالی باپ کھاتی ایک بچی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ بچی کی ہنسی اس کی ہستی کو انگارہ بنا گئی۔ شانزے لیزے پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ گھٹنوں تک لانگ شوز اور جینز کی پاکٹ میں دونوں ہاتھ..... کھلے بلونڈ بال اور چہرے پر بے نیازی.....

کچھ لوگوں نے اسے پہچان کر ہاتھ سے ہائے کا اشارہ کیا تھا لیکن وہ گردن کو اکڑا کر، نو میبل کی طرح شاہراہ کو ریمپ سمجھ کر واک کرتی رہی۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔ چہرہ بھینچا ہوا۔ کچھ والگرز ملے، انہوں نے اس سے بات کرنی چاہی تو اس نے بے زاری سے ان کے کیمروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں پرے کھسکا دیا۔

اس کی فرینڈز اس سے کچھ دُور، پیچھے چل رہی تھیں۔ وہ رک رک کر کچھ تصویریں بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ اپنی فرینڈز سے بھی جدا ہو گئی..... چلتے چلتے، وہ ہر شے کو پیچھے چھوڑتی گئی..... ہر شے سے جدا ہوئی گئی۔ پیرس سے..... اپنے پیروں تلے کی زمین سے..... کائنات کی ہر شے سے۔

اور اس وقت وہ اتھاہ تنہائی سے جا ملی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے سے نکلی تو اس کے سویٹ کے انچ میں بیٹھی اس کی فرینڈز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا.....“ اس نے شانے اچکا کر بے

نیازی سے پوچھا۔

”تم نے شو کے لیے ڈریس کو ڈفالو نہیں کیا.....“ تینوں فرینڈز نے کچھ بے آرامی محسوس کی۔

وہ ایڑی کے بل ذرا سا گھومی۔ ”کیا برائی ہے اس میں.....؟ میں ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی ہوں۔“

وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی لیکن وہ فیشن کے سب روز ملیا میٹ کر چکی تھی۔ پر پل تو اس کا کلر ہی نہیں تھا، پھر اس نے پر پل شیفون میکی پہننے کی غلطی کیوں کی؟ اس پر بلیک ہاف جیکٹ۔ ریڈ کاپی کاؤچ، بلیو ہیل اور گرے ہیٹ..... وہ نو میک اپ لک پسند کرتی تھی، لیکن اس وقت وہ میک تھوپے ہوئے تھی۔ اس نے شارپ ریڈ اپ اسٹک اپلائی کی تھی۔ پر پل شیڈ اس کی آنکھوں کو بو جھل کر رہا تھا۔

”کبھی کبھی مضحکہ خیز بھی لگنا چاہیے۔“

اس نے ہنس کر بے نیازی سے کہہ دیا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ خود کو رنگوں میں لپیٹنے سے روک نہیں سکی۔ جیسے پر پل اور ریڈ مل کر اس کی بلیک اینڈ وائٹ ہوتی زندگی کو، رنگین بنا دیں گے۔

ریڈ کارپٹ راہداری سے گزرتے ہوئے فرینڈز نے اسے روک کر گروپ سیلفی لینی چاہی تو وہ بے زاری سے اونچی چھت کے اوپر اہال کی طرف بڑھ گئی۔ ان سے بہت دور نکل آنے پر، چلتے چلتے وہ رک گئی..... لوگوں کی چہل پہل کا شور، جوش، دلولہ انگیز آوازیں، قہقہے، سرگوشیاں..... اپنی ہیل پر گھوم کر اس نے سب کو دیکھا..... سب کو سنا۔

ہر شے بد نما تھی..... ہر آواز کریمہ تھی۔

شو شروع ہوا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے سر گھما کر اوپر کیلریوں کی سمت دیکھا۔ اگر وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی تو اس تلاش میں ناکام رہی تھی۔ بت کی طرح ساکت ہو کر وہ اسٹیج کی طرف گھوم گئی۔ کون آیا، کیا گایا، کیا کہا، کیا ایکٹ کیا، کون لڑکی تھی، کون لڑکا تھا، اسے کچھ دکھائی، سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر آواز بھنبھناہٹ تھی۔ ہر ادا نفلی تھی، ہر شے ارزاں تھی۔

لیکن.....
جب ہیروئن نے ہیرو کی موت کا ماتم کرنا شروع کیا تو بت بن کر بیٹھے اس کے مجسمے پر ایک ضرب پڑی۔ اس نے اسٹیج کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا..... وہ دیکھ رہی تھی..... وہ سن رہی تھی۔ سامنے اسٹیج پر وہ خود کھڑی تھی۔ وہ اپنی ہی موت کا گیت گارہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے۔ پھر یہ آنسو رکنے نہیں..... لگاتار بہتے رہے۔ اس نے ٹٹو نکالنا چاہا تو اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کی شدت نے اس کے ہاتھ سے پاؤں گرا دیا۔ ٹھوڑا شور ہوا۔ اس کے پیچھے نشست پر بیٹھے چند لوگوں نے پہلو بدلا۔ اس نے جھک کر لباس کا ٹونا اٹھایا اور اپنی آنکھوں پر رگڑا۔ آنکھوں میں لگا گہرا کاجل..... آنکھوں پر سجا گہرا شیڈ..... اس کے گالوں پر پانی کے ساتھ کتنی ہی تصویریں بنا گیا۔ ساتھ بیٹھی اس کی فرینڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔ باقی دو نے بھی گردن کو جھکا کر اسے دیکھنا چاہا۔

”سورج نیچے آتا ہے تو ستارے اوپر آ جاتے ہیں۔“ (فریچ مقولہ)

ایک دم سے اس نے اپنے گرد اتنے اندھیرے اکٹھے کر لیے کہ اسے سورج، چاند، ستارے دکھائی دینا بند ہو گئے۔ جھک کر اس نے اپنے پیروں کو جوتوں سے الگ کرنا چاہا۔ جسم کے اندر موجود زندگی اپنی سانس کاٹ رہی تھی، تو اسے جسم پر موجود ہر چیز تکلیف دے رہی تھی۔ جوتوں کو ہاتھ میں پکڑ کر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایسے اوپیراشو کے درمیان سے اٹھ کر نہیں جا سکتی تھی۔ یہ بد اخلاقی بھی تھی اور شو کے قوانین کی خلاف ورزی بھی۔ انتظامیہ کا ایک آدمی جلدی سے اس کی طرف آیا لیکن وہ اپنی نشست کی رو میں کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ لوگوں کو بے آرام کرتی ہوئی وہ کھسکتی جا رہی تھی۔ سسکتی جا رہی تھی..... اوپیرا ہال کے سکوت نے اس کی سسکیوں کو سنا۔

آگے سے چند لوگوں نے گردنیں موڑ کر اسے دیکھا..... گیلری میں بیٹھے لوگوں نے گردنوں کو ذرا سا

جھکا کر نیچے اسے جھانکا۔ سب کی نظریں اٹھی رہ گئیں۔ انتظامیہ کا آدمی اس کی طرف آتے آتے رُک گیا۔ رنگوں کی تہہ میں بھگ کر بد نما ہوتے اس کے بد صورت گال سب کو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ قدم آگے نہیں بڑھا سکی..... ایک بوڑھے میاں بیوی کے درمیان پھنس کر کھڑی تھی۔ وہ سسک رہی تھی، ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس کی سسکیاں ہر سماعت سن سکتی تھی۔ اسٹیج پر کھڑی فنکارہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ اوپیرا ہال میں اس کی سسکیاں گنگنا رہی تھیں۔ وہ الگ ہی شو پیش کر رہی تھی۔

وہ کیا کر رہی ہے، کہاں کھڑی ہے۔ اس نے ہوش میں آ کر ایک نظر آس پاس دیکھا پھر سر اٹھا کر گیلری میں بیٹھے لوگوں کو۔ اس نے ہر آنکھ کو خود کو دیکھتے پایا۔ وہ تیزی سے وہاں سے بھاگ گئی۔

اوپیرا ہال سے باہر..... بلندی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے، ریڈ کارپٹ پر دوڑتے ہوئے۔ اسٹیج پر ہیرو کی جدائی کے راگ الاتی فنکارہ سے دور..... سڑک پر نکل کر، دریائے سین کی طرف، وہ بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ جتنے لوگوں کے قریب سے گزر رہی تھی۔ وہ سب دیکھ سکتے تھے کہ وہ رو رہی ہے..... ہچکیاں لے رہی ہے۔ اس کا ہیٹ اڑ کر گر چکا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے جوتے اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکے تھے۔ وہ ننگے پاؤں سڑک پر بھاگ رہی تھی۔

ابھی تو زندگی شروع ہوئی تھی، وہ ختم کیسے ہو سکتی تھی۔ ابھی تو وہ صرف بائیس سال کی تھی۔ پھر زندگی کی جوان بہاروں پر موت خزاں بن کر کیسے ٹھہر سکتی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ ہانپ کر کھٹنوں کے بل گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

پیرس سے پاپا سے پرائیویٹ جیٹ میں لائے تھے۔ اس میں دو قدم چلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گڑھے بن گئی تھیں۔ اس کا رنگ جل کر سیاہ ہونے لگا تھا۔ اس کا وزن تیزی سے گر رہا تھا۔ چھتیس گھنٹوں میں اس کا سات کلو وزن گر گیا تھا۔ اس

نے کینسر اور موت کو بیماری بنا لیا تھا۔ یہ روگ اس پر پوری طرح سے حاوی ہو چکا تھا۔ اس کی فرینڈز پاگللوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پیرس کی سڑکوں پر ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ جس سڑک پر وہ گر کر بے ہوش ہوئی تھی، وہاں ہجوم لگ چکا تھا۔ اس کی فرینڈز اس کے پاس بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں۔

اس نے ساری زمین کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ پورے آسمان کو خود پر گرا لیا تھا۔

جہاز میں لیٹے ہوئے وہ مسلسل کانپ رہی تھی۔ جیسے اسے سرد تو دیے سے نکال کر لایا گیا ہو۔ اس کی کپچی دل دھلا رہی تھی۔ ماں نے اس کی حالت دیکھی تو وہ اسے گلے سے لگانے کے بجائے اس سے دور ہٹنے لگیں۔

”یہ..... یہ میری ہدیٰ ہے..... کیا ہوا اسے؟ کیا کیا ہے اس نے اپنے ساتھ.....؟“

اپنے بڑے گھر میں انہیں رونے کے لیے بہت کونے ملے، لیکن کوئی ایسا کونا نہیں ملا جہاں انہیں تسلی بھی مل سکتی۔

ڈاکٹرز نے اسے ایڈمٹ کرنا چاہا تو وہ چیخنے چلانے لگی۔ اس پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر پھینچتی تھی۔ اسے جہاں جو چیز نظر آتی تھی اس نے اٹھا کر توڑ دی تھی۔ ہر چیز اس کا مذاق اڑا رہی تھی کہ وہ تو موجود رہنے والی ہے لیکن ہدیٰ ختم ہو جانے والی ہے۔

اس نے وقت بتانے والی ہر شے ختم کر دی تھی۔ گھڑیاں، وال کلاک، موبائل، کلینڈر..... وہ کمرے میں اندھیرا کر کے رکھتی تھی تاکہ دن اور رات میں فرق ختم ہو جائے۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہو چکی تھی۔ بچا تھا تو بس یہ احساس کہ سب ختم ہو جانے والا ہے۔

اس کے ماں باپ اپنی ہمت ہار چکے تھے۔ اس نے منہ تک دھونا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا وزن اتنا گر چکا تھا کہ اس کی گردن کی ہڈیاں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ اس نے علاج سے انکار کر دیا تھا۔ اگر مرنا ہی تھا تو اسے علاج کی تکلیف سہہ کر نہیں مرنا تھا۔ وہ زہر کھا

لے گی یا نبض کاٹ لے گی۔

پاپا نے بڑے سے بڑے سائیکا ٹرسٹ سے رابطہ کیا۔ دنیا جہاں کے اسکارلز، ذہین و فطین لوگوں نے آ کر اسے دنیا جہاں کی دلیلیں دے کر سمجھانا چاہا۔ اسے علاج کے لیے مجبور کرنا چاہا لیکن اس نے دونوں کان بند کر لیے۔ دونوں آنکھیں میچ لیس۔ وہ زندگی کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کر کے رونے بیٹھ گئی۔

”تم کم ہمت ہو.....“ بوڑھی سائیکا ٹرسٹ نے مایوسی سے کہا۔

”کیا باہمت ہونے سے مجھے زندگی مل جائے گی؟“

وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے کاؤچ پر گم صم بیٹھی تھی۔ اب وہ کئی کئی گھنٹے اسی حالت میں بیٹھ کر گزار دیتی تھی۔ ماما نے ہزار بہانوں سے اسے اس خاتون سے ملنے پر راضی کیا تھا۔ وہ دو گھنٹے تک اس کے سامنے بیٹھ کر بولتی رہی تھیں اور مایوس ہوئی تھیں۔

کمرے کی دہلیز پر کھڑے ماں باپ کے چہرے پھلکے پڑ گئے۔ زندگی ان کے لیے ایسی کڑی آزمائش بن گئی کہ وہ اپنی جان دے کر بھی اپنی بیٹی کی جان نہیں بچا سکتے تھے۔ میلی کا ایک فرد تکلیف میں ہو تو سب اس تکلیف کو جھیلے ہیں۔ ماں باپ تو اصل سے کہیں زیادہ تکلیف سہتے ہیں۔ اولاد کو چھنے والا کانا ماں باپ کے دل پر زخم چھوڑتا ہے۔

زندگی ساٹھ ستر سالہ وقت کی میعاد کا نام نہیں ہے۔ یہ ہر سانس کو زندگی کرنے کا نام ہے۔

اس نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ لمس نیا تھا اور خوش کن بھی۔ اس کی آنکھ کھلی۔ وہ کاؤچ پر ہی سو چکی تھی۔ ایک بچی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ کمرے کی چھیت تک بلند شیشے کی دیواریں صبح کا سورج دکھا رہی تھیں۔ سبزے کے قطعات پر کچھ اجنبی پرندے پھدک رہے تھے۔ گھاس سبز تھی..... جو اس سے پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔

”ہیلو.....“ بچی نے اس کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ ہاتھ میں پکڑا پھولوں کا گلدستہ اس کی

طرف بڑھایا۔
 ”ہائے.....“ اسے بچی اور بچی کی مسکراہٹ
 اچھی لگی۔ پھول بھی اجنبی تھے لیکن خوب صورت تھے۔
 ”کون ہو تم؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں؟“
 کمرے میں آنے والا وہ پہلا انسان تھا جسے دیکھ کر وہ
 مسکرا رہی تھی۔ پھول آخر کار اس نے تھام لیے تھے۔
 ”میں.....؟ میں تو شیلے ہوں۔ آپ کے لیے
 پھول لائی تھی؟“ جھک کر اس نے اس کے گال کو چوما۔
 ”بہت دیر سے سو رہی ہیں آپ..... کیوں؟“
 ”میں سو تو نہیں رہی تھی۔ مجھے اب نیند نہیں
 آتی۔“

”آپ ابھی بھی نیند میں ہی ہیں۔ جاگ
 جائیں گی تو آپ کو اچھا لگے گا۔“

اس نے ایک بار پھر اس کا گال چوما اور کمرے
 سے چلی گئی۔ پھولوں کو اس نے ڈسٹ بن میں نہیں
 پھینکا تھا، انہیں میز پر رکھ دیا تھا۔ منہ پر پانی کے
 چھینٹے مار کر وہ باہر آ گئی۔ گرم صم سے ماما، پاپا لیونگ ایریا
 میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سب کام اب ختم ہو
 چکے تھے۔

”شیلے کہاں ہے ماما؟“ وہ آج خود ہی کمرے
 سے باہر آئی تھی۔ دونوں نے اسے حیرت سے
 دیکھا۔ پاپا فوراً اس کی طرف بڑھے۔ اسے اپنے
 ساتھ لگا کر پیشانی پر پیار کیا۔

”کون شیلے.....؟“ ماما جلدی سے کچن کی
 سمت بڑھیں۔ آج وہ بھی ناشتہ کرنا چاہتی
 تھیں۔ انہیں بھوک لگ گئی تھی۔

”میرے لیے بھی ناشتہ بنا دو۔ بہت بھوک لگی
 ہے۔“ پاپا نے کہا۔ ہڈی اپنا سران کے شانے پر رکھ
 کر بیٹھ گئی تھی۔

”ابھی جو میرے کمرے میں آئی تھی.....“ ہاتھ
 بڑھا کر اس نے آج کا نیوز پیپر اٹھا لیا تھا۔

فریج کھول کر کھڑی ماں نے اپنے شوہر کی
 طرف دیکھا۔ دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ہڈی
 سے سوال کریں، یا اس کے سوال کا جواب دیں۔

”آں.....“ ماں وہ آئی تھی..... شاید اسے
 اسکول جانا تھا..... جلدی میں تھی..... پاپا نے کہا۔
 ”یہ وہ ہے کون؟ اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“
 آپ کے کسی فرینڈ کی بیٹی.....؟
 ماں باپ دونوں کی نظریں ملیں۔ ”وہ ہمارے
 ہمسائے سے آئی تھی..... شاید.....“ ماں نے شاید کا
 لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھا۔

جب وہ ناشتہ کر رہی تھی، تو وہ دونوں اپنے لقمے
 زہر مار کر رہے تھے۔ وہ بار بار نظریں چرا کر ہڈی کو
 دیکھ رہے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ
 ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی۔ کوئی بچی ان کے
 گھر نہیں آئی تھی۔ وہ کسی شیلے کو نہیں جانتے تھے۔

☆☆☆

لائم اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ دونوں کی
 زبان قینچی کی طرح چلا کرتی تھی لیکن اب دونوں
 خاموش بیٹھے تھے۔ ماما نے اسے لان میں بٹھایا تھا
 کہ شاید وہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ وہ سب
 سے ملنے سے صاف انکار کر دیا کرتی تھی لیکن لائم کا
 نام سن کر وہ ماما کو دیکھ کر رہ گئی۔

”اب تو میں بد نصیب نہیں رہی لائم؟“ دونوں
 کے درمیان کافی دیر تک خاموشی رہی۔ جو اس نے ایسے
 توڑی تھی۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

”آئی ایم سوری ہڈی! یقیناً جانو، وہ سب
 مذاق تھا اور تم نے سچ کہا تھا، میں واقعی میں یہ حسرت
 رکھتا تھا کہ وہ بد نصیب انسان میں ہوتا جو تمہاری جگہ
 ہوتا۔ جو ایسی پر آسائش زندگی گزار رہا ہوتا۔“ لائم کی
 نظر اس نئی ہڈی پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔ اس کے دل میں
 ٹیس اٹھی۔

”تو کیا اب بھی تم یہی حسرت رکھتے ہو؟ میری
 جگہ آنا چاہو گے؟“ وہ طنز سے ہنس دی۔

”ہم جگہ ہی تو نہیں بدل سکتے ہڈی! اور ہم اپنی
 سوچ بھی نہیں بدل سکتے۔ اگر ایسا کر سکتے تو تمہارے
 ماں باپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہاری جگہ لے چکے
 ہوتے۔ تمہیں دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان ایسا ہوگا جو

یہ حسرت نہیں کرتا ہوگا کہ کاش وہ ہدیٰ کی جگہ ہوتا۔
اب تم یہ خواہش کر رہی ہوگی کہ کاش تم میری جگہ
ہوئیں۔ مجھ جیسی غریب، بد حال، پارٹ ٹائم جابس
کرنے والی، ایک ایک پنی کا حساب رکھنے والی،
لیکن صحت مند، زندگی کی گارنٹی کی سند رکھنے والی.....
کیا ایسا ہی ہے ہدیٰ؟“

”ہاں..... میں دنیا کا کوئی بھی شخص ہوتی لیکن
ہدیٰ نہ ہوتی۔“ اس نے سچائی کا اعتراف کر لیا۔
لائم نے گہرا سانس لیا۔ ہدیٰ کتنا بدل چکی تھی۔
اسے تکلیف ہوئی۔

”ہم سب ہمیشہ اپنی جگہ بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم
ہمیشہ کسی دوسرے کی زندگی جینا چاہتے ہیں۔ ہمیں
جو میسر ہوتا ہے، ہم اس پر راضی ہی نہیں ہوتے۔ ہم
نے ہم بن کر رہنا سیکھا ہی کب ہے؟“

”مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے.....؟“
”کچھ کہنے کے لیے..... کہ تم اپنی جگہ پر ہی
ہو۔ اس بیماری کی مریضہ کی جگہ۔ زندگی کی جنگ
لڑنے والی لڑکی کی جگہ..... یقین کرو، یہی تمہاری
بہترین جگہ ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوں
گے جو زندگی کی چند سانسوں کے لیے تڑپ رہے
ہوں گے۔“

بچے کو جنم دیتی ماں، جو اپنی سانسیں توڑ رہی
ہے، اسے چند سانسیں اور چاہئیں تاکہ وہ بچے کو دنیا
میں لاسکے۔ سڑک کنارے حادثے سے دم دیتا تین
بچوں کا باپ، وہ اپنے بچوں کو، باپ کے بغیر زندگی
لڑانے کے لیے حوصلہ دینا چاہتا ہے..... چند
لمحے اور سینے سے لگا کر چومنا چاہتا ہے۔ وہ بس
چند سانسیں اور چاہتا ہے۔ بستر مرگ پر پڑا بیمار
بیمان جو اپنے پیاروں سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔
سرد پار کرتا سرین بچہ..... وہ تو بس ایک نئی سرزمین
کا سورج دیکھنا چاہتا تھا۔

لاکھوں، کروڑوں لوگ اب بھی تمہاری جگہ لینا
چاہتے ہوں گے ہدیٰ! ان کے لیے چند مہینے، چند
لحے، چند لمحے، چند سانسیں ہی بہت ہوں گی۔ اس

لیے ہدیٰ تم اپنی جگہ پر ہی رہو۔ میں جانتا ہوں یہ سب
کہنا آسان ہوتا ہے اور کرنا مشکل..... میں آسانی
سے کہہ رہا ہوں۔ تم مشکل سے ہی سہی لیکن اسے
آسان کرلو۔“

وہ چپ چاپ لائم کو دیکھ رہی تھی۔
”خدا ہمیں ہمارے ظرف، ہمت، حوصلہ کے
مطابق آزماتا ہے ہدیٰ! اگر یہ آزمائش بڑی ہے تو
تمہارا ظرف بھی بڑا ہی ہوگا۔ تم نہیں جانتی ہوگی، یہ
جنگ بڑی ہے تو فتح بھی بڑی ہوگی۔ تم جانتی نہیں،
جو جانتا ہے، وہ آزما رہا ہے..... تمہارے اندر چھپی
ہوئی طاقتوں کو باہر نکالنے کے سامان کر رہا ہے۔
اسے یہ کرنے دو اس کے ساتھ تعاون کرو۔“
لائم چلا گیا..... وہ اسے ایک آخری بار ہاسپٹل
جانے پر راضی کر گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ہاسپٹل آگئی تھی۔ دو گھنٹے کی میٹنگ، دس
ڈاکٹروں کا بورڈ، اس کی سب رپورٹس اور ان کی امید
بھری باتیں..... وہ بے نیازی سے اپنے ناخن چبائی
رہی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ جب وہ بول بول کر
تھک گئے تو اس نے سب کی طرف دیکھ کر سرد مہری
سے پوچھا۔

”میں نے سب باتیں سن لیں، سمجھ لیں۔ بس
ایک سوال کا جواب دے دیں۔ کیا میں زندہ رہوں
گی؟“

”ہمیشہ تو کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔“ ہیڈ
ڈاکٹر نے کہا۔

”کیا میں کم سے کم چالیس پچاس سال اور
زندہ رہوں گی؟“

”میں چالیس پچاس سکیئنڈز بعد زندہ ہوں گا یا
نہیں یہ میں بھی نہیں جانتا۔“

”میں جانتی ہوں..... آپ چالیس پچاس
سال بعد بھی زندہ رہیں گے، کیونکہ آپ اس کرسی پر
نہیں بیٹھے جس پر میں بیٹھی ہوں۔“ وہ کرسی الٹ کر
کھڑی ہو گئی۔ ”میں حقیقت تسلیم کر چکی ہوں۔ آپ

سب بھی کر لیں اور مجھے بے ہودہ خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکانا بند کریں۔ میں آپ کو خود کو دھوکا دینے نہیں دوں گی۔“ وہ میٹنگ روم سے باہر آ گئی۔ وہ واپس پرانے فیر میں چلی گئی تھی۔

اس کی چال میں تندی تھی۔ وہ راہداری عبور کر رہی تھی کہ اسے ٹیرس پر کھڑی بچی پر شیلے کے ہونے کا گمان ہوا۔ تیز تیز اٹھتے اس کے قدم مٹھ گئے۔ وہ شیلے نہیں ہو سکتی، یہ دیکھنے کے لیے وہ اس کی سمت بڑھ گئی۔

وہ شیلے ہی تھی۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں پھول تھے۔

”شیلے.....! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس نے سر کو اس کی سمت جھکا کر کہا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔

جواب دینے کے بجائے اس نے پھول اس کی سمت بڑھا دیے۔

”آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آئی ہوں؟“

اس نے اس کے گالوں پر پیار کیا۔

ہنس کر اس نے اپنا رخ آسمان کی سمت پھیر لیا اور ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”مجھے آسمان بہت پسند ہے اور آپ کو؟“

”مجھے.....؟ مجھے اب کچھ بھی پسند نہیں رہا۔“

شیلے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے ہاتھ کی طرح آسمان کی سمت بلند کر دیا۔

”جوزمین پر نہیں ہو سکتا..... وہ آسمان سے ہوتا ہے..... ضرور ہوتا ہے..... اسی لیے مجھے آسمان پسند ہے.....“

اس کا جسم مجسمہ ہوا..... اس نے ایک نظر آسمان اور ایک نظر شیلے کو دیکھا.....

”رونا اچھا ہوتا ہے لیکن یہ طے کر لیں کہ رونے کے بعد ہنستا بھی ہوگا۔“ اسے ننھے ہاتھوں سے وہ اس کے بھیکے گال صاف کرنے لگی۔

وہ ایک دم سے ہنس دی۔

☆☆☆

شیلے کے دیے پھول کمرے میں میز پر رکھے ہیں۔ ان پھولوں پر آسمان کے چراغ کا سایہ پڑ رہا ہے۔

صبح اٹھتے ہی وہ شیلے سے ملنے کے لیے ہاسپٹل جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ اس نے ماما پاپا کے ساتھ ناشتہ بھی کیا تھا۔ باپ کے گال پر پیار کر کے، انہیں آفس جانے کے لیے کہا تھا۔ اپنے لباس پر توجہ دی تھی۔ اچھی طرح سے منہ دھو کر، ماما کی ڈرائنگ کے سامنے کھڑے ہو کر لپ گلوں لگایا اور پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ وہ شیلے سے اچھی حالت میں ملنا چاہتی تھی۔ راستے میں اس نے اس کے لیے پھول اور چاکلیٹس لیں۔ ایک چھوٹا سا بیڑ بھی لے لیا تھا۔

”مجھے شیلے سے ملنا ہے۔ وہ یہاں کسی وارڈ میں ایڈمٹ ہے.....“ کمپیوٹر پر شیلے کا نام ٹائپ کرتے، ریسپشنسٹ کے ہاتھ رک گئے۔ جیسے اسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ہدیٰ کو دیکھا۔ اسے کمپوز ہونے میں کچھ وقت لگا۔

”شیلے؟ نو، دس سال کی بچی“ وہ پوچھ رہی تھی۔

کنفرم کر رہی تھی۔ اس نے سر ہلادیا۔

”میرے ساتھ آئیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سینئر ڈاکٹر کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔

”شیلے تمہیں کہاں ملی تھی ہدیٰ! اور کب؟“ لیڈی ڈاکٹر ریسپشنسٹ کی نسبت کم حیران ہوئی تھیں۔

ہدیٰ نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

”پہلی بار وہ مجھے گھر ملنے آئی تھی۔ پھر وہ مجھے اس ہاسپٹل کے کوریڈور میں ملی تھی۔ اس نے بتایا وہ بھی بیمار ہے۔ یہیں ایڈمٹ ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے ڈاکٹر..... اسے کچھ.....“ وہ گھبرا گئی۔ زبان اٹکنے لگی۔

”وہ ٹھیک ہی ہوگی جہاں بھی ہوگی۔ ان فیکٹ وہ یہاں اٹھارہ سال پہلے آئی تھی۔“ وہ ہنس دی۔

”ڈاکٹر! اس کی عمر نو دس سال ہے۔ آپ کے پاس وہ اٹھارہ سال پہلے کیسے آسکتی ہے؟“
 ”یہ سچ ہے ہدی! یہاں کے ریکارڈ کے مطابق وہ یہاں اٹھارہ سال پہلے آئی تھی۔ وہ ایک یتیم خانے میں رہتی تھی۔ میلی کے نام پر اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ چھ سال تک اس کا علاج چلتا رہا تھا۔ کچھ این جی او نے مل کر اس کا علاج کروایا تھا۔“
 ”چھ سال.....“ اسے جھرجھری آگئی۔ آواز حلق میں دم توڑنے لگی۔

”کیا ہوا تھا اسے؟“
 ”بون کینسر.....“

”بون کینسر.....“ اس کی آواز کپکپا گئی۔
 ”اور پھر..... وہ ٹھیک ہو گئی تھی؟“

”وہ ٹھیک ہو چکی تھی۔ اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ یہاں علاج کے لیے آنے والے اکثر مریض ہم سے شیلے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انہیں پھول دیتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے دے پھول بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ جب وہ مسکراتی ہے تو ان کے دل ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔“

ہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ حیران ڈاکٹر کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے، کیا پوچھے۔

”اس کا مطلب اس وقت شیلے کی عمر کم سے کم ستائیس اٹھائیس سال ہوگی..... تو پھر وہ مجھے..... وہ۔“
 ”جس ایج میں وہ سمجھیں ملی ہے، اس عمر میں وہ بہت زیادہ تکلیف سے گزر رہی تھی۔، آٹھ، نو اور دس سال کی عمر میں۔ ایک نارمل، صحت مند اور طاقت ور انسان، تکلیف کی جس شدت کو برداشت کر سکتا ہے، وہ اس سے تین گنا زیادہ تکلیف برداشت کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ مسکراتی رہتی تھی۔ وہ کبھی روئی بھی نہیں تھی۔“

سینئر ڈاکٹر ز آج بھی اس کے ہمت و حوصلے کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ شاید اللہ کو اس کی یہی بہادری پسند آگئی کہ اسے اُمید کا استعارہ بنا دیا۔ اس

کے ہاتھ میں پھول دے دیے اور چہرے پر مسکراہٹ۔ ”اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اسے کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“

”ینگ شیلے اس وقت کہاں ہے؟“ وہ مشکل سے یہ سوال پوچھ سکی۔

”میں نے کہا نا ہدی! وہ ایک یتیم خانے سے آئی تھی۔ چند اور لوگوں کے کہنے پر اس یتیم خانے سے رابطہ کیا گیا تھا لیکن ان کا کہنا تھا کہ بالغ ہونے پر وہ ملک چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کہاں یہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر اسے زیادہ شد و مد سے اس لیے بھی نہیں ڈھونڈا گیا کہ جن لوگوں سے وہ ملی تھی، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ سب ایسے ہے تو اسے ایسے ہی رہنا دیا جائے۔ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعہ کی کھوج میں نہیں لگنا چاہیے..... اگر یہ اللہ کا کوئی راز ہے اور شیلے اس راز میں شریک ہے تو اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے۔“

وہ بے یقینی سے ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے ایسی کہانی سنارہی تھیں، جس پر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اسے لگا وہ نیند میں ہے، ابھی جاگ جائے گی۔ وہ جاگی تو وہ کڈ ز وارڈ میں تھی۔ وہ وہاں شیلے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن شیلے وہاں بھی نہیں تھی۔ اس نے کچھ نرسز سے شیلے کے بارے میں پوچھا۔ لیکن شیلے کہیں نہیں ملی..... ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ بھری دنیا میں وہ صرف شیلے سے ملنا چاہتی تھی اور بھری دنیا میں وہی غائب ہو گئی تھی۔

اس کے دیے پھول ابھی تک اس کے کمرے کی میز پر رکھے تھے..... پھول وہیں تھے پھر شیلے کہاں تھی؟

گھر آ کر اس نے سب سے پہلے پھولوں کو دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے انہیں اسے قریب کر لیا۔ اس نے ابھی تک ان پھولوں کو سونگھا نہیں تھا۔ وہ انہیں اپنی ناک کے قریب لے آئی۔ اسے عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے دوبارہ انہیں سونگھا اور دیر تک خوشبو کو جا بھتی رہی۔

پھر اس نے گردن کو شانے کی طرف جھکا کر خود کو سونگھا۔ وہ ایک دم سے چونک گئی۔ پھولوں میں سے اس کی اپنی خوشبو آرہی تھی۔ وہ ایک دم سے سہم گئی۔ پھولوں کو اس نے خود سے دیر رکھ دیا، وہ انہیں سہی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی..... تو کیا اب جیسے جیسے پھول مرجھائیں گے ویسے ویسے اس کی صحت کے گرنے کی نشاندہی کریں گے۔ اب یہ پھول اسے بتائیں گے کہ وہ کب تک تروتازہ رہنے والی ہے۔ اس کا سر کھوم رہا تھا۔

”مجھے آسمان پسند ہے۔“ اس کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”جو زمین پر نہیں ہو سکتا، وہ آسمان سے ہوتا ہے۔“

جھپٹ کر اس نے پھول اٹھائے۔ اپنی زندگی کے دنوں کی طرح اس نے انہیں گننا چاہا، لیکن وہ انہیں گن نہیں سکی۔ لگاؤ چھ ہیں۔ پھر لگاؤ چھ سے تو بہت زیادہ ہیں..... اس کی آنکھیں بار بار دھندلا رہی تھیں۔ وہ انہیں انگلی سے الگ الگ کرنے کے باوجود گن نہیں پا رہی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ وہ رو دینے کو تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اس نے وقت بتانے والی ہر شے ختم کر دی تھی، خود کو کتنی بھلا دی، پھر یہ پھول..... یہ اس کی زندگی کی گھڑی بن کر کیوں آگئے تھے..... اسے یہ سزا کیوں دی جا رہی تھی؟

بیک وقت دھمی اور پاگل..... ٹوٹی ہوئی اور غم زدہ..... تنہا اور اکیلی..... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کتنی ہی دیر تک روتی رہی..... اتنی دیر تک کہ دن جو روشن تھا، وہ مدھم ہوتے ہوتے، رات کی روشنی میں ڈوبنے لگا۔ آسمان پر کوئی ستارہ تو ظاہر نہیں ہوا، لیکن ایک ستارہ تھا، جو اس کے قریب ہی..... بس قریب ہی روشن ہو جانے کو تھا۔

میز پر رکھے کرشل کے گلاس نما گل دان کو اس نے کچھ دیر تک گھورا، ہتھیلی سے اپنے آنسو پونچھے اور بڑھ کر گل دان اٹھا لیا اور پوری شدت سے، ساری

نفرت سے، کامل بے یقینی سے، مکمل بے ایمان ہو جانے سے شیشے کی چھت تک اٹھی دیوار پر دسے مارا۔ دُور خاموش پڑی جھیل اور اس کی آب، کنارے خاموش پڑے ہنس اور ان کی آواز..... اس سے آگے درختوں کے جھنڈ اور جھنڈ سے آگے کائنات..... شیشے کی دیوار کے ٹوٹنے کی آواز کائنات کی ہر شے نے سنی۔

شیشے کے ٹکڑے تیز آندھی کی طرح پیچھے کی سمت ٹوٹے..... لیکن ان کے ذروں کے زمین پر گرنے سے کچھ پہلے..... اتنے پہلے کہ انسان پلکیں گرائے اور اٹھا بھی لے۔ اس سے بھی کم وقت میں، روشنی کی سمت سے، سب کچھ کر گزرنے والے آسمان کی بلندی سے۔

وہ آیا.....

وہ اندھیرے میں اندھیرا بن کر آئے تو بھی روشنی ہوتا ہے۔

”سب تعریفیں اللہ کے لیے..... جس نے تمہیں انسان پیدا کیا اور مجھے تمہارا نگران.....“ نگران فرشتہ۔“ اس نے کہا۔

اس کی ایسی زبردست موجودگی پر وہ اسے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

کرشل کا گل دان ٹوٹ چکا تھا۔ شیشے کی دیوار بھی۔ وہ جھک کر کرچیوں میں سے ایک ایک پھول الگ کر رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

نہ وہ دیکھ کر حیران تھی، نہ سن کر۔ اسے ایسا نہیں لگا کہ وہ کسی اجنبی سے مل رہی ہے۔ وہ تو اسے ہمیشہ سے جانتی تھی۔ بچپن سے۔ ایک ایک لمحے سے..... لیکن وہ کبھی اس کی موجودگی کی قائل نہیں ہوئی تھی۔

اس کی آواز نے اسے یاد دلایا کہ یہ آواز اکثر اس کے کانوں میں گونجتی تھی۔ تب یہ آواز ”بے آواز“ تھی، اب یہ کلام تھی۔

جب وہ پہلی بار یونیورسٹی میں کانوڈکیشن کے دوران سیڑھیوں سے گر گئی تھی تو ایک لامکاں لمحے

میں اس کی صورت دکھائی دی تھی۔

”اسے ہی پست کیا جاتا ہے، جسے بلند کرنا ہو۔
اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ ہدیٰ!“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔
پھر جب وہ اوپرا شو سے نکل کر پیرس کی
سڑکوں پر بھاگ رہی، تب وہ اس کے ساتھ ساتھ
تھا۔ اس لڑکی کی صورت جو.....

make the stars came to
out (ستاروں کی قندیلیں جلا دو) گاتی جا رہی تھی۔
وہ ریسٹورنٹ کے باہر لگے اس مزاحیہ بورڈ میں بھی
تھا۔ جو ”کہاں جا رہے ہیں آپ؟ یہاں آئیے،
یہاں منے کے لیے زندگی اور کھانے کے لیے
”امید“ ملتی ہے۔“ کہہ رہا تھا۔

ماں کا ہاتھ چھڑا کر بھاگتا بچہ..... ”آپ نے
کہا تھا۔ زندگی بہت خوب صورت ہے، وہ مجھے پر پل
ڈریس میں بھاگتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ مجھے
اس سے مل لینے دیں۔“

جس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے
بے ہوش ہوئی، لامکاں لمحے میں وہ اسے پھر دکھائی
دیا تھا۔

”جو زمین والے نہیں کر سکتے..... وہ آسمان
والا کرتا ہے۔ اپنے یقین کو بے دار کرو۔ خود کو بیدار
کر دہی!“

وہ بے دار ہو چکی تھی۔ یک ٹک اسے دیکھ رہی
تھی۔ سب پھول سمیٹ کر وہ اس کے قریب آیا اور
ان پھولوں کو اس کی سمت بڑھا دیا۔

”دو تمہارے دائیں بائیں، دو آگے اور پیچھے
ہیں اور ایک میں ہمیشہ ساتھ رہتا ہوں اور میں ہمیشہ
خیر کہتا ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔

”تم نے اپنی طرف کھلنے والے سب
دروازے بند کر دیے تو مجھے اپنی طرف کا دروازہ کھول
کر آنا پڑا..... ہدیٰ! یہ تمہارا نام ہے۔“

☆☆☆

”ہدیٰ..... یہ تمہارا نام ہے۔ درست ہدایت۔
یہ تمہارے نام کا مطلب..... پھر تمہارا عمل بھٹکنا

کیوں ہے؟“ دونوں نے وقت کو کچھ وقت دیا۔

”اب پھر تم مجھے لکھتیں کرنے آئے ہو۔ میرا
کسی بھی بات پر کوئی یقین نہیں ہے۔“ اس نے
”پھر“ کہا۔

وہ اسے پوری طرح سے پہچان چکی تھی۔ جیسے
ہزار سال انسان آئینے سے دور رہے اور ہزار سال
بعد خود کو آئینے میں دیکھے اور فوراً پہچان جائے۔ ”یہ
میں ہوں۔“

یہ وہ تھا..... اس کا فرشتہ..... اپنی چیزیں، اپنے
لوگ، اپنا سایہ، اپنا آپ۔ اپنا نگران پہچاننے میں
وقت نہیں لگتا۔

”ایک خالی ڈبہ بھی تم سے اچھا ہے، کم سے کم
اس میں ہوا تو ہے۔“ وہ بیٹھ چکا تھا۔ وہ بدستور کھڑی
تھی۔

”تم مجھے نچا دکھانے آئے ہو؟“
”خود (مقصد حیات) کو پانے کی کوشش کرو،
اس سے پہلے کہ موت تمہیں پالے۔“ (کانفرس آف
دی برڈز) اس نے کہا۔

وہ نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی..... وہ سوالیہ تھی۔
”جیسے اس لڑکی نے خود کو پایا تھا، وہ بھی بیمار ہو
گئی تھی؟“

”کون لڑکی.....؟“
”تھی..... بہت پیاری لڑکی۔ بہت جرأت
مند۔“

”کیا بیماری تھی اسے.....؟“ اتنے دنوں میں
پہلی بار وہ حسد کا شکار ہوئی تھی۔ کسی کی تعریف پر۔
”جذام (کوڑھ).....“

اسے جھرجھری سی آئی لیکن وہ حیران نہیں ہوئی
تھی۔

”جذام..... یہ قابل علاج ہے۔ لوگ اس
سے مرتے نہیں ہیں۔“ وہ طنز سے ہنس بھی دی تھی۔
”پہلے مرتے تھے ہدیٰ! شرم سے، ذلت

سے۔ تنہائی اور پھٹکار سے۔ سب سے بڑھ کر لعنت
سے۔“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ ہنس نہیں سکا تھا۔
 ”کیا تمہیں کسی نے لعنتی کہا؟ تمہیں پھٹکارا؟
 غلاظت جان کر تمہیں دُور پھینک آئے؟ کیا تمہاری
 ماں کو، دل پر پتھر رکھ کر، باپ کو سینے پر سلیں رکھ کر، خود
 سے الگ کر دینا پڑا؟“

وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے
 دیکھ رہی تھی۔

”کیا تمہارے اس چہرے پر کسی نے تھوک دیا
 اور کہا۔ ”لعنت ہو تم پر؟“ جس پر خدا کی پھٹکار پڑی
 ہے، اس پر ہماری بھی پھٹکار ہو؟“

وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”کیا کہہ رہے ہو۔
 کون تھی وہ.....؟“

”دبیسا.....“ وہ بتانے جا رہا تھا۔ ڈوب چکے
 دن کی روشنی اس کی پشت پر غروب ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

”دبیسا..... یہ اس کا نام ہے.....“

دن کی روشنی اس کی پیشانی سے طلوع ہو رہی
 تھی۔ وہ چھ لڑکیاں یونانی کھیل، کھیل رہی ہیں۔
 پانچ لڑکیاں دائرہ بنا کر کچھ دور دور کھڑی ہیں، چھٹی
 دائرے کے اندر کھڑی ہے۔ جو دائرے کے اندر
 کھڑی ہے، وہ کپڑے سے بنی گیند اوپر اچھال کر،
 دائرے میں کھڑی پانچ میں سے ایک کا نام لے کر
 اپنی جگہ چھوڑ رہی ہے۔
 ”دبیسا.....“

دورین نے نام پکارا اور ہماری دبیسا نے،
 زمین پر گرنے سے پہلے، سرعت سے اچھل کر گیند کو
 پکڑ لیا۔ سر پرنگی چادر، دونوں شانوں سے پیچھے کمر پر
 گری ہے۔ وہیں سے پیچھے ہوا سے لہرا رہی ہے۔
 بادبان کی طرح پھڑپھڑا رہی ہے۔

وہ کافی وقت سے سمندر کنارے یہ کھیل کھیل
 رہی ہیں۔ مشرق کی سمت خاموش گھاٹیوں کا شہر
 دکھائی دیتا ہے اور وہ سامنے سب انسانوں اور ایک
 چڑیل کا شہر..... دبیسا کا شہر۔ چند دنوں کی مسافت
 پر بیت المقدس، ان کا ہمسایہ شہر۔ ہزاروں سال

پرانا، اس دنیا کا وہ ایک شہر.....
 جب وہ اس کھیل سے تھک گئیں تو نشانی رکھ
 کر، چھڑی سے لکڑی کا پہیہ دوڑانے لگیں۔ یہ کھیل
 شہر کے بچوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ ان جیسی بچیاں
 تو نہیں تھیں لیکن اتنی بوڑھی بھی نہیں تھیں کہ یہ کھیل نہ
 کھیل سکتیں۔ دبیسا ان پانچ میں سب سے آگے نکل
 آئی تھی۔ دُور سے آتا گھڑ سوار عین اس کے پہیہ کے
 پاس آ کر رکا۔ پہیہ اپنی دوڑ کا دم توڑ گیا۔ اس نے غصے
 سے گھڑ سوار کو گھورا۔ شہر کے اندھے کو بھی اتنی عقل تھی کہ
 ”دبیسا“ کا راستہ نہیں کاٹنا..... یہ کون سا اندھا تھا جس
 نے اس کی دوڑ کو کاٹ دیا تھا۔ اس کی سہیلیاں ہنسی دباتی
 ہوئی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

”کیا چاہیے؟“ ہوا سے اس کی چادر پھڑ
 پھڑا رہی تھی اور غصے سے نتھنے۔

”دبیسا.....“ وہ اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔

”ایسا سا ہی نام ہے اس لڑکی کا۔ سنا ہے وہ
 یہاں کی سب سے حسین لڑکی ہے۔ دو دن سے میں
 اس شہر میں ہوں، سوچا شاید تم میں سے ہی کوئی ہو۔
 سنا ہے اس کا خرہ آفتاب ہے اور مزاج تیز تلوار۔ ایک
 بارد لکھنا چاہتا ہوں اسے۔“

”آں..... تم دبیسا کو دیکھنے آئے ہو۔ اپنی
 صورت آئینے میں دیکھی ہے جو اسے دیکھنے آئے
 ہو۔“ وہ اسے گھور رہی تھی۔

”اگر وہ حسین ہے تو میں ذہین ہوں۔ عقل و
 شعور مجھ پر ختم ہے۔“ اس نے گردن اکڑائی۔ بے
 چاری گردن۔

”جو اپنی زبان سے اپنی عقل کا اظہار کرتا
 ہے۔ وہ بے وفوں کا سردار ہوتا ہے۔“

”بہت تیز زبان ہے تمہاری۔ کیا نام ہے
 تمہارا؟“

”بتاتی ہوں نام، پہلے تمہیں راستہ بتا دوں۔
 دیکھو..... وہ ادھر..... تمہارے دائیں ہاتھ کنواں
 ہے۔ اس میں کود جاؤ..... ورنہ بائیں ہاتھ تھوڑا سفر
 کرو، ایک گھائی آئے گی، اس پر سے کود جاؤ۔ اگر یہ

بھی منظور نہیں تو ذرا انتظار کرو، میں مطب سے تمہیں زہر لادیتی ہوں۔“

”زہر کیوں دبیسو! تمہارے دانت ناکارہ ہو گئے ہیں کیا؟“ اس کی سہیلی نے اسے یاد دلایا، جلا دہیلی۔
”دانت؟ کیا مطلب ہے تمہارا۔“ کس کے دانت؟ کیسے دانت؟“ بے چارہ گھڑ سوار۔

”مطلب صاف ہے، لوگ کہتے ہیں، میرا کاٹا بانی مانگے بغیر دل بند ہو جانے سے مر جاتا ہے۔ اب اگر تم ایسے مرنا ہی چاہتے ہو تو بس یہ بتا دو تمہاری قبر کہاں بنائی جائے۔ گھوڑے پر لاد کر سمندر میں پھینک دی جائے۔ یا لکڑیاں دہکا کر جھونک دی جائے۔ میرا خیال ہے آگ دہکا کر جھونک دی جائے، عرصہ ہوا شہر کو دھونی نہیں ملی۔ کیڑے مکوڑوں نے جان عذاب کر رکھی ہے۔ تمہاری دھونی سے وہ بھی مر مر جائیں گے۔“

”تو تم ہی دبیسو ہو؟ تمہاری زبان ہے یا کسی رومی کی تلوار؟ سانس لینے کے لیے رکتی ہے یا بس سانس کاٹ ڈالتی ہے؟“

”تمہیں لگا کہ رومیوں کا ذکر کرنے پر میں تمہیں جھک کر سلام کروں گی۔ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ ٹھہرو مجھے جھک کر سلام کر لینے دو۔“ وہ چلتی ہوئی اس کے قریب گئی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ میں تب آیا جب اس کے دانت اس کی ٹانگ کے گوشت اور ہڈی میں پوسٹ ہو گئے۔

کھلا سمندر..... خاموش گھاٹیاں اور ہنستا بستا شہر..... سب دبیسو کے کرتوتوں اور گھڑ سوار کی چیخوں سے گونج اٹھے۔

☆☆☆

”دبیسو، دبیسو..... میں تمہارا کیا کروں۔ کسی سے شادی کرو گی یا نہیں؟“ وہ چڑ کر پوچھ رہے تھے۔
”والد..... والد..... والد..... مجھ سے نرم لہجے میں بات کریں۔ آپ کا لہجہ میرے دانتوں کی کاٹ سے زیادہ تیز نہیں ہونا چاہیے۔“ پتھر کی سل پر کھینچی لگیروں پر وہ گواٹیاں رکھ رہی تھی۔

انہوں نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔

”وہ اچھا ہوش مند نو جوان تھا دبیسو! تمہارے چچا نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔“ اب ان کی آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ دبیسو کی ہنسی نکل گئی۔

”واہ! کیا ہوش مند تھا۔ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ سقراط کے پیالے میں کیا تھا۔“ گوئی کھسکا کر چال چلی۔

”کیا تھا؟ زہر نہیں تھا کیا؟“ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنی داڑھی کھجار رہے تھے۔ گوئی داڑھی میں الجھ گئی۔

”والد! آپ کو بھی نہیں معلوم..... والد آپ کو بھی.....“ وہ چلا آگئی۔ کھینچ کر ڈاڑھی سے گوٹ الگ کی۔

”آں دبیسو..... وہ..... دراصل..... مجھے یاد تھا لیکن..... پتا نہیں کیسے بھول گیا۔ بتا دو میری جان کیا تھا اس میں۔“

”زہر تھا اور کیا..... وہ کہنے لگا سقراط کے پیالے میں سقراط کا اپنا عکس تھا۔ جب اس نے جھانک کر پیالے میں دیکھا تو اسے اپنی شکل دکھائی دی۔ میں نے اس کی شکل کی طرف گھور کر دیکھا۔ اور کہا۔“

”پیالے میں شقران پودے کا زہر تھا۔ لیکن تمہارے بھدے پیالہ نما سر میں عقل کی جگہ وہم، فتور، دھول سب ہے۔ ایک نیک کام کرو، تھوڑا سا زہر تم بھی پی لو۔ جب سقراط مر گیا تو تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔“

”تمہیں سقراط، وقراط سے کیا لینا دینا میری دبیسو! گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں، میرے لاڈ پیار نے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔ سارے شہر کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ سب لڑکیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ تمہاری سب سہیلیاں لڑکوں میں سو سو کیڑے نکالتی ہیں۔“

”مردوں میں جانوروں کی اور بھی قسمیں ہوتی ہیں والد! آپ یہ جو ہے ہی کیوں ڈھونڈتے ہیں۔“ خچروں کے ساتھ تو گزارا بالکل ہی مشکل ہے.....

بلکہ محال ہے۔ کیا خطہ زمین پر شیروں کی کوئی قسم موجود نہیں؟“

”شیر رومی اکھاڑوں میں نبرد آزما ہیں۔ اب بتاؤ وہ گھر کیسے بسائیں۔“ وہ چڑ گئے۔

”جبکہ ان نخچروں کو ان اکھاڑوں میں کھینا چاہیے۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”دبیسا۔“ ان کی آواز ذرا پھر سے بلند ہوئی۔

”والد.....! چپ کر جائیں والد..... چپ کر

جائیں۔“ اس نے چیخ کر گوئی ماری۔ گوئی تو چیخ گئی لیکن والد سہم گئے۔

”ساری دنیا میرے حسن سے رعب کھاتی

ہے۔ آپ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے

ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ دبیسا کا باپ کیسا ظالم

ہے۔ رومی کیا کہیں گے۔ دبیسا کا باپ کیسا جلاد

ہے۔ رومیوں کی بیویاں کیا کہیں گی؟ دبیسا کا والد

کیسا سخت کلام ہے..... نہ کریں والد.....! نہ کریں۔

ورنہ آپ کے ہاتھ پیر باندھ کر میں آپ کو گھائی تک

لے جاؤں گی۔ وہاں چھوڑ آؤں گی..... چھوڑ کر بھول

آؤں گی۔ ہزاروں سال بعد جب آپ کو لینے جاؤں

گی تو پھر یہی کہوں گی۔

”چپ کر جائیں والد! میرے لیے یہ چو ہے

ڈھونڈنا بند کر دیں۔“

والد کا ہنس ہنس کر برا حال ہو چکا تھا۔

”دبیسا تمہاری زبان..... تمہارا کلام..... میرا

تو دل موہ لیتا ہے میری جان! پر شہر کے لوگوں پر رحم

کرو، انہیں کاٹنا بند کرو۔ گھر میں سبزیاں پھل سب

رکھے ہیں۔ بھیڑیں بھی ہیں، انہیں کام میں لے

آؤ۔ چاہو تو کچا گوشت کھایا کرو، لیکن اجنبیوں کو

کاٹنا بند کرو۔ شہر کے لوگوں نے تو عرصہ ہوا تمہارے

تیز دانتوں کے وار پر واویلا مچانا چھوڑ دیا۔

شہر بھر میں شاید ہی کوئی خوش قسمت ایسا بچا ہوگا،

جو تمہارے دانتوں کے وار سے بچ گیا ہوگا۔ آج تم نے

ایک خاتون کے بھائی کو کاٹ کھایا۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر بد

دعائیں دے رہی تھی وہ تمہیں۔ وہ تو تمہیں جان سے مار

ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بہت مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ تین بھیڑوں پر معاملہ ختم ہوا۔ اگر سچ کہوں تو تم نے اسے ایسے کاٹا کہ اس سے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ دبیسا بس کر.....“

”آپ پھر بولے والد..... پھر بولے آپ؟“

اس نے کپڑا پکڑ کر والد کے ہاتھ باندھنے شروع کر

دیے۔ پھر دوسرے کپڑے سے ان کا منہ باندھ دیا۔

دہلیز تک جا کر اصطبل کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

اصطبل کا ملازم جلدی سے گھوڑا لے آیا۔ والد کو اسی

حالت میں گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھایا۔ خود وہ اپنے

گھوڑے پر بیٹھی اور والد کے گھوڑے کو گھائیوں کی

طرف لے جانے لگی۔

وہ جو کہتی تھی..... وہ کرتی تھی۔

دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

بازار کے لوگوں نے دبیسا کے والد کو ایسی حالت میں

دیکھا تو ہنسنے لگے۔ والد خود بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن

دبیسا نہیں ہنس رہی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ جب کسی کو

سزا دی جائے تو پھر سنجیدہ رہا جائے، ورنہ سزا ایک

مذاق بن کر رہ جائے گی۔

”دبیسا! اپنے والد کو کہاں لے جا رہی ہو؟“

سبزیوں، پھلوں کی ٹوکریوں کے ڈھیر کے پاس

کھڑے چچا نے پوچھا۔

”والد کو سبق سکھانے..... گھائی تک لے جا

رہی ہوں۔ بہت دن ہوئے انہوں نے سورج کو

غروب ہوتے نہیں دیکھا۔“

”لیکن وہاں تو بہت چو ہے ہوتے ہیں۔“ چچا

نے فکر مندی سے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ لیا۔

”بہت دن ہوئے، انہوں نے چو ہے بھی نہیں

دیکھے۔“ اس نے ہنسی دبانے والوں کو گھور کر دیکھا۔

ایک ایک کو۔

”وہ چو ہے تو بہت زہریلے ہیں، کاٹتے ہیں تو

ناسور بن جاتا ہے۔“

”آپ کی بہت سلام دعا ہے ان چوہوں سے

چچا! آئیں آپ کو بھی ان سے ملو لائی ہوں۔ اپنا

مال چال کہہ لیجیے گا ان کا سن لیجیے گا۔ جی چاہے تو ایک آدھ کو بھون کر کھا بھی جائے گا۔“

بازار کے لوگ ہنسنے لگے۔ اس کی حرکتیں بیکانہ، بے وقوفانہ، باتیں دلیرانہ، دلربا تھیں۔ وہ کسی سے ڈرتی ہی نہیں تھی۔

”اچھا یہ تربوز لیتی جاؤ۔ بہت میٹھا ہے۔ راستے میں کھا لینا۔“ چچا نے ایک تربوز دو ٹکڑے کر کے اس کی سمت بڑھایا۔ چچا پر احسان کرتے ہوئے اس نے تربوز قبول کر لیا، اور تربوز کے سینے میں انت گاڑ دیے۔

”اتنا بھی میٹھا نہیں ہے جتنا چھک کر آپ نے کھا تھا۔“ تربوز تو واقعی میٹھا تھا، لیکن وہ اتنی جلدی کیوں مانتی۔

”تربوز لیا ہے تو شکریہ بھی کہہ دو دبیس۔“ چچا آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اس نے لگام کو جھٹکا دیا۔

”چچا! لگتا ہے آپ کا بھی گھائی تک جائے بغیر بازار نہیں ہوگا۔ آپ کی پسلی پھڑک رہی ہے۔ آپ الفت سے والد کے پیچھے بیٹھیں گے یا میں نیچے اتر کر یہ انتظام کروں؟“

چچا نے شریفانہ سا قہقہہ لگایا۔ ہاتھ جوڑ دیے۔

”ناں، ناناں..... اپنے والد کو ہی لے لو۔ میں اپنی پسلی کا علاج کرواتا ہوں۔ دوبارہ یہ ہمارے سامنے نہیں پھڑکے گی۔ ویسے ایک بات ہے دبیس! میری خواہش ہے کہ تمہاری شادی کسی دی سے ہو، تاکہ جو آدھی دنیا فتح ہونے سے رہ گئی ہے وہ تم فتح کر لو۔ تلوار تمہارے کس کام آئے گی، سب زبان ہی سب کام کرنے کے لیے کافی ہے۔“

”والد کی ایک تلوار دیوار پر لٹکی ہے، کہیں تو آپ کا کام اس سے تمام کر دوں؟“

ایک زوردار قہقہہ بازار میں گونجا۔ سب ہنسنے لگے۔

”آپ کی پسلی کا تو پتا نہیں لیکن اب میری پسلی کٹنے لگی ہے۔“ وہ گھوڑے سے اترنے لگی تو چچا

قہقہہ لگاتے ہوئے، بازار سے بھاگ گئے۔

☆☆☆

دونوں باپ بیٹی ایک گھائی کی بلندی پر پیرائکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سمندر کی لہروں کا شور، پرندوں کی چہچہائیں، ہوا کی سرمستیاں، اور غروب ہوتے سورج کی الوادعی کرنیں..... دنیا کیسی خوب صورت تھی۔

”ایک اور سورج غروب ہو گیا۔“ والد نے آہ بھر کر کہا۔

”آج کا سورج، کل کے سورج کے لیے رخصت ہو گیا۔ آپ نے ایسے کیوں نہیں کہا والد؟“

تربوز کھاتے دبیس نے پوچھا۔

وہ ہنس دیے۔

”تم بچی ہو۔ تمہارے پاس بہت سورج پڑے ہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ایک ایک سورج کو انگلیوں پر گنتا ہوں۔ میری عمر کے دن ہی کتنے بچیں ہوں گے۔“

”زندگی میں بہت سورج دیکھے، اب اگلی زندگی کا سورج دیکھنا چاہتا ہوں۔“ آپ نے ایسے کیوں نہیں سوچا؟“

وہ ہنسنے لگے۔

”تم پر امید ہو۔“

”آپ کے نامید ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

”تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا؟“

”کیا زندگی نے آپ کو ڈرایا؟ اگر نہیں تو پھر موت سے کیسی ناراضی؟“

”اگر میں مرجاؤں تو کیا تمہیں دکھ نہیں ہوگا۔“

وہ حیران اپنی دبیس کی صورت دیکھ رہے تھے۔

”بہت ہوگا۔ غم سے میرا دل پھٹ جائے گا۔ لیکن کیا آپ اکیلے ہیں جو مرجائیں گے؟ کیا میں ہمیشہ زندہ رہوں گی؟“ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

”مجھے تم پر فخر ہے دبیس!“ وہ لاجواب ہو چکے تھے۔

”آپ کو مجھ پر ہمیشہ فخر رہے گا۔“

”پھر ایسا کرو، لوگوں کو کاٹنا بند کر دو۔ جب

لوگ اپنی کھال پر تمہارے دانت دکھاتے ہیں تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔“

”زیادہ روشنی بھی اچھی نہیں ہوتی والد! کبھی کبھی اندھیروں سے بھی سلام دعا کر لینی چاہیے۔ ایسے روشنی کی قدر بڑھ جاتی ہے۔“

”میری دبیس! لوگوں پر رحم کرو۔ تم کاٹی کیوں ہو؟ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔“

”اچھے سے اچھے انسان میں بھی ایک بری خصلت ہوتی ہے والد!“

”پر وہ تو اچھے انسان میں ہوتی ہے۔ میں تو تمہاری بات کر رہا ہوں۔“

دبیس نے گھور کر باپ کو دیکھا اور باپ کا قہقہہ گھائیوں کے سناٹوں میں گونجنے لگا۔

”بہت دن ہوئے، آپ کی میری دانتوں سے سلام دعا نہیں ہوئی۔“ اس نے باپ کی کلائی پکڑ لی۔ ”اب آپ کو یاد رہے گا کہ مجھ سے سوال کرنے کا، جواب کہاں ملتا ہے۔ اب جب آپ اس پر مرہم لگائیں گے، تکلیف سے رات بھر سو نہیں پائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دبیس پر طنز کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔“

وہ اس سے اپنی کلائی آزاد کروانے کی ذرا برابر بھی کوشش نہیں کر رہے تھے۔

”میں کاٹ لوں گی والد! آپ جانتے ہیں مجھے۔“ وہ دانت گاڑنے ہی والی تھی۔

”کاٹ لو میری دبیس! مجھے سفر پر جانا ہے۔ جب جب اس زخم میں تکلیف ہوگی، تب تب تم مجھے یاد آؤ گی۔“

”میں آپ کو ٹھیک طرح سے یاد آؤں۔ اس لیے میں ٹھیک طرح سے کاٹ.....“

بات اور کام ادھورا رہ گیا۔ دُور سے آتی گھنٹیوں کی آواز ایک دم سے بہت قریب آ گئی۔

والد نے جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے جدا کیا اور اس کے سر پر مٹی چادر کو پکڑ کر گردن سے نیچے تک پینچ دیا۔ وہ چادر میں پوری چھپ گئی۔

گھنٹیاں قریب آ چکی تھیں۔ دبیس نے چادر کو ذرا سا پرے کرنا چاہا تو والد نے بھڑک کر اس کے جسم پر ضرب لگائی۔ چادر کی بکل پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چٹان کی طرح سخت ہو چکے تھے۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کچھ رحم کرو شہر کے لوگوں پر۔“ وہ ڈھال بن کر دبیس کے سامنے کھڑے تھے۔

وہ دور گھائیوں سے کوڑھیوں کے ٹھکانے سے نکل کر آئی تھی۔ ہاتھ میں سہارے کی چھڑی تھی، جس کے اوپری کنارے پر گھنٹیاں بندھی تھیں۔ وہ اپنے دو پیروں کے بغیر تو شہر کی طرف آ سکتی تھی لیکن ان گھنٹیوں کے بغیر نہیں آ سکتی تھی۔ ورنہ شہر کے لوگ اسے چیر پھاڑ ڈالتے۔

ضعیفہ (بوڑھی) نے گہری آہ بھری۔

”میرے والد کو بھی مجھ سے بہت پیار تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ مجھے کوڑھ ہوا تو وہ جیتے جی مر گئے۔“

”میں نے تم سے کہا کہ تمہیں گھاٹی سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔“ والد کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔

”تم سب ایسے کیوں نہیں کہتے کہ ہمیں سانس لینا بھی چھوڑ دینا چاہیے تھا؟ اس زمین کے ہر انسان، اس آسمان کے ایک اللہ نے ہمیں چھوڑ تو دیا..... اب کیا چاہتے ہو؟“

بیٹھے، بیٹھے ہاتھ بڑھا کر اس نے والد کا ہاتھ دبایا کہ ذرا نرمی سے بات کریں۔ والد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”چلو دبیس!“ وہ اسے گھسیٹنے لگے۔ انہیں ضعیفہ کے قریب سے گزر کر جانا تھا لیکن والد نے دوسرا لمبا راستہ اپنایا۔ وہ گھاٹی سے اتر رہے تھے۔

”دبیس! لا جواب کلام کرتی ہو..... ہمارے لیے خدا سے کلام کیوں نہیں کرتیں؟“

وہ چلتے چلتے رک گئی۔

”آپ خود کیوں نہیں کر لیتیں۔ میں ہی کیوں؟“ چادر ابھی تک سینے تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس

لے چلا کر کہنا پڑا۔

”کچھ کو کچھ پر فوقیت ہوتی ہے دبیس! ہمارے اطوار کہتے ہیں، تمہیں خدا کو راضی کرنے کے انداز آتے ہیں۔ تمہاری ایک ایک ادابتاتی ہے، نہیں ”خدا کی مرضی زمین پر لانا آتی ہے۔“ وہ ان کی سمت گھوم کر، بلند آواز سے بولی۔

”کیا بات کرتی ہیں۔ خدا سے میں نے مصری ریشم کے لیے کہا تھا، دورین کی شادی کے لیے۔ ابھی تک اس ریشم سے محروم ہوں۔ اب دورین کی شادی کیا پہنوں گی؟“ اس نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس دیں۔ والد کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کا بازو اپنی گرفت میں لے کر وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹ رہے تھے۔ اس لیے وہ گرتے پڑتے چل رہی تھی۔

”خدا کی مرضی کے آگے، ریشم کی کیا اوقات ہے دبیس!“

”خدا کی مرضی زمین پر لانا کسے کہتے ہیں؟“ اس نے چلا کر پوچھا۔

”جب لے آؤ گی تو جان جاؤ گی۔“ چلا کر ہی جواب ملا۔

اس نے ایک ہاتھ سے چادر کا کونا اٹھا کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ بہت دور کھڑی وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں ہی ہنس دیں۔

دو میں سے ایک کوڑھ زدہ تھی اور ایک ہونے والی تھی۔

ہماری دبیس..... وہ بہت جلد ان گھاٹیوں میں آکر رہنے والی تھی۔

☆☆☆

ریشم کا مصری تھان عین وقت پر پہنچ گیا تھا۔ سفید رنگ کا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے بازار میں ایک رومی عورت کو دیکھا تھا۔ اسے اس جیسا لباس بنوانا تھا۔ وہ مشکل سا تھا لیکن دورین سلائی کڑھائی میں بہت ماہر تھی۔ اس نے اسے سچی زمین پر اس لباس کا

نقشہ بنا کر دکھایا تھا۔

”پر تم اس میں بہت عجیب نہیں لگو گی دبیس؟“ وہی دورین کی کام چوری کی عادت۔

”میں نے تمہیں لباس بنانے کے لیے کہا ہے..... منہ نہیں.....“

”تمہارا یہ ریشم سمندر میں غرق کر آؤں گی۔ مجھ سے کام لے رہی ہو تو احترام بھی دو۔“

”نجانے کیوں، سارا شہر میرا محل آزمانے پر تلا رہتا ہے۔ نہیں لینا مجھے تم سے کوئی کام وام.....“ اس نے منہ پھلا کر کہا اور اپنا ریشم کھینچ لیا۔

”اچھا اچھا..... کوشش کرنی ہوں۔ شاید تمہارا لباس ویسا ہی بن جائے جیسا تمہیں چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن دیکھنا ایسا نہ ہو کہ تمہارے چھوٹے بہن بھائی اس ریشم میں شہر کی گلیوں میں ”خاک“ ہوتے ہوئے ملیں۔ میرا مطلب خاک آلود۔

معاف کرنا اس میں اپنی والدہ کو بھی شامل کر لو۔ میری چیزوں سے انہیں خاص چڑ ہے۔ وہی پسند کرتی ہیں جو میں کرتی ہوں۔ اپنی عمر کا بھی لحاظ نہیں کرتیں۔ یہ نہ ہو مجھ سے پہلے وہ اسے پہن کر بازار خریداری کرنے چلی جائیں۔“

دورین نے دانت پیسے۔ ”والدہ سے کہوں گی، وہ اسے پہن کر خریداری کرنے نہ جائیں، دبیس کا گلا دبائے چلی جائیں۔“

والدہ خریداری کر کے، دبیس کا گلا دبائے آچکی تھیں اور ریشم کو اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔

”کیا نصیب ہیں تمہارے دبیس! کیا ریشم منگوایا ہے تم نے۔“

دبیس نے دورین کو گھور کر دیکھا۔ دورین نے والدہ کے ہاتھ سے تھان کھینچنا چاہا تو انہوں نے اسے پورا کھول کر شانے پر پھیلا لیا۔

”واہ! کمال کا کپڑا ہے۔ کوئی وزن نہیں۔ اسی لیے مصری ریشم مشہور ہے۔ دبیس کپڑا بچے تو.....“

”کپڑا نہیں بچے کا خالہ! دورین کہتی ہے کپڑا کم ہے۔ مشکل سے ہی میرا لباس بنے گا۔“

”دورین تو پاگل ہے۔ میں بناؤں گی تمہارا لباس۔ دیکھنا پھر کتنا کپڑا بچے گا۔“
 ”لیکن پھر آپ کی گردن نہیں بچے گی خالہ۔“
 اس نے دانت پیس کر کہا۔

دورین نے کھانا شروع کر دیا۔ وہ پھر سے اپنی سہیلی اور ماں کی لڑائی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے ریشم سمیٹ کر دبیسہ کے ہاتھ میں دیا۔
 ”دیکھو، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میرے چھوٹے بہن بھائی شرارتی ہیں۔ اسے نقصان پہنچا دیں گے۔ تم لے جاؤ اور خولہ سے بنوالو۔ میری طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں رہتی۔“ وہ اسے اشارے سے کہہ رہی تھی کہ ریشم سمیٹ لو جلدی سے۔ ابھی تو کھسکو۔

”میری بھی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ خالہ! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس کا منہ پورا پھول گیا۔
 ”میری طبیعت تو ایسا اعلا ریشم دیکھ کر باغ باغ ہو چکی ہے۔“

”پھر آپ اس باغ میں چہل قدمی کریں، میں پھر کبھی آؤں گی۔“ خالہ ریشم چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں۔ اسے کھینچتا پڑا۔ خالہ کا منہ بن گیا۔
 وقت کے سمندر میں، دن کا ہد ہد پرواز کر رہا ہے۔

شہر کا دلار پرندہ ”دبیسہ“ گھر کے درخت پر چڑھ کر پھل توڑ رہا ہے۔ ایک پرندہ درخت کی اونچی شاخ پر آکر بیٹھا تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پرندہ اجنبی تھا۔ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔
 ”شہر میں اجنبی پرندہ آیا ہے ماں! میں اس سے باقاعدہ ملاقات چاہتی ہوں۔“ پرندہ درخت سے اڑا تو وہ بھی جلدی سے درخت سے نیچے کود گئی۔ جھولی میں بھرے پھلوں کو ٹوکری میں انڈیل دیا۔
 ”کس لیے دبیسہ؟ اسے بھی کاٹنا ہے۔“
 پرندوں کو تو چھوڑ دو۔

”شہر میں کوئی ایسی ماں نہیں جس کے لہجے میں طنز نہ ہو۔ میری ماں ان سب ماؤں کی سردار ہے۔“
 ”شہر میں کسی کی بیٹی ایسی نہیں جو انسانوں کو پکڑ

پکڑ کر کاٹتی ہو۔ میں خوش نصیب ماؤں میں اکیلی بدنصیب ماں ہوں۔“ ماں نے چڑ کر کہا۔
 ”والد کو مجھ پر فخر ہے۔“ وہ سر اٹھا کر پرندے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔
 ”کاش میں بھی تم باپ بیٹی پر فخر کر سکتی۔ کیسی ڈھیٹ ہو تم۔“ ماں گھر کے کاموں میں ہلکان ہو رہی ہے۔ بیٹی اجنبی پرندوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔
 وہ رات کے کھانے کا انتظام کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

”والدہ! آپ نے سنا نہیں کہ اجنبی پرندے۔ فرشتوں کی صورت ہوتے ہیں۔ وہ خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں۔“

”اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مدد کرواؤ۔ یہ پیغام لایا ہے پرندہ۔“
 ”فرشتے ایسی خراب باتیں نہیں کرتے۔“ وہ گھر کی دہلیز سے باہر جا رہی تھی۔

”گھر کے کام کرنا خراب باتیں ہیں۔ جو تم لوگوں کی کھالیں ادھیڑتی پھرتی ہو؟“
 ”وہ اسی کے مستحق ہیں۔“

پرندہ شہر سے باہر جا رہا تھا۔ ہماری دبیسہ بھی شہر سے باہر جا رہی تھی۔ پھر وہ پرندے کے ساتھ ساتھ گھاٹیوں تک چلی گئی۔ پہلے پرندہ گھاٹیوں کی چوٹیوں پر اڑتا رہا پھر وہ ان گھاٹیوں کے اندر اتر گیا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ ایسا پیارا پرندہ کہاں چلا گیا۔ ایسی گندی اور بدبودار جگہ۔ والد نے اسے اپنی قسم دی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ کبھی اس طرف نہیں جائے گی۔ وہ کوڑھیوں کا ٹھکانہ ہے۔

وہ واپس گھر کی طرف آرہی تھی کہ اسے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی ضعیفہ تھی۔ گھنٹیوں کی آواز، ساری کائنات کی آواز بن گئی تھی۔ وہ شہر کی دہلیز سے بچ بچ کر چل رہی تھی۔ دونوں ایک ہی راستے پر دو مختلف سمتوں میں تھیں۔ وہ شہر کی طرف، وہ شہر سے دور ویرانے کی طرف.....

اچانک ضعیفہ نے اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ

کھڑا کر گر بھی گئی تھی۔ اس کے تکلیف سے بلبلانے
آواز اس تک بھی آرہی تھی..... ایک ساتھ کئی پتھر
یہی جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ زمین پر بے کل
رہی تھی۔ اس کی کھال سے خون بہنے لگا تھا۔ دبیا
گ کر اس کی طرف آئی۔ کچھ دُور، ایک درخت کی
خ پر چڑھ کر بیٹھا خرطوم اسے دکھائی دے گیا
۔ حسبِ عادت شہر کے دوسرے بچوں کو اپنے
تھملا کر وہ کوڑھیوں پر پتھر مارنے میں مصروف
۔ بچے اسے پتھر اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے اور وہ
بے تگ کر مار رہا تھا۔ اس کا نشانہ اتنا پکا تھا، کہ
یہی ناک، کان، آنکھ سے خون بہنے لگا تھا۔
وہ ان کی طرف آندھی طوفان کی طرح لپکی تو
ب اس کی شکل دیکھتے ہی بھاگ گئے، لیکن خرطوم کو
خفت سے اترنے میں وقت لگا۔

”میری شکل کی طرف دیکھو۔ پہچانتے ہو، میں
من ہوں؟“ خرطوم کو گریبان سے ٹھیسٹ کر وہ
من پر پٹخ چکی تھی۔ اور اب اس پر جھکی اس سے پوچھ
رہی تھی۔
”تم اس شہر کی چڑیل ہو..... بلا ہو..... تمہیں
من نہیں پہچانتا۔“ وہ پشت کے بل پیچھے کھسک رہا
۔ دبیا نے اس کے ایک ہاتھ پر اپنا پیر رکھ کر دباؤ
عادیا۔

”اس چڑیل کے دانت دیکھو۔“ اس نے منہ
بول کر اپنے دانت انگلی سے ٹھونک کر پوچھا۔
”نظر آئے.....؟“ اب وہ اس کا ایک کان پکڑ
رشدت سے مروڑنے لگی۔ خرطوم کا دم نکل رہا تھا۔
ف سے اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔

”میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ تمہاری کھال
چالوں گی۔ دوبارہ تمہیں پتھر مارتے دیکھا تو گردن
دبوچ کر، کنوئیں میں پھینک دوں گی۔ آگ جلا کر،
پرائیڈ لٹکا دوں گی۔ تمہاری کھال، تمہارا خون قطرہ
طرہ آگ پر گرے گا۔ کچھ سمجھ میں آئی بات؟“

”معاف کر دو دبیا چڑیل! معاف کر دو۔“
بچے نے اپنا کان آزاد کرانا چاہا۔

”بلند آواز سے کہو کہ دوبارہ پتھر نہیں پھینکو گے۔“
”میں دوبارہ کبھی کسی پر بھی پتھر نہیں پھینکوں
گا۔ دبیا! میرا کان گیا۔ دبیا! میری جان گئی۔“
”ذرا کو، تم پر ایک نشان لگا دوں۔ پتھر مار مار
کر تم نے اسے خون سے نہلا دیا ہے۔ اب تم بھی
دیکھو کہ جب کھال سے خون نکلتا ہے تو کیسا لگتا
ہے۔“ خرطوم کی کلائی آنکھوں کے سامنے لا کر اس
نے اس پر اپنے دانت گاڑ دیے۔
بچے کی پیچ سے پہاڑی گھاٹیاں گونج اٹھیں۔
وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
”ابھی تو میں نے کاٹا ہی نہیں۔ تم چلائے
کیوں؟“

اس نے زیادہ نہیں کاٹا تھا، ”بس کاٹا تھا۔“ اس
بس کاٹا نے بچے کے جسم سے ”جان کا کاٹا“ نکال
ہی دیا تھا۔ وہ زمین پر پشت کے بل کھسکتے ہوئے اٹھ
کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا، چلا رہا
تھا۔ پھر اس نے مٹھیوں میں خاک بھری اور دبیا کی
آنکھوں میں جھونک دی۔ جتنے پتھر ہاتھ آئے انہیں
دبیا پر اچھالنے لگا۔ خاک نے دبیا کی نظروں
سے لچلے بھر کے لیے اسے اوجھل کر دیا تھا۔

وہ شہر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ دبیا بھی اس
کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ گھاٹیوں سے اس کا پرندہ
نکل آیا تھا۔ وہ دبیا کے سر کے اوپر اڑ رہا تھا۔ دبیا
کی چادر بھی تو اڑ رہی تھی۔

ایک پرندہ آسمان کے نیچے اڑ رہا تھا۔
ایک پرندہ زمین کے اوپر اڑ رہا تھا۔
بھاگتا ہوا خرطوم بازار سے گزرا۔ ہفتے کا دن
کام سے آرام کا دن تھا تو آج بہت رش تھا۔ وہ بھیڑ
کو ہاتھ سے دھکیلتا ہوا، چلاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔

”ماں..... ماں..... دبیا چڑیل میرے پیچھے
لگ گئی ہے..... کوئی مجھے بچائے.....“ وہ چلاتا جا رہا
تھا۔ اس نے بازار میں کتنے ہی لوگوں کی چیزیں گرا
دی تھیں۔

دبیا چڑیل نے شہر کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ لوگوں

کو دھکے دیتی ہوئی خرطوم کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔
وہ اس کا خون پی لینا چاہتی تھی۔
”ماں..... کوئی مجھے بچائے۔ دبیسا.....
دبیسا..... وہ آئی.....“

وہ چلاتا جا رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ اپنے گھر کی طرف
بھاگ رہا تھا۔ دبیسا کا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے پہنچتے
رہ جاتا تھا۔ ہوا سے اڑنی اس کی چادر، اس کے سر پر اڑتا
ہوا پرندہ، اس کے آنکھوں کی تندہ..... شہر والوں نے
اس دن دبیسا کو نئے ہی روپ میں دیکھا تھا۔ وہ خرطوم کو
کھا جانا چاہتی تھی۔ تربوز والے چچا نے دبیسا کو روکنا
چاہا، وہ کچھ دور تک دونوں کے پیچھے بھاگے بھی لیکن کوئی
فائدہ نہیں ہوا۔

”ماں..... ماں.....“

خرطوم کی چیخیں، شہر کا سکون تباہ کر رہی تھیں۔
کتنی ہی عورتیں گھروں سے باہر نکل کر دیکھ رہی تھیں
کہ کس ماں کو ایسے قیامت خیز انداز میں بلایا جا رہا
ہے۔ بچوں نے اپنا کھیل کھیلنا بند کر دیا تھا۔ وہ سب
کے کھیل تباہ کرتا، اپنے گھر کی سمت بھاگ رہا تھا۔

نہ بچہ رک رہا تھا، نہ دبیسا.....

”یہ مجھے مار ڈالے گی ماں.....“ بچہ گھر کا
دروازہ دھاڑ بند کر چکا تھا۔ ماں کے ہاتھ سے کوئی
برتن گر کر ٹوٹا تھا۔

دبیسا نے بند دروازے کو دھکا لگایا تو وہ کھلا
نہیں۔ اس نے پوری قوت لگا کر ایک اور دھکا لگایا،
دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ دونوں پٹ وا ہو گئے۔ وہ
گرتے گرتے بچی۔ خرطوم جلدی سے ماں کے پیچھے
چھپ گیا۔ وہ اس کی طرف لپکی۔

”یہ کیا طریقہ ہے دبیسا! خرطوم کا دم نکلا جا رہا
ہے۔ کیوں بچے کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہو۔“

دبیسا کا اپنا سانس نکلا جا رہا تھا۔ پیٹ پھٹ
پڑنے کو تھا لیکن اس نے سانس کو ایسے قابو میں رکھا
کہ حالت ظاہر نہ ہو۔ دو بدو جنگ کرنی ہو تو اپنی
کمزوری نہیں برداشت ظاہر کرتے ہیں۔ دبیسا کا
لگایا نیا تماشا دیکھنے کے لیے آس پاس کی مائیں بھی

گھر کے اندر آ چکی تھیں۔

”یہ اس کوڑھی کو پتھر مار رہا تھا۔“ اس نے لپک
کر خرطوم کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ ماں نے اس
کے ہاتھ کو بری طرح سے جھٹک کر پرے کیا۔

”وہ کوڑھی تمہاری ماں لگتی ہے؟ اچھا کیا پتھر
مارے تو۔ کیوں آتی ہے وہ شہر کی طرف۔ ہم سب کو
بھی کوڑھی کرے گی۔“

”وہ کوڑھی میری ماں ہوتی تو یہ اپنے پیروں پر
بھاگ کر اپنی ماں کے پیچھے آ کر چھپ نہ جاتا.....“

”اچھا! ایسی ہی شہ زور ہو تم؟ سنا آپ نے، یہ
کیسے بات کرتی ہے؟؟“ وہ گھر میں جھانکنے والے
مردوں اور گھر میں کھڑی عورتوں سے کہہ رہی تھی۔

”ساری دنیا کو اکٹھا کر لیں، انہیں سنا میں،
بتائیں کہ میں کیا کرتی ہوں لیکن میں ڈرتی نہیں
ہوں۔ اس نے کوڑھی کو پتھر مارے۔ اس کی کھال
پھٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ وہ پہلے ہی اتنی تکلیف میں
ہے۔ اس نے اسے اور تکلیف کیوں دی۔ میں اس
کی کھال سے بھی ویسے ہی خون نکالوں گی.....“

”اپنی کھال کا خون بچا کر رکھو دبیسا! مجھے بھی
کم نہ سمجھنا۔ ایسی ہی ہمدردی ہے ان کوڑھیوں سے تو
ان کے پاس جا کر کیوں نہیں رہتیں۔ ساری دنیا میں
بھاگتی دوڑتی پھرتی ہو۔ کیا تمہیں تمہارے باپ نے
قسم نہیں دے رکھی کہ تم گھائیوں تک نہیں جاؤ گی۔
ایسی ہی نڈر ہو تو توڑ دو یہ قسم..... ایسی ہی بہادر ہو تو
روز جایا کرو وہاں۔“

”وہ تو کوڑھی ہیں، آپ کو کون سا مرض لاحق
ہے؟ جو زبان بھی بد بو دے رہی ہے اور اخلاق
بھی۔ یہ تو کوڑھ سے بھی زیادہ غلیظ ہے۔“

”تمہاری غلاظت کو سارا شہر جھیل رہا ہے
دبیسا! تمہارا باپ دولت مند ہے تو کیا سارے شہر کو
غلام بنا لے گا؟ دوبارہ میرے بچے کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ
کاٹ دوں گی۔“

”اپنی زبان کیوں نہیں کاٹ لیتیں..... اپنے
بچے کا ہاتھ کاٹیں.....“

”دبیا چڑیل تو کوڑھی ہوگی تو میں تجھ پر بھی ایسے ہی پتھر برساؤں گا۔ میں مار مار کر تجھے لہولہاں کر دوں گا۔ تو نے میرا بازو کاٹ کھایا ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“ خرطوم میں ہمت آگئی تھی۔

دبیا طنز سے ہنسی۔

”مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ شہر میں انسانوں کے ساتھ ساتھ بھیڑیے بھی رہتے ہیں۔ خدا کی اس زمین پر، انسانوں کی کھال میں، شیطان بھی رہتے ہیں۔“

”تو خود کسی شیطان سے کم ہے۔ سارا شہر تیرے شر سے پناہ مانگتا ہے.....“

”میں آپ کی ”خیر“ سے پناہ مانگتی ہوں.....“ وہ استہزائیہ ہنس دی۔

”اس لاڈلے کو اپنی ممتا کی پناہ میں رکھنا خالہ! یہ اس گھر سے باہر جہاں مجھے نظر آگیا، وہیں اس کی قبر بنے گی۔“

بچہ خوف سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا ایسا ہی ہوگا۔

”دبیا تو کوڑھی ہو کر مرے.....“

دبیا دہلیز سے باہر اپنا پاؤں نکال چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ”مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا خرطوم!“

”تجھے کوڑھ سے لگے گا، جب تیری کھال بدبو دینے لگے گی۔ تیرا حسن نحوست زدہ ہو جائے گا۔ اس شہر کی حسین لڑکی جب اس شہر کی سب سے کریہہ صورت لڑکی ہو جائے گی۔ جب تیرا ٹھکانا یہ شہر نہیں، کوڑھیوں کا شہر ہوگا۔ تب تو ڈرے گی۔“ ماں نے نفرت سے کہا۔

اس نے چوکھٹ کو ہاتھ سے دبوج لیا۔ شہر کی سب سے حسین لڑکی، شہر کی سب سے شریر لڑکی۔ دبیا..... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خاموش ہو کر جا رہی تھی۔

☆☆☆

شہر کی سب سے حسین لڑکی، شہر کی سب سے شریر لڑکی..... ان کی دبیا.....

اسے شہر کی عورتیں زیادہ پسند نہیں کرتی تھیں لیکن شہر کے بڑے بوڑھے، اور دانا اسے پسند کرتے تھے۔ جو دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، وہ اگر باغی نہیں تو خلیفہ ہوتا ہے۔ والد کے سفر کے سبب قصے اسے یاد تھے۔ شہر کے سب داناؤں کا وہ سر کھا چکی تھی۔ شہر میں اتنے گھر نہیں تھے جتنے اس کے کارنامے تھے۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا بچہ یا بچی ہو جو اس کے ساتھ کھیلا ہو اور اس کے ہاتھوں لہولہاں نہ ہوا ہو۔

والد نے کبھی اناج، کبھی سکے، کبھی ریشم، کبھی بھیڑیں، کبھی دنبے، کبھی ظروف دے کر ان لڑائی جھگڑوں کو پنپایا تھا۔ ماؤں کو وہ ناپسند تھی، ان ماؤں کی بیٹیوں کی اس میں جان تھی۔ مائیں انہیں دبیا سے دوستی پر کوستیں تو وہ کہہ دیتیں۔

”اس کا دل بہت صاف ہے۔ وہ بہت اچھی ہے۔“

”اس کے دانت اور زبان بھی بہت صاف ہیں۔ کتنے نشان ہیں تمہاری کلائی پر اس کے دانتوں کے؟“

”ماں..... یہ تو اس کی محبت ہے۔“

”محبت..... ایسے کاٹ کر؟“

”آپ کیا جانیں والدہ! اس کی طرف کیسا دل کھینچتا ہے۔ وہ جتنی بری لگتی ہے، اس سے کہیں اچھی ہے۔“

ماں نے کونکے کریدنے کا گرم چمٹا خولہ کی کمر میں داغا۔

”یہ میری محبت کا نشان ہے، دیکھنا دل کھینچا میری طرف؟“

اس کی جان کھینچ کر حلق میں آگئی تھی۔ وہ اپنی کمر مسل رہی تھی۔

اسے آنکھیں مسلنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی تھی اور وہ بستر پر گرتے ہی سو جایا کرتی تھی۔ اسے کوئی فکر

ہلکان نہیں رکھتی تھی۔ ماں کی خفگی پر وہ ایک صراحی کمر پر رکھ کر، ایک شانے پر سنبھال کر پانی بھرنے چلی جاتی تھی۔ لیکن راستے میں ہی کوئی ایک صراحی توڑ آتی تھی۔ جب صراحی گرنی اور پانی ایک دم چھپک سے زمین میں جذب ہونے لگتا تو وہ ہنسنے لگتی۔ اس کی سہیلیاں اس کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ وہ ہاتھ جھلاتی ہوئی آرہی ہوتی اور پانی انہوں نے اٹھا رکھا ہوتا۔ وہ ماں کے کہنے سے کپڑے دھونے بھی چلی جایا کرتی تھی۔ لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کپڑا پورا دھل بھی گیا ہو اور پھٹا بھی نہ ہو۔ وہ پتھر پر کپڑے گواہیے دے دے کر مارتی، کہ گھر واپسی پر ماں سے بچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ماں کپڑے اٹھاتی جاتی، ہائے ہائے کرتی جاتی۔

اس کی دو چھوٹی بہنیں اور چار بھائی تھے۔ سب سے چھوٹا ماں کی گود میں تھا۔ ایک نے کچھ وقت پہلے چلنا شروع کیا تھا۔ سب بہن بھائی بس کھیلتے کودتے پھرتے تھے۔ ماں اکیلی ہی گھر کے سب کام کرتی تھی۔ گھر کے کاموں کے لیے دو مددگار تو تھے لیکن گھر اتنا بڑا، اور کام اتنے زیادہ تھے کہ کام ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ پھر اس کی عمر کی سب لڑکیاں گھروں میں کام کرتی تھیں۔

ایک بار اس نے ماں کی ڈانٹ سے بے زار ہو کر تنور میں روٹیاں لگانے کی کوشش کی تھی۔ تنور گرم تھا..... تنور گرم ہی ہوتا ہے۔ اسے تھوڑا ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے پانی انڈیل دیا تھا۔ ماں چیختی ہوئی اس کی طرف لپکی، تو وہ ڈر گئی۔

”وہ تنور گرم تھا بہت..... اس لیے.....“ وہ واقعی میں ڈر گئی تھی۔

”تو اب تم پانی پر روٹیاں لگاؤ گی؟ تمہیں جادو بھی آتا ہے۔ بد بخت..... تو میرے ہی گھر کیوں پیدا ہوئی دبیس۔“

اس نے رونی صورت بنا کر ماں کو دیکھا۔ موٹے موٹے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے رو کر

دکھایا ہو۔ وہ روتی نہیں تھی۔ ماں کے دل کو بڑا دکھا لگا، لپک کر اسے گلے سے لگالینا چاہا لیکن وہ گھر سے باہر بھاگ گئی۔

”مجھے بد بخت کیوں کہا.....“ اسے ایک اس لفظ نے تکلیف دی تھی۔ جاتے ہوئے وہ کہہ گئی تھی۔ اس رات کسی نے ماں کے ہاتھ سے بنی گرم روٹیوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آگ پر بھنا نمکین گوشت، دبے کے گوشت کا شوربہ..... کسی نے اس طرف منہ تک نہ کیا۔ سب منہ موڑ موڑ کر بستر میں جاتے رہے۔ رات کے چراغ بجھ گئے لیکن کسی نے چپکے سے بھی اٹھ کر نوالے نہیں توڑے۔

”دبیس! کو بد بخت کیوں کہا.....؟“ بچوں نے کہا۔ والد نے کہا۔ گھوڑوں کے رکھوالے نے کہا۔ گھوڑوں نے کہا، مددگاروں نے کہا۔ چاند نے کہا، رات نے کہا۔ صبح کے پرندوں نے کہا۔ ہوانے کہا..... سارے جہاں نے کہا..... ”کیا میں ایسی ہی ظالم ہوں.....“ ماں تھک گئی۔ عاجز آ گئی۔ رو دینے کو ہو گئی۔

”ظلم تو اس بچی پر ہوتے ہیں اس گھر میں۔“ والد نے منہ پھلا کر کہا۔

”میں دبیس! کو چچا کے گھر سے لے آؤں؟“ چھ سالہ بھائی نے کہا۔

”نہیں! رہنے دوا سے وہیں۔ ویسے بھی یہاں اس کا کون ہے۔ کام کروا کروا کر بچی کو ہلکان کر دیا۔ پانی بھر کر وہ لائے۔ کپڑے وہ دھوئے۔ کھانا وہ پکائے۔“ (صراحیاں وہ توڑے، لوگوں کو وہ کائے۔ کپڑے وہ پھاڑے)

ماں نے حیرت سے دبیس! کے سگے باپ اور اپنے سگے شوہر کو دیکھا۔ ایک ایک کر کے، اپنے سارے سگے بچوں کو بھی۔ اتنے سگوں میں ایک وہ سوتیلی تھی۔

”کوئی مجھ بے چاری کی بھی تو فریاد سنے۔“ ماں نے جادو کو سر پر درست کیا اور دبیس! کو لینے کے لیے چچا کے گھر کی طرف چل پڑی۔

”میری بہت یاد آرہی ہو گی والدہ.....؟“
 دبیسانے ماں کے گلے میں بائیں جمائل کر دیں۔
 ”ہاں میری بچی! سب نے مجھے تمہاری بہت یاد دلائی۔“ انہوں نے آہ بھر کر کہا۔
 چچا چچی نے آگے بڑھ کر دبیساکا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”ابھی اسے یہیں رہنے دو۔ بچے بہت خوش ہیں اس سے۔“

”پر میرے بچے خوش ہیں نہ شوہر۔ اگر یہ یہاں رہی تو میں اپنے گھر میں کیسے رہوں گی؟“
 اصطبل کے گھوڑے تک مجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ ”ماں بہت بے چاری بن گئی۔“

دبیساشوخی سے آنکھیں گھمانے لگی۔
 ”ماں میں نے تنور گرم کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب میں روٹی پکانا سیکھ لوں گی۔“

”نہیں میری بچی! تندور کا ذکر رہنے دو اب۔ بھول جاؤ کہ ہمارے گھر میں کوئی تندور ہوتا ہے۔“

وہ بھول گئی کہ کوئی تندور ہوتا ہے۔ خولہ کی ماں نے یاد دلایا کہ ”شہر کی دوسری لڑکیاں اپنے باپ، بھائیوں کے لیے چغہ (عبا) بناتی ہیں اور تم..... ہونہ..... وہ طنز سے ہنس رہی تھی تو اس نے ایک بار یہ زحمت بھی کر لی جب چغہ تیار ہو گیا تو اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے وہ خود ہی پہن لیا۔ والد کا ہنس ہنس کے برا حال ہو چکا تھا۔“

”لوگ ٹھیک کہتے ہیں دبیسا! تمہیں کوئی اور مخلوق بن کر پیدا ہونا تھا، لیکن..... لیکن..... دیکھو ایسے باہر نہ جانا، تمہیں نظر لگ جائے گی۔“

اسے والد کی ہنسی پر بہت پیار آیا۔

”آپ جیسے والد دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہیں۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔

”تم جیسی بیٹی بھی تو نہیں۔“

”اور مجھ جیسی بد قسمت عورت بھی۔“ ماں نے

پھر آہ بھری۔ ”دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو

لگاڑ دیا۔ میرا گھر بھی تباہ کر دیا۔ ایک کی حرکتوں کے

جرمانے بھرتے بھرتے، دوسرے نے گھر خالی کر

دیا۔“ ماں کو سب بھیڑیں، دنبے، گھوڑے، اناج، یاد تھے۔

ماں کو دبیساکے سب حرکتیں بھی یاد تھیں..... یہی دبیسانہستی مسکراتی ہوئی والد کے لیے بنایا چغہ پہن کر، خولہ، دورین سے ملنے کے لیے چلی گئی۔ ان کی ماؤں نے منہ کھول کر، آنکھوں سے گھور کر اس کی تواضع کی۔

”یہ تم نے کیسا رومیوں جیسا لباس پہن رکھا ہے؟ عقل نہیں ہے کہ لڑکیاں کیسا لباس پہنتی ہیں۔“ خولہ کی ماں نے کہا

”میں اس لباس میں بے انتہا حسین و جمیل لگ رہی ہوں خالہ! آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ یہ خیال آپ کو کیوں نہیں آیا کہ آپ اپنے بھائی، والد یا شوہر کا چغہ پہن سکتیں۔“

”توبہ توبہ..... میں کیوں پہنوں گی مردوں کا لباس.....“

”اگر آپ میری نظر نہیں اتار سکتیں تو مجھے کاٹ کھانے والی نظر سے بھی نہ دیکھیں.....“

”میں تو تمہاری جرأت پر حیران ہوں.....“ دورین کی ماں بولی۔

”میں اپنی جرأت پر خوش ہوں۔ رومی عورتیں پہناوے میں نت نئی جدتیں کرنے میں مشہور ہیں۔ انہوں نے میری یہ جدت دیکھ لی تو وہ مجھ پر فدا ہو جائیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عیش کھا کر گر پڑیں گی۔“

”پتا نہیں تم ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کہاں سے سیکھتی ہو۔ تمہارے باپ نے تمہیں کون سی دوا کھلا دی ہے کہ تم انسان بننے پر تیار ہی نہیں ہو۔“

”اب خالہ! حوروں کو بھی ”انسان“ بننے دیکھا ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ کھڑا کر کے شان سے کہا۔

ٹھوڑی اٹھالی۔ اس کا حسن روشنی کی صورت اس کے

چہرے سے پھوٹنے لگا۔ خالہ مبہوت تو ہوئیں۔ خولہ،

دورین کا قہقہہ چھوٹا۔ وہ اس کی ادا پر فدا ہو گئیں۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو دبیسا! تم تو اونٹ کی

کھال بھی اوڑھ لو تو کمال کر دو، یہ تو پھر چچا کا چغہ ہے۔“

”لیکن جی چاہتا ہے کسی انسان کی کھال اوڑھ لوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ مدد کرو گی؟“

خولہ کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ خولہ کی ماں، دورین کی ماں کے ساتھ مل کر دبیسہ کی برائیاں کر رہی تھی۔

”خالہ! ابھی تو شام ہونے میں وقت رہتا ہے، اتنی جلدی تند و گرم کر رہی ہیں آپ؟“

خالہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ البتہ ان تینوں کی دبی دبی ہنسی ابھری۔

”تمہاری ماں کی آنکھیں شعلے اگل رہی ہیں۔“ اس نے خولہ کے کان میں سرگوشی کی۔

”تمہاری زبان بھی تو آگ چنار بنی ہوئی ہے۔“

”کیا میں سچ بھی نہ بولوں؟“

”کیا وہ اس سچ پر سچ پا بھی نہ ہوں؟“

تینوں کا قہقہہ اتنا بلند تھا کہ خولہ کی ماں نے جھٹے کو گرم کئے بغیر ہی خولہ کی کمر پر داغ دیا۔ ان کے قہقہے شہر کی روتق میں مدغم ہو رہے تھے۔ وہ نیلے آسمان اور خاک کی زمین پر، انسان کے باہمی دوست ہونے، ان کی معصومیت، زندگی کی خوشی اور زندہ دلی کی گواہی دے رہے تھے۔ زندگی کا ذائقہ چکھنے والا ہر انسان خوش نصیب ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی خوش نصیب ہیں۔

☆☆☆

ریشم کا لباس تیار ہو چکا تھا۔ پیشانی پر سکوں جیسے چمکتے ستاروں کو پرو کر باندھا ہوا تھا۔ وہ ویسے ہی اتنی حسین تھی، اتنا اہتمام کیا تو ہر آنکھ کو دم بخود کر دیا۔

”تمہارے والد نے کیا ہیرا چننا ہے تمہارے لیے دورین! دیکھو تو ذرا۔ میری بات مانو، ایسے ہیرے کو پھر سے راکھ میں دبا دو۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا دنبہ کھا گیا۔ اور کیسی شرافت سے پیٹ کے ڈھیر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ بے چارا دنبہ۔۔۔۔۔ کس کنوئیں میں جا گرا۔۔۔۔۔“ جافری سے لگ کر کھڑی وہ باہر بیٹھے

دولہا کو دیکھ رہی تھیں۔ سب سے آگے دبیسہ کھڑی تھی۔ پیچھے دبیسہ کی بگاڑی پوری فوج۔

”والدہ نے کہا تھا، تمہیں شادی میں آنے سے باز رکھوں۔ اس لیے خاموش رہو۔ ویسے بھی سب میرے بجائے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ دلہن سے زیادہ تم خوب صورت لگ رہی ہو۔ کیوں اتنا سچ سنو کر آئی ہو۔۔۔۔۔ کچھ شرم ہی کر لیتیں۔“

”شرم میں نے بہت کی، لیکن لحاظ نہیں کیا۔۔۔۔۔ تمہارا۔۔۔۔۔“ وہ ہنس دی۔

”جا کر شرافت سے دولہا کو سلام کرو۔ اسے سلامی دو، اور دیکھو، کوئی شرارت نہ کرنا۔ ورنہ والدہ بہت خفا ہوں گی۔“

”تمہارا مطلب ہے میں اس دنبے سے جا کر ملوں؟ میں، دبیسہ اسے سلام کروں؟ اسے سلامی دوں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ خیال تو اچھا ہے۔۔۔۔۔ آخاہ۔۔۔۔۔ آج میں کچھ زیادہ ہی خوش ہوں۔“

”جاؤ نا دبیسہ! خولہ کو بھی لے جاؤ۔“

اس نے گردن موڑ کر سب لڑکیوں کو دیکھا پھر آنکھ سے اشارہ کیا۔ سب دولہا کی سمت کھسکنے لگیں، گھر کے کھلے احاطے میں، قدیلیوں کی روشنی تھی، کچھ جھلمل سجاوٹ، کہیں رنگین میز پوش۔۔۔۔۔ دہکتے الاؤ، ان پر پکتی رانیں۔۔۔۔۔ مکین گوشت۔

دبیسہ نے سر کے اشارے سے سلام کیا اور سامنے نشست پر بیٹھ گئی۔ دنبے کی ہڈی بولی ایک کرتے، دولہا نے چونک کر دبیسہ کو دیکھا۔

”تو وہ تم ہو۔۔۔۔۔؟؟؟“

”ہاں وہ تو میں ہوں۔۔۔۔۔ پر تم کون ہو؟“ وہ

گڑبڑا گیا ہے۔

”ہاں تو یہ تم ہی ہو۔ اس شہر کی سب سے خزانہ لڑکی! والدہ مجھے بتا چکی ہیں۔“

”آپ نے غلط سنا چچا دولہا۔ میں اس شہر کی سب سے نیک شریف لڑکی ہوں۔ مجھے تو ٹھیک سے بولنا بھی نہیں آتا۔ ابھی کچھ ہی وقت گزرا، میں نے چلنا اور ہاتھ سے کھانا کھانا سیکھا ہے۔ دانت بہت

اکتوبر 2018
کے شمارے کی ایک جھلک

بہنوں کا شعاع آینا ماہنامہ

اکتوبر 2018
کا شمارہ شائع ہو گیا



- ✽ ”موچنگ“ سحر جاوید کا مکمل ناول،
- ✽ ”دوسری اور آخری محبت“ سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول،
- ✽ ”حاصل، لا حاصل“ ثمرہ بخاری کا ناول،
- ✽ ”شہلاوار شکور“ عاصمہ فرحین کا ناول،
- ✽ ”شام کی حویلی میں“ رخسانہ نگار عدنان کا ناول،
- ✽ ”شہزاد“ صائمہ اکرم چوہدری کا ناول،
- ✽ افشین نعیم، عندلیب زہرا، فرح حسین، افشین ملک، کشف بلوچ اور فریحہ عبدالرشید کے افسانے،
- ✽ ”دستک“ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ✽ ”نواد خان“ مشہور ٹی وی فنکار سے ملاقات،
- ✽ ”پیارے نبی علیہ السلام کی پیاری باتیں“ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع اکتوبر 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

کمزور ہوتے ہیں میرے۔ اس سے کچھ پہلے میں بس آں..... اوں کرنی تھی..... چھوڑیں..... آپ کے لیے یہ شربت لائی ہوں۔ رواج کے مطابق آپ کو یہ شربت پینا ہے۔“

سلامی کے سسکے ایک ایک کر کے انہوں نے منجلی لحاف کے اوپر رکھ دیے تھے۔ سب لڑکیاں اس کے سر پر دائرہ بنا کر کھڑی تھیں۔ وہ اکیلی معاملات دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ماں نے اپنی ستارہ بیٹی دبیساکو دیکھا۔ زیر لب کلام پڑھ کر اس پر پھونک ماری۔

چچا دولہا نے سلامی کے سسکے سمیٹ لیے۔ اب تو شربت پینا ہی تھا۔

”یہ..... آ..... آخ..... تھو..... میرا حلق.....“ یہ کیا ہو رہا ہے۔“ میٹھا شربت پورا پی لیا۔ پیالہ خالی کر دیا۔

”کچھ زیادہ نہیں چچا دولہا! آپ دیکھنے میں پورا دنبہ اور آدھا سا چوہا لگتے ہیں تو سوچا کہ آواز بھی ویسی ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے شہر کا مطب بہت مشہور ہے۔ ایک بے ضرری دوا ڈالی ہے شربت میں۔ کچھ زیادہ نہیں ہوگا۔ دو تین خون کی الٹیاں..... ایک آدھ سال جگر میں سوزش..... یہی کوئی تین چار سال گلے میں خارش۔ اور بس کل ملا کر بیس بائیس سال خچر جیسی آواز..... بس..... زیادہ پریشان مت ہوں۔ آنکھیں تو اندر کریں چچا دولہا! آخ! ایسا بھی کیا ہو گیا گلے کو..... کہیں پیڑ پودے تو نہیں اگنے لگے؟؟ جھاڑ جھاڑیاں؟ خولہ! کون سی دوا دے دی تم نے چچا کو؟“

چچا دولہا اپنا حلق پکڑ کر زمین پر بھیڑ، بکرے، دنے، چوہے، سب کی طرح الٹے الٹے ہو کر پتا نہیں کیا کچھ اگل رہا تھا۔ اتنی بد بو آنے لگی تھی کہ مہمان ناگواری سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ اس کے کسی رشتے دار نے آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

”کہا تھا، کم کھاؤ..... تمہاری ہی شادی کا کھانا ہے..... سب ناک ڈھانپ رہے ہیں۔“

لیکن ان سب نے منہ پر ہاتھ رکھے تھے، قہقہے

دبانے کے لیے..... لیکن پھر وہ..... وہ سب..... ناکام ہو گئیں اور کھل کر ہنسنے لگیں..... وہ کچھ ایسی شدت، ایسی دلبری سے ہنسیں کہ شادی واقعی شادی ہو گئی..... ہر لڑکی دلہن..... ہر لڑکا دولہا..... جو جہاں، جس کام میں مصروف تھا وہ رک کر انہیں دیکھنے لگا۔ ان سب میں..... سب میں..... دبیساکو خاص طور پر..... وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کا حسن اس کے سر کا تاج ہو رہا تھا۔

اس زمین کا پھول.....

اس آسمان کا چراغ.....

اپنی سفید کلائی سے اس نے اپنی نم آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو ایک دانا عورت جس کی پیشانی پر رومال بندھا ہوا تھا، بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ اس کا قہقہہ تو تھم گیا لیکن ہنسی نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شادی میں شریک ایک خاتون اس کے بازو سے ریشم کو پرے ہٹا رہی ہے..... شاید وہ اس کا لباس دیکھ رہی تھیں..... اس کے لباس کی جدت..... لیکن وہ.....

ایک دم خاتون نے اس کا بازو جھٹک کر چڑھ دیا اور کتنے ہی قدم دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی..... ”اسے کوڑھ ہو چکا ہے..... یہ کوڑھی ہو چکی ہے.....“

دبیسانے اپنے بازو کو دیکھا..... اس پر پڑے دھبوں کو اور پھر خاتون کو.....

سفید ریشم سیاہ ہو چکا تھا.....

اور.....

پیشانی پر چمکتے ستارے بے نور.....

☆

سروں کی شصیت

ماڈل..... حمیرا مغل

میک اپ..... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی..... موسیٰ رضا

دوست کیا معتبر نہیں ہوتے
آپ سے ہاں! مگر نہیں ہوتے

ہم ہی خطرات مول لیتے ہیں
راستے پُر خطر نہیں ہوتے

محو پرواز ہے خلاؤں میں
عقل کے بال و پر نہیں ہوتے

منزلیں میرے ساتھ چلتی ہیں
راستے مختصر نہیں ہوتے

رہنماؤں کے ساتھ رہتے سے
حوصلے معتبر نہیں ہوتے

زندگانی سے کھیلنے والے
موت سے بے خبر نہیں ہوتے

چار دن کی شکیبِ قربت سے
فاصلے مختصر نہیں ہوتے
شکیبِ جلالی

نظر میں چہرہ کوئی اجنبی بسا کے چلے
ادھورے خواب کو ہی رہنما بنا کے چلے

وہ چاند دُور سے ہم کو پکارتا کیوں ہے
اُسے کہو کہ ہر اک فاصلہ مٹا کے چلے

وہ ساتھ چلنا اگر چاہے تو خوشی ہی نہیں
ہمارے درد بھی سارے گلے لگا کے چلے

وہ کون سر پھرے سچ کی تلاش میں نکلے
”چراغِ غلے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے“

ہیں سارے لوگ ہمارے خلاف سازش میں
ہمارا جرمِ شبانہ کہ سراٹھلا کے چلے

شبانہ یوسف

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق

سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق

اثرِ غم ذرا ذرا بتا دینا

وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں

کہ مرے دل میں آچھپا ہے عشق

دیکھیے! کس جگہ ڈبو دے گا

میری کشتی کا نا خدا ہے عشق

اب تو دل! عشق کا مزا چکھا

ہم نہ کہتے تھے کیوں، برا ہے عشق

آپ مجھ سے بنا ہیں گے سچ ہے

با وفا حق، بے وفا ہے عشق

قیس و فرہاد و واقع و مومن

مر گئے سب ہی، کیا و با ہے عشق

مومن خاں مومن

ایک دشت کا صحرا ہے

ایک پیاس، ایک طلب ہے

محروم زندگی کی تڑپتی سسکتی خواہش

جو تیری دم توڑتی محبت کے دیبا کے

خشک ہوتے میدان میں

کر لاتی ہے

خواہش کے اس بھٹکتے جنگل میں

میری زندگی کی ڈورا الجھتی جا رہی ہے

پیاس بڑھتی جا رہی ہے

سانس اٹکنے لگی ہے

تیرے تھوڑے وعدے یاد کے لیے جان پتے میں

لپٹے اپنے اجر نے کاما تم کرتے ہیں

جاننا ہے یہ دل ویران صحرا میں پھول نہیں

کھلا کرتے

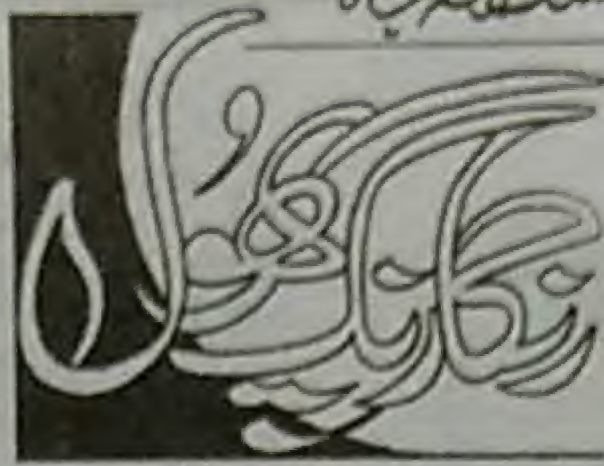
دل نہیں جڑا کرتے

پھر بھی تیری محبت کی آس ہے جو لوٹے

نہیں دیتی

مجھے تجھ سے جدا ہونے نہیں دیتی

تو بہتے قطب



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی
صدقہ ہے۔“

تشریح:- عام گزرگاہوں کی حفاظت اور ان کی
تعمیر و صفائی اس قدر ضروری ہے کہ وہاں سے ایک
تنکے کو دور کر دینا بھی ایک بڑا ثواب قرار دیا گیا ہے
اور کسی پتھر، کلتے کوڑے کو دور کر دینا ایمان کی
علامت بتایا گیا ہے۔ یہ مذہب اسلام کی ایک
خوبی ہے کہ اس نے ہر مقام پر خدمت کو مد نظر رکھا
ہے۔

اب کیا ہوگا؟

ایک بوڑھا چینی اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں
جا رہا تھا۔ اس نے کاندھے پر ایک لکڑی جمار بھی
بھی جس سے تختی سے بھرا برتن لٹک رہا تھا۔ اللہ
کا کرنا ایسا ہوا کہ چلتے چلتے کسان کو ٹھوکر لگی تو برتن
نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ کسان نے لحظہ بھر رک کر
اُسے دیکھا پھر۔ قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ آفاق
سے وہاں کھڑا ایک آدمی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ
بھاگتا ہوا کسان کے پاس گیا اور پوچھا۔

”بزرگوار آپ کا برتن ٹوٹ گیا اور ساری تختی
فنا ہو گئی۔ آپ کو افسوس نہیں ہوا؟“
بوڑھے کسان نے سکون سے کہا ”ہاں بیٹا میں
جانتا ہوں مگر اب میں کیا کروں؟“

وہ آدمی یہ سن کر سر ہلا کر رہ گیا۔
یہ حقیقت ہے کہ جو نقصان ہو چکا اُس پر رونے

اور گڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔
اقصیٰ افضل۔ سرگودھا

زبان کا خیال،

حضرت عیسیٰ بن عقبہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ
بن مسعودؓ نے فرمایا۔

”اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود
نہیں! روئے زمین پر کوئی چیز ایسی نہیں ہے
جسے زبان سے زیادہ عمر قید کی ضرورت ہو۔“

بے کار باتیں کرنا،

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
”میں تمہیں بے کار باتیں کرنے سے ڈراتا ہوں
اور بقدر ضرورت بات کرنا ہی تمہارے لیے
کافی ہے۔“

فضول بحث و مباحثہ،

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
”قیامت کے دن سب سے زیادہ خطائیں ان
لوگوں کی ہوں گی جو دنیا میں فضول بحث و مباحثہ
کرتے رہتے تھے۔“

اچھے لوگوں کی اچھی باتیں،

ہر انسان کے پاس ایک ایسی قوت ہے جو مستقبل
میں بھی جھانک سکتی ہے، یہ اس وقت بیدار
ہوتی ہے جب خواہش خمسہ سو رہے ہوں
اور دماغ مشاہدات کی مداخلت سے آزاد ہو۔
(امام سید جعفر صادقؑ)

۴ وہ دعوت سب سے بدتر ہے جس میں امیر بلائے جائیں اور عزیز شامل نہ ہوں۔

(امام غزالیؒ)

۴ ایک ہزار قابل انسانوں کے مرجانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک احمق کے صاحب اختیار ہو جانے سے ہوتا ہے۔

(مولانا جلال الدین رومیؒ)

سعدیہ وحید سعدی - اسلام آباد

ذہانت،

ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔
”میری شادی پندرہ سال پہلے ہوئی تھی مگر میری گرم جوش محبت میں آج بھی کمی نہیں آئی۔ البتہ یہ احتیاط ضرور کرنی پڑتی ہے کہ بیوی کو پرستل مصروفیات کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلے۔“
فوزیہ ٹریٹ، ہانیہ عمران - بکرات

وعیزہ وغیرہ،

- ① پوری انسانیت سے پیار کرنا بہت آسان ہے لیکن صرف ایک ہمسائے سے پیار کرنا بہت مشکل ہے۔
- ② بے وقوف ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کسی بھی محفل میں تنہائی محسوس نہیں کرتا۔
- ③ گھر وہ جگہ ہے جہاں آپ جمائی لینے کے بعد شرمندہ نہیں ہوتے اور بد مزہ کھانا کھانے کے بعد بھی اسے بد مزہ نہیں کہتے۔
- ④ ایک ٹیم کو کمزور بنانے دیکھ کر اس کے پرستار مشتعل ہو کر کھلاڑیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک عورت کھڑی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔
”ٹیم کے کپتان کو جان سے مار دو۔ کیپٹن کا خاتمہ کرو۔“

بعد میں پتا چلا کہ وہ عورت کپتان کی بیوی

تھی۔

اقصی ناصر - کراچی

سوچ بچار،

ایک سردار جی سے کسی نے پوچھا۔
”سردار جی! کیا آپ جانتے ہیں...؟“
”ہاں ہاں، ہم ہر بات جانتے ہیں... پوچھو،“
وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔
”تو پھر بتائیں ذرا... عقل بڑی کہ بھینس...؟“
سردار جی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اپنی پگڑی اتار کر سر کھجایا اور پھر تسخیر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
”ابھی بتا دیتے ہیں پہلے دونوں کی الگ الگ تاریخ پیدائش تو بتاؤ؟“

چالے،

- ۱۔ چالے کی باقاعدہ اپنی ایک تاریخ ہے۔
(بین الاقوامی کنونشن کو چین)
 - ۲۔ کیا چالے کے ایک کپ سے بہتر کوئی چیز ہے؟
(سروشنس چرچل)
 - ۳۔ چالے کا ایک کپ ہی زندگی ہے۔
(گریٹ گرانڈ، جس نے ایک سو آٹھ برس کی عمر پائی)
 - ۴۔ ہم سادہ انداز سے زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن چالے کے ایک کپ کے بغیر نہیں۔
(ملای جی میگ کو مک)
- عائشہ، تحریر - گو جہ

الٹی بات،

ایک امریکی کو جیب ٹرین میں بیٹھنے کی کہیں جگہ نہیں ملی تو اس نے انگریز بڑھیا سے درخواست کی۔
”محترمہ! اپنا کتا سیٹ سے نیچے اتار دیجیے تاکہ میرے بیٹھنے کی جگہ نکل آئے۔“
”کتے سے پرے ہٹ جاؤ، بڑھیا غرائی۔“
امریکی نے پوری ٹرین کا ایک دفعہ بھر چکر لگایا

مگر کہیں جگہ نہ تھی۔ وہ پھر برصیاع کے پاس آیا اور اس نے کتے کو سیٹ سے ہٹانے کا کہا۔ بڑھیا پھر پہلے کی طرح خڑائی۔

امریکی نے نہایت اطمینان سے کھڑکی کھولی اور کتے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔
بڑھیا قہر آلود نظروں سے اسے گھور رہی تھی کہ اوپر کی نشست سے ایک بڑے میاں کی آواز آئی۔
”تم امریکی بھی بڑے دلچسپ لوگ ہو، جس کو باہر پھینکنا چاہیے تھا، وہ تو اب بھی سیٹ پر موجود ہے۔“

نوال افضل لکھن۔ کراچی

لفظوں سے لفظ ملتے ہیں،

۱۔ رشتے اور سودے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ رشتے قائم کیے جاتے ہیں، جبکہ سودے طے کیے جاتے ہیں۔
۲۔ دوسروں کی خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر یہ مت بھولیے کہ آج جس عمارت کی بنیاد آپ نے جوڑی کی اینٹ پر رکھی ہے، وہ کبھی نہ کبھی ضرور گرے گی۔ کسی آدمی کے نہیں، آپ کے اپنے اوپر۔

۳۔ اتنے غلط انسان نہیں جتنے غلط رویے ہوتے ہیں۔

۴۔ امید ایک ایسی چھاؤں ہے جو اپنے دامن میں انسان کو پناہ دے کر مالیوسی کے انتہاء سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔

۵۔ لوگ مخلص دوست تو تلاش کرتے ہیں مگر خود مخلص ہونے کی زحمت نہیں کرتے۔

۶۔ آنسو بہاؤ اور خوب روؤ، یہ سوچ کر نہیں کہ ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں، بلکہ یہ سوچ کر کہ ہم اتنے زیادہ گناہ گار ہیں کہ اللہ تک ہماری دعائیں نہیں پہنچ پاتیں۔

نمرہ عاقب۔ گرین سٹی

ماہر نفسیات

ایک بڑے ہوٹل میں ماہر نفسیات کا کنوینشن

منتقد ہو رہا تھا۔ کنوینشن کے دوران ایک روز دو ماہر نفسیات راہداری میں ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک نے مسکرا کر دوسرے کو ”ہیلو“ کہا۔ دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کافی آگے جا کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر سر کھجاتے ہوئے تیر لپ بڑھایا۔

”آج اس کا ہیلو کہنے کا مقصد کیا تھا؟“
دو گھنٹے وہ وہیں کھڑا اس بات پر غور کرتا رہا تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ دوسرے نفسیات دان کے ہیلو کہنے کا مقصد ہیلو کہنا ہی تھا۔

اقصی ناصر۔ گلستان جوہر

رزق کا احترام،

جرمنی کے ایک ریسٹورنٹ میں کچھ پاکستانی نوجوان کھانے کی غرض سے داخل ہوئے۔ بھوک کی شدت کی وجہ سے نوجوانوں نے کھانے کا آرڈر فراخ دلی سے دیا۔ کھانا آگیا اور تناول بھی کر لیا گیا۔ بل کی ادائیگی کے بعد جب یہ لوگ جانے لگے تو قریبی میز پر بیٹھی دو عمر رسیدہ جرمن خواتین نے ان نوجوانوں کو ضرورت سے زیادہ کھانا طلب کرنے اور بچے ہوئے کھانے کے ضائع ہونے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

ان لوگوں نے کہا: ”ہم نے تمام کھانے کے پیسے ادا کر دیے ہیں اور ہماری مرضی ہم کتنا بھی کھا لیں“
یہ بات سن کر خواتین نے کسی کو ٹیلی فون کیا۔

تھوڑی دیر میں ہی ایک باوردی شخص آگیا جو کہ سوشل سیکورٹی محکمے کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ اس نے تمام صورت حال سن کر پچاس مارک کا جرمانہ عائد کیا اور موقع پر ہی وصول کیا۔ ساتھ ہی نصیحت کی۔

”آئندہ جب بھی جرمنی میں کھانا طلب کرو، اتنا ہی منگواؤ جتنا کھا سکتے ہو۔ تمہارے پاس بے شک پیسوں کی بھرمار ہے مگر وسائل معاشرے کی امانت ہیں۔ ان کا بے دردی سے استعمال جرم ہے۔“

نادیہ یاسر۔ کراچی



حالات کی ڈائری

توبہ قطبؒ کو ڈائری

کہتے ہیں مشکل وقت میں اپنے اور پرانے کا پتا چلتا ہے اور ایسے ہی کڑے وقت میں کتنے ہی دریا آنکھ سے بہ گئے اور آنکھیں خشک بنجر صحرا بن گئیں۔ اندھیری راتوں اور کھٹن دنوں میں یہ غزل نظر سے گزری تو دل میں جگہ پا گئی۔ قارئین کی تندرست بہت مشکل ہے اس کا لوٹ آنا وہ پوری بات کب سن کر کیا تھا

مجھے پہچانتا بھی ہے کوئی اب میں بس یہ دیکھنے ہی گھر گیا تھا

زمانہ جس کو دریا کہہ رہا ہے ہماری آنکھ سے بہہ کر گیا تھا

یہ مت سمجھنا خطا کس سے ہوئی بتا الزام کس کے سر گیا تھا

رضوانہ شکیل راؤؒ کو ڈائری

میری ڈائری میں تحریر سلیم احمد کی یہ غزل ان لوگوں کے لیے پیغام ہے جو خود کو عظیم ثابت کرنے کی کوشش میں انسانیت کے درجے سے بھی گر جاتے ہیں۔

جس طرح دریا بچھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جاتی ہے

دیوتا بننے کی حسرت سے معلق ہو گئے اب ذرا نیچے اترے آدمی بن جلیے

وسعتوں میں لوگ کھودیتے ہیں خود اپنا شعور اپنی حد میں آئیے اور آگہی بن جلیے

اک تنگ نے یہ اپنے قص آخریں کہا روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جلیے

عالم کثرت کہاں ہے اب اکائی میں سلیم خود کو خود میں جمع کیجیے اور نئی بن جلیے

عسبرین ولیؒ کو ڈائری

اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر کا شف غائر کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔ چاند کیا ابر کی چادر سے نکل آیا ہے ایک آوارہ شب گھر سے نکل آیا ہے

اس کو بھی چاہیے اب گھر سے نکل کر کئے رزق جس کے لیے پتھر سے نکل آیا ہے

ایسا سناٹا ہے باہر کہ اسے دیکھنے کو شور سامرے اندر سے نکل آیا ہے

اس نے دستک کی سعادت نہیں بخشی مجھ کو چاہے سنتے ہی مری گھر سے نکل آیا ہے

کون اس شہر میں زندہ ہے کہ پوچھے مجھے کیسے زندہ تو سمندر سے نکل آیا ہے

زخم سے بڑھ کے کہیں گہرا ہے کاشف غائر وہ تعلق جو رفوگر سے نکل آیا ہے

نمرہ ۱۰ اقرا کھو ڈاڑھ

محبت میں دلوں کو دھڑکا سارہتا ہے کہ جانے
کون، کب، کہاں راستہ بدل جائے۔ کوئی معمولی سی بات
کوئی چھوٹی سی غلط فہمی دلوں میں فرق ڈال دیتی ہے۔
امجد اسلام امجد کی اس نظم میں اسی کیفیت کا بیان
ہے۔

وہ نہیں رہا کہ جو ایک ربط تھا درمیاں
وہ بکھر گیا
وہ ہوا جلی

کہ جو برگ تھے سرشاخ جاں وہ گرا دیے
وہ جو حرف دلج تھے ریت پر وہ اُڑا دیے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشان پا بھی مٹا دیے
میرے ہم سفر ابھی وہی سفر
مگر ایک کوڑکے فرق سے
تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی مہموں میں بدل گیا
اسے تاپتے، اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا
تو میرے سفر کا شریک ہے
میں تیرے سفر کا شریک ہوں
پر جو درمیاں سے نکل گیا
اسی فاصلے کے شمار میں
اسی بے یقین سے غبار میں
اسی راہ گزر کے حصار میں
تیرا راستہ کوئی اور ہے
میرا راستہ کوئی اور ہے

نخبہ اکرم کھو ڈاڑھ

تھکن، اداسی اور نارسائی کا دکھ، زمانے کی بدلتی

قدیں اور زندگی کی شکستگی میں ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ سچائیاں کہیں کھو گئی ہیں۔ ساغر صدیقی کی یہ غزل
ان ہی احساسات کی منظر ہے۔ قارئین کی نذر
اسے تغیر زمانہ، عجب دل لگی ہے
نہ وقار دوستی ہے نہ مجال دشمنی ہے

میرے ساتھ تم بھی چلنا، میرے ساتھ تم بھی آنا
ذرا غم کے راستوں میں بڑی تیز تیرگی ہے

یہ مشاہدہ نہیں ہے، میرے درد کی مدد ہے
مرے داغ دل جلے ہیں، تیری بزم جب سچی ہے

غم زندگی کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرصت
تیرے ناز اٹھا ہی لیں گے ابھی زندگی پڑی ہے

جسے یار اپنا کہنا، اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیث دلبران ہے، یہ کمال دل بری ہے

وہ گزر گیا ہے ساغر کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے، کہیں آگ سو گئی ہے

آسیہ فرید کھو ڈاڑھ

میری ڈاڑھی میں تحریر کسی نامعلوم شاعر کی یہ نظم
آپ سب قارئین کی نذر۔
وہ مجھ سے بے سبب کبھی اُلجھا نہیں تھا
وہ پہلے تو کبھی ایسا نہیں تھا
بہت اعلیٰ تھا ظرف اس کا
پر میری ذات کو وہ کبھی سمجھا نہیں تھا
وہ جتنی بے رحمی سے چل دیا
میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں تھا
کیوں ٹھہراؤں برا اسے
وہ اچھا تھا، فقط میرا نہیں تھا





آسیہ جاوید ————— علی پور چیمہ

موج نیم صبح، نہ خوش نموسے تھا
جو پھول سرخو تھا، خزاں کے لہو سے تھا
تیرے سکوت نے اے ویران کر دیا
دل باغ باغ تھا، تو تری گفتگو سے تھا

صدف شاد ————— شاہ پور

باقی جو چپ رہو گے تو ابھیں گی انگلیاں
ہے بولنا بھی رسم جہاں، بولتے رہو
اقرا عزیز ————— گاؤں دیا خان جلبانی

میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرستش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں
مدیحہ نورین مہک ————— بکرات

اچھی کتاب کی طرح میں نے اے پڑھا بہت
اور وہ سمٹ کے ہو گیا آخری باب کی طرح
رضوانہ شکیل راؤ ————— لودھراں

میرا مزاج جنوں سلامت
کہیں بھی تنہا نہیں رہوں گا
نزار طوقان ساتھ میں گے
اگر کناروں نے ساتھ چھوڑا

یاسین کنول ————— پسرورد

کہاں کہاں سے مٹاؤں نقش تیرے
قالبض ہے تو دل کے گوشے گوشے پہ

عائشہ فاطمہ ————— پسرورد

اکیلا جب بھی ہوتا ہوں میں اس ماحول میں اکثر
مجھے معلوم ہے صفحہ کتاب میں سانس لیتی ہیں

ملائی کوثر ————— بسم اللہ پور

چند لمحوں کا ہوا کرتا ہے خوابوں کا سفر
آنکھ کھلتی ہے تو، صدیوں کی تھکن ہوتی ہے

حافظہ اقرا جاوید ————— پدھر اڑ

اچھا ہوا دھند پڑنے لگی ہے اب
کہاں تک دیکھتیں یہ نظریں راستہ تمہارا

بشری جاوید ————— پدھر اڑ

بے بسی سے اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے
جب دینے لگا وہ مجھے مشورہ جدا ہونے کا

انیلا طالب ————— گوجرانوالہ

انتظار کو اپنا شعار بنائے بیٹھے ہیں
ابھی تک تیری اس لگائے بیٹھے ہیں

روبی عامر ————— پورے والا

میری سمجھ سے یا ہر ہے
میرے اندر بیٹھا ہوا شخص

نخبہ اکرم ————— گاؤں گولیکی

اک مستقل مقام پر رہتا نہیں ہے وہ
جیسا مرا خیال تھا ایسا نہیں ہے وہ

دائم کسی کے ساتھ بھی رہتا نہیں ہے وہ
کارِ وفا کسی سے بھی کرتا نہیں ہے وہ

فوزیہ ثمر بٹ ————— بکرات

انا پرست سہی پھر بھی ایک لڑکی ہے
وہ چاہے جلنے کی خواہش میں مر رہی ہو گی

شمیع خالد ————— جڑانوالہ

یا خوف سے درگزر کریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے، اک بات بھڑ جائے

عصیفہ فاطمہ ————— بہاول پور

کوئی ہنس، کوئی راز، کوئی روش، کوئی طریقہ تو بتاؤ
کہ دل کوٹے بھی نہ، ساتھ چھوٹے بھی نہ اور گزر جائے زندگی

کرن

ماہنامہ
اکتوبر 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

”کرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- ✽ اداکار ”نعمان اعجاز“ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- ✽ اداکارہ ”حبہ عزیز“ کہتی ہیں میری بھی سنیے،
- ✽ آواز کی دنیا سے ”اشعر آغا“ اس ماہ مہمان ہیں،
- ✽ اس ماہ ”الفت زہرہ ہراج“ کے ”مقابل ہے آئینہ“،
- ✽ ”شبِ غم کی سحر“ رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول،
- ✽ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ✽ ”لذت غم عشق“ صائمہ قریشی کے مکمل ناول کا دل پذیر اختتام،
- ✽ ”زندگی تم ہی ہو“ نفیسہ سعید کا مکمل ناول،
- ✽ ”مورا پیا“ بشری ماہا کا مکمل ناول،
- ✽ ”غم ہے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ ریاض کا ناول آخری مراحل میں،
- ✽ ”مکھڑیاں“ منشا محسن علی کا ناول،
- ✽ قرۃ العین خرم ہاشمی، میمونہ صدف، سدرہ حیات اور عمارہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،

فضیہ یوسف فیصل آباد
دلائل میرے پاس بھی ہوتے ہیں مگر
تیرے روٹھ جانے کا خوف لا جواب کر دیتا ہے
اقصی طیب ہری پور
ہمارے شہر کے لوگوں کا اب احوال اتنا ہے
کبھی احتیاج پڑھ لینا، کبھی احتیاج ہو جانا
سحر سہیل کراچی

میرا ایمان ہی راضی یہ رضا دہنا ہے
درہ ایسی بھی نہیں بات کہ پتھر ہوں میں
ایک جھونکا جو مجھے جھوٹے کے کبھی گزرا تھا
آج تک اس کے تواتر سے معطر ہوں میں
نوال افضل گھمن گجرات
نور جاں کے لیے کیوں ہو کسی کامل کی تلاش
ہم تری صورتِ زیبا کا تماشا نہ کریں
شازیہ ستار ڈی جی خان
اُتر پڑے ہو تو دریا سے پوچھنا کیسا
کہ ساحلوں سے ادھر کتنا تیز پانی ہے

اقصی ناصر، عذرا ناصر کراچی
لباسِ گل میں وہ خوشبو کے دھیان سے نکلا
مرا یقین بھی، وہم و گمان سے نکلا
عائشہ جہانگیر مرالی کبیر والا
وہ دلاؤ جو سیاہ شب کے شکاری نکلے
وہ بھی چڑھتے ہوئے سورج کے پُجاری نکلے
اپنے دشمن سے میں بے وجہ خفا تھا محسن
میرے قاتل تو میرے اپنے ہی حواری نکلے

اقرا، طیبہ خانوال
نہ بجھا چراغِ دیارِ دل، نہ پھرنے کا تو ملال کر
تجھے دے گی جینے کا حوصلہ، میری یاد تو رکھ سنہال کر
عظلی شفیق جڑانوالہ
جب سناٹا روح میں اُتر جائے
پھر مت اثرِ رولتیں نہیں کرتیں



صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکالا اور اس بیماری کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔
کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب؟
”جی اللہ کا شکر ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ ”علی زیب فاؤنڈیشن“ کے ”ایگزیکٹو ڈائریکٹر“ بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ تھیلیسیمیا اور ہوموفیلیا کیا بیماری ہے؟
تھیلیسیمیا ایک ایسا ”موذی مرض“ ہے جو والدین کے ذریعے بچوں میں منتقل ہوتا ہے۔ اس مرض میں مرض میں خون بنانے کی طاقت ایک عام انسان کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ ایک عام انسان یا بچہ جب کھاتا پیتا ہے تو اس کا خون آٹو میٹک بنتا ہے



ڈاکٹر شاہد علی زیدی سے سُلالات

شاہین رشید

اور چونکہ خون کی لائف 90 سے 120 دن ہے تو 90 سے 120 دن کے بعد اس کے سیل ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے جبکہ تھیلیسیمیا کے مریض میں خون بنتا بھی کم ہے اور سیل کی ٹوٹ پھوٹ بھی جلدی شروع ہو جاتی ہے۔

لہذا جب تک ان بچوں کی زندگی ہے، انہیں ہر پندرہ دن کے بعد صرف ریڈ سیل ٹرانسفیوژن کرنے ہوتے ہیں۔ اگر وقت پر انہیں خون ملتا رہے گا تو یہ بالکل نارمل زندگی گزاریں گے اور اگر انہیں وقت پر خون نہ ملے تو پھر چند دنوں کے بعد ہی یہ زندگی کی بازی ہار دیتے ہیں۔

”اور ہوموفیلیا“ میں کیا ہوتا ہے؟

”ہوموفیلیا یہ بھی ایک بیماری ہے۔ ایک نارمل انسان کو کہیں چوٹ لگتی ہے اور خون بہتا ہے تو پھر کچھ دیر کے بعد یا دوائی لگانے کے فوراً بعد خون بہنا بند

دنیا کے تمام شعبہ جات اور پرفیشن کو ترازو کے ایک طرف رکھیں اور میڈیکل کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھیں۔ آپ کو میڈیکل کا شعبہ بھاری ملے گا۔ میڈیکل کے شعبے میں وہی لوگ جاتے ہیں جنہیں انسانوں سے پیار ہوتا ہے..... ورنہ پڑھائی کے حساب سے دیکھیں تو میڈیکل کی پڑھائی سب سے زیادہ مشکل ہے اور ایک ڈاکٹر کو صرف ڈگری کے حصول کے لیے نہیں پڑھنا پڑتا بلکہ اسے ہمیشہ اپ ڈیٹ رہنا پڑتا ہے۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک پڑھائی جاری رکھنی ہوتی ہے..... آج اگر کوئی ”بیماری“ کے باوجود اچھی زندگی جی رہا ہے۔ تو وہ صرف اور صرف ایک اچھے اور قابل ڈاکٹر کی بدولت ہے۔ یہ ہمارے مسیحا ہیں اللہ ان سب کو سلامت رکھے۔

ڈاکٹر ”شاہد علی زیدی“ تھیلیسیمیا اور ہوموفیلیا کے اسپشلسٹ ہیں۔ ہم مشکور ہیں کہ ڈاکٹر

ہو جاتا ہے۔ جبکہ ہوموفیلیا میں جب مریض کا خون کہیں چوٹ لگنے سے بہتا ہے تو پھر بند کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”یہ بیماری کن وجوہات کی بنا پر ہوتی ہیں؟“
سات سے آٹھ فیصد لوگ Carrier میں ہیں۔ یہ ہوتے تو نارمل ہی ہیں۔ عام لوگوں کی طرح کام کاج کرتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں مگر وہ ہوتے Carrier میں ہیں اور جب carrier ایک دوسرے Carrier سے شادی کرے گا تو بچہ ”تھیلیسیمیا“ کا پیدا ہوگا یعنی وہ تھیلیسیمیا کی بیماری لے کر پیدا ہوگا..... اور یہ بڑا مشکل کام ہے ہر پندرہ دن کے بعد خون لگوانا، خیال رکھنا۔ خون اریج کرنا، بہت تکلیف دہ مرحلہ ہے۔“
”یہ بیماری عموماً کن لوگوں میں زیادہ پائی جاتی ہے؟“

”یہ بیماری غریب غربا یا پٹھانوں میں یا پھر شیخ برادری کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ پٹھانوں میں تو بہت زیادہ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ برادری سے باہر یا اپنے خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے۔ اپنے بچوں کی، جس کی وجہ سے ان کے بچے یہ بیماریاں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ حرف عام میں اگر یہ کہیں کہ ”کزن میرج“ کی وجہ سے ایسا سب کچھ ہوتا ہے تو غلط نہیں ہے۔“

مگر کم پڑھے لکھے گھرانوں اور روایتی قسم کے خاندان کے لوگ اس بات کو نہیں مانتے کہ کزن میرج نقصان دہ ہے آنے والی نسل کے لیے..... لیکن کچھ گھرانے ایسے بھی ہیں جو خاندان میں شادی نہ بھی کریں تو بھی ان کے بچوں میں یہ بیماریاں آجاتی ہیں۔ مگر ایسے جوڑوں کی تعداد بہت کم ہے۔“
”کیا اس بیماری کا کوئی مستقل علاج نہیں ہے کہ یہ ختم ہو جائے؟“

”یہ ایک بہت مشکل علاج ہے۔ ہر پندرہ بیس دن کے بعد تھیلیسیمیا کے مریض کو خون لگواتے

رہو۔ تو اس طرح بار بار خون لگنے سے جسم کے جو اندر کے آرگنس (اعضاء) ہوتے ہیں۔ وہ ڈیج ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے لائف کوالٹی تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مشکل زندگی ہوتی ہے اس بیماری کے ساتھ جینا۔ اور بس پھر..... اس بیماری کو ختم ہونا چاہیے..... مگر یہ اتنا مشکل علاج ہے کہ یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور ابھی ایسا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا کہ یہ بیماری ختم ہو جائے۔“
”اور اس پر خرچ کتنا آتا ہے؟“

چونکہ ہر پندرہ دن کے بعد بلڈ ٹرانسفیوژن (خون کا تبدیل ہونا) ہوتا ہے تو ایک بار کا خرچ تقریباً چھ ہزار روپے ہے اور مہینے کا بارہ ہزار..... تو آپ خود سوچے کہ اتنا مہنگا علاج ایک غریب انسان کیسے کروا سکتا ہے..... اور عموماً بچے دس بارہ سال کی عمر میں یا وہ ٹین ایج میں آتے ہیں تو ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ بارہ ہزار تو صرف خون کا خرچ ہے۔ پھر آنا جانا اور دیگر اخراجات بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ تو یہ والدین کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کا علاج ان کی آخری سانس تک کرواتے ہیں۔“

”این جی اوز اس کے لیے کام کر رہی ہیں یا حکومت کی کوئی سپورٹ ہے آپ لوگوں کو؟“
”یہ این جی اوز کا ہی حوصلہ ہے کہ اتنے بچوں کو وہ سروس دے رہے ہیں۔ گورنمنٹ لیول پر تو اس

سلسلے میں کوئی کام نہیں ہو رہا۔ ان کو پتا ہی نہیں ہے۔ اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہ کیا بیماری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹروں کی اکثریت کو بھی اس بیماری کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے۔ اس بیماری کو روکنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی اپنا ٹیسٹ کروالیں ”ایچ بی ایلکٹیو فورسز۔“

اگر دونوں نارمل ہیں تو شادی کریں ورنہ اپنی راہیں الگ کر لیں۔ دونوں کا نارمل ہونا بہت ضروری

ہے۔ اب تو سنا ہے کہ قومی اسمبلی میں بھی بل پاس ہو گیا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ٹیسٹ کروا کے سٹوفکیٹ پیش کریں کہ انہیں ایچ بی الیکٹو فورس کی بیماری تو نہیں ہے اور وہ پرفیکٹ ہیں کہ نہیں۔

تھیلیسیمیا کا علاج پوری دنیا میں نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ شادی سے پہلے ٹیسٹ کروالیں۔ یا پھر آخری سانس تک بلڈ ٹرانسفیوژن کرواتے رہیں..... ایک ملک ہے، ”سائپرس“ یہ بیماری وہاں سے چلی تھی۔ لیکن اب ”سائپرس“ میں کوئی بچہ تھیلیسیمیا کی بیماری لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں پہلے ٹیسٹ ہوتا ہے ایچ بی الیکٹو فورس کا اس کے بعد شادی کی اجازت ہے۔

”آپ بھی تو ایک این جی او کے لیے کام کر رہے ہیں اور آپ ”علی زیب فاؤنڈیشن“ کے ڈائریکٹر بھی ہیں جو تھیلیسیمیا اور ہوموفیلیا کے لیے کام کر رہے ہیں۔ تو اس کے بارے میں کچھ بتائیے؟“

میں جس پرائیویٹ اسپتال میں کام کرتا تھا۔ ایک دن سوچا کہ اتنے بچے آتے ہیں تھیلیسیمیا کے اور بڑی مشکل سے خون ملتا ہے تو میں نے ”بھیا“ سے بات کی کہ کیوں نہ ہوموفیلیا اور تھیلیسیمیا سینٹر کھولا جائے۔ کیونکہ لوگ آتے ہیں تو انہیں بچوں کے لیے بلڈ نہیں ملتا۔ وہ ترس رہے ہوتے ہیں کہ کہیں سے بلڈ مل جائے اور ہمارے بچے کی جان بچ جائے اور جب انہیں بلڈ نہیں ملتا تو دو چار دن میں بچے کا انتقال ہو جاتا ہے۔

تو میں نے بھیا سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو علی زیب فاؤنڈیشن بنالوں اور ایسے شہر میں یہ ادارہ کھولیں گے جہاں یہ سروس لوگوں کو مہیا نہیں ہے۔ پہلے تو بھیا مانے نہیں کہ یہ بڑا مشکل کام ہے..... میں نے کہا بس آپ ہامی بھریں اجازت دے دیں۔ باقی کام میرا ہے۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ میں نے اسپتال کی جاب سے استعفیٰ دیا اور فیصل آباد چلا گیا۔

فیصل آباد میں میرے سرال والے بھی رہتے ہیں اور پہلا سینٹر فیصل آباد میں کھولنے کا خیال اس لیے آیا کہ میں چاہتا تھا کہ اس شہر کے اطراف کے شہر بھی کور ہو جائیں، جن میں چنیوٹ، جڑانوالہ، سرگودھا، میانوالی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، یعنی دس پندرہ شہر کور ہو جائیں۔ چنانچہ 10 اکتوبر 1995 میں علی زیب فاؤنڈیشن کے تحت ہم نے ”تھیلیسیمیا“ ”ہوموفیلیا“ کا کام شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو بہت مشکلات پیش آئیں۔ پیسہ جمع کرنا، مریضوں کی رجسٹریشن کرنا، انہیں علاج کے لیے راغب کرنا، بلڈ آرینج کرنا۔ یہ سب کام بہت مشکل تھے۔ لیکن مجھے اس چیز کی کوئی ٹینشن نہیں تھی کہ مجھ میں ایک حوصلہ اور عزم تھا کہ میں نے یہ سب کچھ کرنا ہے۔ اب ماشاء اللہ سے ”علی زیب فاؤنڈیشن“ کی چھ برانچیں کام کر رہی ہیں مختلف شہروں میں۔“

میڈیسن کی فیلڈ میں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ تو آپ کو اس فیلڈ میں آنے کا خیال کیسے آیا؟

آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میڈیسن کے اس شعبے میں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ سرجری میں یا دیگر شعبوں میں جاتے ہیں۔ یہ بیماری اب بہت عام ہو گئی ہے۔ جبکہ آج سے پچاس سال پہلے تو لوگوں کو اس بیماری کے بارے میں کچھ بتا نہیں تھا..... اور میں اس فیلڈ میں کیوں آیا تو جب میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو تکلیف میں دیکھتا تھا تو مجھے ان معصوم بچوں پر ترس بھی بہت آتا تھا اور افسوس بھی بہت ہوتا تھا کہ ہر پندرہ بیس دن کے بعد انہیں ایک تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تو بس معصوم بچوں کی تکلیف دیکھ کر میں نے بھی اس فیلڈ میں آنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس کے بارے میں میں نے پڑھا بھی اور ٹریننگ بھی لی، اپنے ملک کے میڈیکل کالجز سے اور ملک سے باہر بھی..... پیسوں کا لالچ مجھ میں تھا نہیں..... اب تقریباً پینتیس پچھتیس سال ہو گئے ہیں مجھے اس فیلڈ میں کام کرتے ہوئے۔

ہوں..... البتہ کھانا پکانے کا کوئی شوق نہیں ہے.....
اور نہ ہی پکانا آتا ہے۔
”سیاست سے لگاؤ ہے؟“

کوئی لگاؤ نہیں..... اور نہ ہی اتنا ٹائم ہے کہ
اس کو دلچسپی سے دیکھوں۔ ہماری سیاست تو بہت
گندی ہے اور ہمارے یہاں الیکشن نہیں سلیکشن
ہوتے ہیں..... اور میرے پاس تو جو ٹائم ہوتا ہے وہ
صرف اور صرف اپنے بچوں کے لیے ہوتا ہے اور
میں نے آپ کو بتایا کہ ہمارے ادارے میں اس
وقت تقریباً 4 ہزار بچے زیر علاج ہیں تو ان چار ہزار
بچوں کو میں اپنے بچے سمجھتا ہوں..... یہ بچے چھ ماہ کی
عمر میں آتے ہیں اور چھ ماہ کی عمر سے ان کو بلڈ گٹ
شروع ہو جاتا ہے۔ اور بہت کم عمر لکھوا کے آتے
ہیں یہ اوپر سے..... خود سوچیں کہ ماں باپ کے
لیے کتنی اذیت کی بات ہے۔ اللہ سب پر اپنا کرم
کرے۔“ (آمین)

”ڈاکٹر صاحب اب میں چاہوں گی کہ آپ
اپنے بارے میں، اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے
؟“

”میں لاہور میں پیدا ہوا۔ میرے والد آرمی
میں تھے۔ سید خاندان سے تعلق ہے۔ چار بھائی ہیں
ہم، میرا نمبر دوسرا ہے۔ شادی میں نے پسند سے کی۔
مگر وہ اریج میرج تھی۔ ماشاء اللہ سے دو بیٹے اور
ایک بیٹی ہے۔ ایک بیٹے نے ”اے سی اے“
کیا ہے اور دوسرے نے ”ایم بی اے۔“ بیٹی
تیسرے نمبر پر ہے اسے ڈاکٹر بننے کا شوق ہے اور
اللہ اسے اس کے ارادوں میں کامیاب کرے۔ بس
یہ ہماری چھوٹی سی فیملی ہے۔

”بچپن میں کیسے تھے۔ شرارتی یا بہت پڑھا کو،
اور والدین آپ کو کیا بنانا چاہتے تھے؟“

بچپن میں پڑھائی لکھائی میں بہت اچھا تھا اور
ہمیشہ اچھا رہا۔ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان
کا بیٹا ڈاکٹر بنے، انجینئر بنے..... لیکن میں ”پائلٹ“
بننا چاہتا تھا، مگر ایسا نہ ہو سکا، شرارتی میں بہت تھا۔
اور ڈاکٹر تو میں بس حادثاتی طور پر بن گیا..... اور میں
کچھ بھی بن سکتا تھا کیونکہ میں پڑھائی میں بہت اچھا
تھا۔ بہر حال اپنی خواہش کے برعکس میں ڈاکٹر بن
گیا۔ اور شاید اللہ نے مجھ سے تھیلیسیمیا کے
بچوں کے لیے کچھ کام لینا تھا۔

”اتنی مصروفیات میں سے کیا گھر والوں کے
لیے ٹائم نکال لیتے ہیں آپ؟“

”جی بالکل..... ٹائم نکال لیتا ہوں۔ اسپتال
سے فارغ ہو کر جب گھر آتا ہوں تو پھر سارا وقت

بوی بچوں کے لیے ہی ہوتا ہے..... اپنے پوتے
پوتیوں کو ٹائم دیتا ہوں۔ گھومنے پھرنے کا مجھے بہت
شوق ہے تو ہر اتوار کو کہیں نہ کہیں نکل جاتے ہیں۔
مجھے انڈین فلموں کا بہت شوق ہے..... ضرور دیکھتا
ہوں۔ میوزک مجھے اچھا لگتا ہے تو وہ بھی شوق سے
سنتا ہوں۔ یرانے گانے بہت شوق سے سنتا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سوچ نگر کی رانی



رحمۃ جمیل

قیمت - 350/- روپے

منشور کا بندہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:
32735021

37، اردو بازار، کراچی



بندگو بھی

بندگو بھی اور بردگولی میں ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو آنتوں کے کینسر کا خطرہ کم کر دیتے ہیں۔ لندن کے ایک انسٹی ٹیوٹ کی تحقیق کے مطابق جب یہ سبزیاں ہضم کی جاتی ہیں اس وقت جسم میں کینسر کو ختم کرنے والے کیمیائی مادے پیدا ہوتے ہیں۔

ریسرچ کے مطابق جس وقت یہ سبزیاں ہضم کی جاتی ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک پروٹین جسم میں متحرک ہوتا ہے۔ جو آنتوں کی سوزش کو کم کر دیتا ہے۔ بہتر ہے کہ ان سبزیوں کو زیادہ دیر پکایا نہ جائے۔

خواہش

دعا ملک کی اصل پہچان تو بہن حمیمہ ملک، بھائی فیروز خان اور شوہر سہیل حیدر ہیں دعا نے کچھ عرصہ ایک مارننگ شو میں میزبانی کے فرائض بھی انجام دیے۔ اب دعا ملک اپنے بھائی اور بہن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اداکاری کی طرف آگئی ہیں۔ (بہن کے نقش قدم الگ ہیں اور بھائی کے الگ تو دعا کس کے نقش قدم اپنائیں گی یا.....؟)

اپنے پہلے ڈرامے کے حوالے سے دعا کا کہنا ہے کہ۔ ”ایمان داری سے کہا جائے تو میں نے اب

تک صرف ایک ڈراما، میرے قاتل میرے دل دار بہت توجہ سے دیکھا ہے، کیوں کہ میرے شوہر سہیل حیدر کو اس ڈرامے کے ٹائٹل گانے پر ایوارڈ ملا تھا۔ (ہائیں!) ————— اپنی بہن کے ڈرامے بھی نہیں دیکھے)

دعا نے مزید کہا کہ ”میں ہمیشہ سے اداکاری کرنا چاہتی تھی (پر کسی نے لیا نہیں کیا.....؟) میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں (تو.....؟) اور اب لوگوں کی (کن لوگوں کی.....؟) اس خواہش کو پورا کرنا چاہتی ہوں جنہیں امید تھی کہ میں اپنی بہن اور بھائی کی طرح اداکاری کروں گی۔ (آہمم!!)

فرق

ساحر علی بگا کا کہنا ہے کہ پاکستانی فلم اچھی اور معیاری (آہمم.....) بنے گی تو کوئی شک نہیں کہ وہ کامیابی حاصل نہ کرے۔ (ہاہاہا..... ہم بولے گا تو





.....؟) ساحر (ساحر لودھی نہ سمجھ لیجیے گا.....) کا کہنا ہے کہ لاہور اور کراچی کی تکرار کو ختم ہو جانا چاہیے۔ (ویسے یہ تکرار عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جو ناکام ہو جاتے ہیں یا کچھ کر نہیں پاتے۔) اگر قلم کامیاب ہو جائے تو وہ لاہور یا کراچی کی نہیں کہلائے گی۔ وہ پاکستانی قلم کہلائے گی۔ دوسری بات فلم اور ڈرامہ انڈسٹری کے لوگوں میں بہت فرق ہے جب آپ ڈرامہ آرٹسٹ کو قلم میں کاسٹ کریں گے جو چوبیس گھنٹے ٹی وی پر نظر آتا ہے تو کون ٹکٹ خرید کر سینما جائے گا ان کی اداکاری دیکھنے کے لیے۔ (وہی تو.....؟ ساحر علی آپ واقعی ٹیلنٹڈ ہیں)

ادھر ادھر سے

☆ ”قریشی صاحب یہ بتائیں کہ میرے دھرنے کے دنوں میں نواز شریف دور کے آئی بی چیف آفتاب سلطان نے کس کس صحافی کو پیسے دیے اور خفیہ فنڈ کہاں کہاں خرچ کیے؟“

حلف اٹھانے کے بعد اسی دن آئی بی چیف شجاعت اللہ قریشی سے عمران صاحب کا سوال۔

”آپ آئی بی کا سارا ریکارڈ دیکھ سکتے ہیں۔ آئی بی نے کسی صحافی اسکر یا کسی غیر ضروری جگہ کوئی رقم تقسیم نہیں کی.....“

شجاعت اللہ قریشی کا جواب

(اعزاز سید۔ سیاسی افق)

جنگ اتوار 30 ستمبر)

☆ ہمارے بعض دانش ور، تجزیہ نگار اور کالم نگار تو

سیاست دانوں کے خیالات سے ہی نہیں بلکہ ان کی سوچ سے بھی پیشگی طور پر آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی گفتگو اور تحریر کا آغاز ہی ان کی سوچ کے حوالے سے کرتے ہیں۔

(فاروق اقدس۔ سیاست پارے)

☆ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ طویل عرصے تک مرغن غذا میں کھانے سے انسان کو ڈیپریسیا اور اور انزائمز کا مرض لاحق ہو سکتا ہے لیکن حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا

کہ محض ایک روز چکنائی سے بھرپور غذا استعمال کرنے سے ہی آپ کی یادداشت متاثر ہو سکتی ہے۔ (سوشل میڈیا)

☆ جب نواز شریف قید تھے تو راولپنڈی کے ورکرز نے مسلم لیگ ہاؤس میں گلثوم نواز کی دعوت کی۔ اس دعوت میں شیخ رشید کو دعوت نہ دی گئی جب وہ وہاں سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ ”بیگم صاحبہ یہ ورکرز سب بدمعاش اور ٹکے ہیں آپ لال حویلی آئیں۔ میں آپ کی دعوت کرتا ہوں۔“

جب گلثوم نواز لال حویلی پہنچیں تو شیخ رشید نے کہا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آپ سیڑھیاں واپس اتر جائیں۔“ اس وقت بیگم گلثوم نواز نے کہا آپ نواز شریف کے نام پر چھ بار وزیر بنے ہیں میں تو چلی جاؤں گی۔ لیکن آپ نواز شریف کو یاد رہیں گے۔“

(ارشاد جیلانی..... جنگ)

☆ اگر تم غلط کو غلط نہیں کہہ سکتے تو تم غلامی کے اعلا ترین درجے پر ہو، اور اگر تم غلط کو غلط نہیں سمجھتے تو تم جہالت کے اعلا ترین درجے پر ہو۔

(سوشل میڈیا سے)

☆ ناراض لڑکی سے بحث کرنا تانی کو آئی فون کے فنکشن سمجھانے کے مترادف ہے۔

(سوشل میڈیا سے)

حکامشی کو بیارے

ادارہ

سے ایسی دوستی ہوئی کہ ہم نے تینوں رسالے خریدنا شروع کر دیئے۔ 2009 سے لے کر اب تک کے خواتین، شعاع کے شمارے میرے پاس محفوظ ہیں اور اتنے نئے کہ دیکھنے والے کہتے ہیں ”کیا دیکھ کر رکھ دیتی ہو۔“

مجھے اپنے رسالوں سے بہت پیار ہے۔ اس لیے نہ میں اپنے رسالے کسی کو دیتی ہوں اور نہ لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ تنزیلہ ریاض، فائزہ افتخار، عمیرہ احمد، نگہت سیما، فرحت اشتیاق، انیسہ سلیم، آسیہ رزاقی، نگہت عبداللہ کی ہر تحریر بہترین ہوتی ہے، ایک دفعہ میں نے کسی پرانے رسالے میں ایک کہانی پڑھی تھی جس کا پہلا صفحہ پھٹا ہوا تھا اور اس کی ہیروئن کا نام ”تظہیر رحمان“ تھا اور یہ کہانی مجھے — اچھی لگی۔ شاید ہی میں بھی اس کہانی کو بھلا پاؤں (اگر کسی کو رائٹر کا نام معلوم ہو تو ضرور بتانا) اور یہ ایسی تحریر ہے جو میرے لیے ناقابل فراموش ہے۔

4۔ بالکل جی سالگرہ منائی ہوں، بڑی دھوم دھام سے، غبارے لگا کر گھر سجائی ہوں اور اپنی تمام فرینڈز کو انوائٹ کرتی ہوں اور پھر بہت ہلاکلا ہوتا اور پاکٹ منی اجازت دے تو چھوٹی بہنوں کو آکس کریم پارلر بھی لے جاتی ہوں اور پھر تحائف بھی بڑے زبردست قسم کے ملتے ہیں۔ لاسٹ برتھ ڈے پر میرے بڑے بھائی نے موبائل گفٹ کیا اور امی نے سونے کی بالیاں دی تھیں اور مجھے تحائف لینا بہت اچھا لگتا ہے۔

5۔ اس سال بہت سی کتابیں پڑھیں کیونکہ کتابیں میرے لیے اتنی ضروری ہیں جتنی زندگی کے لیے آکسیجن۔

ویسے میرے پسندیدہ شعر بدلتے رہتے ہیں آج کل میرا پسندیدہ شعر یہ ہے

1۔ تعارف: ویسے نام تو میرا قرۃ العین علی ہے۔ لیکن جب کوئی مجھے اس نام سے پکارتا ہے تو بے اختیار ہی منہ سے پریزنٹ نکل جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں کلاس روم میں موجود ہوں۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ مجھے عینی پکارا جائے۔ قریشی میری کاسٹ ہے اس لیے میں ہوں ”عینی قریشی۔“ بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ اچھی موویز دیکھنا، میوزک سننا، ویڈیو گیم کھیلنا، کوکنگ کرنا۔ FM پر صرف عزیز نقوی کو سننا، ”بہترین کتابیں پڑھنا“ اسپیشل تاریخ پڑھنا مجھے بے حد پسند ہے۔ یہ سب کام میرے مشاغل میں شمار ہوتے ہیں اور میرا موسٹ فیورٹ مشغلہ ہے شرارتیں کرنا۔ مجھے بڑا مزہ آتا ہے دوسروں کو تنگ کرنے میں۔

2۔ بہت سوچا کہ اس سوال کا جواب کیا لکھوں۔ وہ کیا ہے ناں کہ مجھ میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ اس لیے ایک یا دو لکھنے سے دوسری خوبیوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس لیے کوئی بھی نہیں لکھ رہی کیونکہ میں بہت اچھی ہوں۔

جہاں تک خامیوں کی بات ہے میری سب سے بڑی خامی یہ کہ میں بہت بھلکڑ ہوں۔ اس لیے کوئی غلطی سے بھی میرے پاس اپنی چیزیں رکھوانا پسند نہیں کرتا۔ دوسری خامی یہ ہے کہ مجھے غصہ بہت شدید آتا ہے پھر کمرے کی کوئی چیز بھی اپنی موجودہ حالت میں نہیں رہتی۔

چلیں جی! بہت ہو گئیں خامیاں اب تیسرے سوال کی طرف چلتے ہیں۔

3۔ پہلی بار خواتین جون 2004 میں پڑھا، ہم لوگ پہلے صرف ”کرن“ پڑھتے تھے۔ جون 2009 میں اخبار والے انکل ”کرن“ کی جگہ غلطی سے خواتین دے گئے بس پھر خواتین اور شعاع

”اس سوچ میں ہوں آج کہ تم کون ہو، کیا ہو
اک خواب ہو، خوشبو ہو، میرے دل کی صدا ہو
میں اس کے علاوہ تمہیں کچھ کہہ نہیں سکتی
تم میری مناجات ہو، تم میری دعا ہو“

یہ مت پوچھو کہ کیا آدمی ہوں
کرو گے یاد ایسا آدمی ہوں
تعارف اور کیا اس کے سوا ہو
کہ میں بھی آپ جیسا آدمی ہوں
1۔ یوں تو ہم کسی تعارف کے محتاج نہیں
(آہم) مگر آپ کہتے ہیں تو تعارف کروا ہی دیتے
ہیں۔ پانچ بھائی اور چار بہنوں میں سب سے لاڈلا
نمبر یعنی آخری نمبر پایا ہے۔ ایم اے اکنامکس کر رہی
ہوں (دیکھتے ہوتا ہے یا نہیں)۔

مشاغل کی بات کریں تو مشاغل بہت ہیں مثلاً
پڑھنا، سونا، گیمز کھیلنا شامل۔
باقی ٹی وی، کوکنگ، کمپیوٹر، گیس، رنگانا، یہ سب
بھی چلتا ہی رہتا ہے۔

2۔ اس سوال کا جواب اگر دوسروں سے
پوچھوں تو شاید ہنسنا تو دور کی بات مسکرانا بھی بھول
جاؤں، مگر دوسروں کی سنتا کون ہے لہذا اگر اپنی
خوبیاں دیکھوں تو لسٹ کچھ کم ہی پڑ جائے گی۔
خوبیوں میں سب سے پہلی خوبی زیادتی
برداشت کرنا ہے۔ اعتماد بہت ہے۔ ہنس مکھ، صبح جو
ہوں۔ اپنی غلطی فوراً مان لیتی ہوں۔ اس عادت سے
مجھے بہت پیار ہے۔ صاف گو ہوں۔ جبکہ خامیوں
کے ڈھیر لگے ہیں کچھ آپ کی نذر کرتی ہوں باقی
صیغہ راز ہی رہنے دیں۔

دوسروں پر اعتماد بہت جلد کر لیتی ہوں۔ نماز
باقاعدگی سے نہیں پڑھتی۔ غیر مستقل مزاج ہوں۔
کچھ کچھ سست بھی ہوں۔

3۔ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ رشتہ تو بہت
پرانا ہے۔ سب گھر والے پڑھتے ہیں
باقاعدہ رشتہ تین سال سے ہے۔

شعاع اور خواتین کی بہت سی تحریریں جو دل
موہ لیتی ہیں اور ناقابل فراموش ہیں ان میں عمیرہ
احمد کی ”پیر کامل“ ”لا حاصل“ ”ایمان امید اور
محبت“ ہیں۔ فرحت اشتیاق ”وہ جو قرض رکھتے تھے
جان پر“ (لیچر کے لیچر کے دوران بیچ میں چھپا کر
پڑھا تھا)۔ قراقرم کا تاج محل خوب صورت تحریریں
ہیں۔

موسٹ فیورٹ ناؤز ”جو چلے تو جان سے
گزر گئے“ اور عفت سحر یا شا کا ”محبت دل میں
دستک“ کئی دنوں تک دل و دماغ پر چھائے رہے۔
4۔ 24 جنوری کو اس دھڑکی کو رونق بخشی، گھر
میں باقاعدہ طور پر تو نہیں مگر کالج میں فرینڈز کے
ساتھ بہت اہتمام کے ساتھ منائی ہے۔ البتہ گفت
سب دیتے ہیں۔

5۔ پسندیدہ شاعری کی آپ نے کیا بات کی۔
ڈائریاں بھری ہیں۔ انتخاب مشکل ہے مگر ناممکن
نہیں۔

کہنے کو وہ ’الف‘ تھا مگر اب کھلا کہ
وہ پہلا مکالمہ تھا مرا زندگی کے ساتھ



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول

**فصل غم کا
گوشوارہ
رضیہ جمیل**

قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021

اپ کا باورچی خانہ

سعدیہ وحید چودھری

اجی کہاں ہمارا باورچی خانہ، ہم تو صرف باورچی ہی رہ گئے ہیں۔ اہل خانہ جو فرمائش کرتے ہیں، ہم باورچی (باورچن) بنتے ہیں اور من و عن پوری کر دیتے ہیں۔ تھوڑے دن پہلے کہیں پڑھا تھا، لکھا تھا، گھر میں میری بڑی اہمیت ہے۔ کچھ بھی پکانے سے پہلے مجھ سے پوچھا اور مشورہ لیا جاتا ہے اور جو میں کہہ دوں، وہ کبھی نہیں بنایا جاتا۔ ہا ہا ہا..... بس وہی سمجھ لیں، ہم بے حالوں کا حال بھی۔ حیر یہ مذاق تھا، اب آتے ہیں سوالوں کی طرف۔

س: کھانا بناتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: اگر ہمارے شادی زدہ..... اوہ مطلب شادی شدہ ہونے سے پہلے کا پوچھیں تو میں کہتی، اپنے موڈ اور پسند کا۔ شادی کے بعد سب کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے (سوائے اپنی پسند کے)۔ زیادہ تر شریک حیات کی پسند کا۔ انہیں اگر ٹماٹر کا چھلکا بھی نظر آجائے تو انگلی اور انگوٹھے سے پکڑتے ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھتے ہیں، یہ ٹماٹروں کے چھلکے کیوں لاوارثوں کی طرح تیر رہے ہیں۔ نہ ہر ادھنیا نظر آئے، نہ ہری مرچ۔ بس دال سبزی جو بھی ہو اسے اتنا پکایا جائے کہ اس کی اپنی اصل شکل نظر نہ آئے۔ عجیب سا ملغوبہ بنا ہو، تو بس اسی چیز کا خیال رکھتی ہوں کہ ان کی پسند کا سالن بناؤں۔

س: کھانے کا وقت ہے اور اچانک مہمان آجائیں تو کوئی ایسی ڈش جو فوراً بن جائے؟

ج: ہمارے ہاں مہمان آتے ہی کھانے کے وقت ہیں تو اگر عین کھانے کے وقت آئیں تو جو بنا ہوتا ہے، پیش کر دیتے ہیں۔ اگر دوپہر میں آئیں تو ہمیشہ بریانی ہی بنتی ہے۔ بریانی سے ایک مزے دار واقعہ یاد آیا۔

تقریباً دو سال پرانی بات ہے کہ پانچوں چڑیاں بابل کے آنگن میں اتری ہوئی تھیں۔ گرمیوں کے دن اور گرمی زوروں کی تھی۔ دوپہر کو کھانے میں کچھ نہیں تھا تو امی نے کہا کہ بریانی بنالو۔ اب پانچوں میں سے کوئی بھی بنانے کو تیار نہیں تھی، تو مابدولت نے مشورہ دیا کہ پرچیاں ڈال دیتے ہیں، جس کا نام نکلا وہ بنائے گی۔ پوری کا بیہ ہمارے رائے سے متفق ہو گئی۔ چونکہ میں کرسی صدارت پر براجمان تھی تو پرچیاں لکھنے کی ذمہ داری بھی میری تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اقرا کے علاوہ کوئی مزے کی نہیں بنائے گی۔ سو پانچ بار پرچیاں پھینکی گئیں اور پانچوں پر اقرا کا ہی نام نکلا۔ میں نے کہا، دیکھو اللہ تعالیٰ مجھے تمہیں ہماری مہمان نوازی کا شرف بخشنا چاہتا ہے، اسی لیے بار بار تمہارا نام نکل رہا ہے۔ چارونار چار بے چاری کو اٹھنا ہی پڑا۔ بریانی بنی، ہم پانچوں نے گرم گرم نوش فرمائی۔ برتن دھونے کے بعد جب سب لیٹنے لگے تو میں نے اسے حقیقت بتائی کہ میں نے پانچوں پر چیوں پر تمہارا ہی نام لکھا تھا۔ سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا اور اقرا سے جو میری عزت افزائی ہوئی، وہ میں نہیں بتاؤں گی (آہم، ہا ہا ہا)۔ کیا مزے کے دن تھے۔ بڑا مزا آتا تھا۔ بریانی ہم ڈبے والے مسالے کی ہی بناتے ہیں، سو ترکیب سب کو پتا ہوگی۔

س: مہینے میں کتنے دن کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج: جب پروگرام بنے، چلے جاتے ہیں۔ کبھی مہینے میں دو بار بھی اور کبھی دو مہینے میں ایک بار بھی۔

س: صبح ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟

ج: کوئی اسپیشل چیز نہیں بنتی، جس کا جو دل چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ کوئی نان چائے، کوئی رسک، کوئی ڈبل روٹی جام یا رات کی روٹی کے ساتھ چائے یا سالن روٹی۔ رات کی روٹی چائے کے ساتھ بڑا مزا دیتی ہے اور اس سے ہڈیاں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ انڈا پراٹھا بھی کھا لیتے ہیں۔

معمولہ کے پکوان

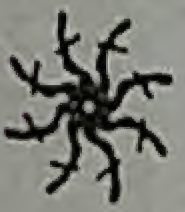
خاکہ جیلانی

چکن فرائیڈ رائس

دم کا گوشت

اجزاء:-	
آدھا کلو	چاول
ایک پاؤ	چکن (بغیر ہڈی)
تین عدد	انڈے
دو عدد	گاجر
ایک عدد	شملمہ مرچ
دو عدد	ہری پیاز
آدھا کلو	مٹر
دو کھانے کے چمچے	سویا ساس
حسب ذائقہ	نمک
ایک چائے کا چمچ	کالی مرچ
ایک پیالی	تیل
	ترکیب:-

سب سے پہلے چاول ابال کر رکھ لیں۔ اس کے بعد ایک دیکھی میں انڈے تل کے باریک ٹکڑے کاٹ لیں۔ اب ایک کڑھائی میں تیل ڈالیں، چکن، گاجر، شملہ مرچ، مٹر اور ہری پیاز ڈال کر اچھی طرح تل کر لیں۔ جب مرغی گل جائے تو اس میں سویا ساس، سرکہ، نمک، کالی مرچ ڈال کر پکائیں۔ دو سے تین منٹ تک پکانے کے بعد اب اس میں چاول اور انڈے شامل کر لیں اور مزید 10 منٹ کے لیے دم آنے تک چھوڑ دیں۔ گرم فرائیڈ رائس تیار ہیں۔



اجزاء:-	
گوشت	دو کلو
تلی پیاز	ایک کپ
پودینہ	آدھی گٹھی
آٹا	دو کپ
سرکہ	آدھا کپ
بجی پیاز	ایک پاؤ
دہی	ایک پاؤ
بھنا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
پیتا	دو چائے کے چمچے
تیل	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
	ترکیب:-

گوشت کا دو کلو کا پیس لیں۔ گوشت کو پیتا لگا کر

رکھ دیں کچھ دیر، اب مٹی کی ہانڈی لے کر اس میں گوشت کا ٹکڑا ڈال لیں اور تیل، سرکہ، براؤن پیاز، زیرہ، کالی مرچ اور لال مرچ سب ڈال دیں۔ اب پھینٹا ہوا دہی شامل کر دیں اور تھوڑا سا چمچ چلا کر ڈھک دیں۔ آٹھ دھیمی رکھیں تاکہ گوشت گل جائے۔ جب گوشت گل جائے تو اسے بھون لیں۔ ایک برتن میں پیاز کاٹ کر تل لیں اور بھنے ہوئے گوشت پر پیاز کا تر کا لگالیں۔ اب اسے ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا وغیرہ سے گارنش کر کے پیش کریں، مزے دار دم کا گوشت تیار ہے۔

الماس پروین.....سیالکوٹ

س:- میں نے آنکھ ایسے گھر میں کھولی جہاں غربت کے ڈیرے تھے لیکن محبت کی کمی نہ تھی۔ باپ مزدوری کرتا تھا، جو کماتا لا کرا می کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ میں اکلوتی ہونے کی وجہ سے ماں اور باپ دونوں کی لاڈلی تھی، وہ محدود آمدنی میں بھی میری ہر خواہش پوری کرتے۔ ان کے لاڈ پیار نے مجھے ضدی بنا دیا۔ جو منہ سے نکلتا، اسے ہر قیمت پر پورا کروا کے ہی دم لیتی۔

باوجود اتنی تنگی ترشی کے ابانے مجھے اسکول میں داخل کرایا تھا۔ میں پڑھائی میں زیادہ اچھی نہ تھی تو بری بھی نہ تھی۔ میں نے میٹرک کر لیا تو امی کو شادی کی فکر ہوئی۔

آگے پڑھائی کا میرا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ رشتہ کی تلاش شروع ہوئی۔ ابا کے ایک دوست نے رشتہ بتایا، وہ لوگ دیکھنے آئے۔ میں صورت شکل کی اچھی تھی، پسند کر کے رشتہ دے گئے۔

ابا، اماں بھی ان کے گھر گئے۔ 120 گز پر سہ منزلہ مکان تھا۔ ان کے چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ پانچ بیٹے بھی شادی شدہ تھے۔ وہ اوپر کی منزلوں میں رہتے تھے لیکن کھانا پکانا مشترک تھا۔ سب مل کر کھانا کھاتے تھے۔ لوگ شریف اور کھاتے پیتے تھے۔ لڑکا بھی پڑھا لکھا، خوش شکل تھا۔ ابا کو وہ بہت اچھا لگا لیکن اماں گھر آئیں تو بہت چپ چاپ تھیں۔ ابانے ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے کہا ”الماس ہمیشہ پرسکون اور خاموش ماحول میں رہی ہے۔ وہاں اتنے لوگوں میں کیسے گزارا کرے گی۔ جتنے لوگ اتنے مزاج پھر ڈھیر سارا کھانا پکانا، اسے تو گھر کے کام کاج میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ آپ سوچ لیں، کہیں یہ مسئلہ نہ بن جائے۔“

ابانے سلی دی اور کہا۔ ”سب لڑکیاں شادی سے پہلے ایسی ہی ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد جب ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ اماں کو بھی لڑکا بہت اچھا لگا تھا، بہت مہذب اور سنجیدہ طبیعت کا تھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ سال بعد میری شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد پہلا مہینہ بہت خوش گوار گزرا۔ زاہد میرے شوہر واقعی بہت اچھے تھے۔ ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ گھر والوں نے بھی نئی دلہن کی ناز برداری میں کوئی کمی نہ کی۔

بھائیوں کے بیوی بچوں کو ملا کر گھر میں ٹوٹل چھبیس افراد تھے۔ صفائی کرنے اور برتن دھونے کے لیے ماسی آتی تھی لیکن کھانا گھر کی بہویں مل کر بناتی تھیں۔ صبح دال، سبزی اور رات کو گوشت یا چکن کا سالن بنتا۔ کھانا پکانے کی باریاں مقرر تھیں۔

ایک بھائی کی بیوی صبح روٹی بناتی، دوسرے کی شام کو بناتی۔ ناشتا سب مل کر بناتیں۔ وسیع و عریض دستر خوان بچھتا اور سب مل کر کھانا کھاتے۔ کھانے کے اوقات مقرر تھے۔ مقررہ وقت پر سب کو حاضر ہونا ہوتا۔ گھر میں ہر وقت شور ہنگامہ پیار ہوتا۔ آئے دن ننندیں اپنے بچوں کے ساتھ رہنے آ جاتیں۔ پرائیویسی کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا۔ میرا کمرہ علیحدہ تھا لیکن جس کا جی چاہتا، منہ اٹھا کے کھس جاتا۔

ایک ماہ بعد میں نے کام شروع کیا تو میرے ذمے بھی کام لگایا گیا۔ میں روٹی پکانے بیٹھی۔ بڑی بھابھی بھی

میرے ساتھ تھیں۔ میں بیل رہی تھی، وہ سینک رہی تھیں۔ اتنی روٹیاں مجھے تو لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ بہر حال جیسے تیسے کر کے روٹی پکائی۔ پھر اپنے کمرے میں آکر سوئی تو شام کی خبر لائی۔ دوسرے دن زاہد کے آفس جانے کے بعد میں نے رخت سفر باندھا اور میکے آ گئی۔

شام کو زاہد آ گئے۔ وہ خفا خفا سے تھے۔ انہوں نے مجھے اس طرح منہ اٹھا کر آنے پر نرمی سے سمجھایا کہ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ پھر انہوں نے گھر چلنے کو کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ کافی دیر مجھے منانے کی کوشش کرتے رہے لیکن میں کہاں ماننے والی تھی۔ آج تک اپنی ضد منوائی آئی تھی۔

وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ دو تین دن گزر گئے۔ امی نے مجھے بہت سمجھایا۔ انہوں نے — زاہد کو کھانے پر بلایا۔ میں رات کا کھانا کھا کر ان کے ساتھ آ گئی لیکن میں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکوں گی، وہ جلد میرے لیے علیحدہ گھر کا بندوبست کریں۔

انہوں نے کہا ”میری تنخواہ اٹھارہ ہزار ہے۔ اس تنخواہ میں گھر کا کرایہ اور بل وغیرہ دینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ صبر کر لو۔ تنخواہ بڑھ جائے گی تو سوچیں گے۔“

لیکن میں نے تو صبر کرنا سیکھا ہی نہ تھا روز کسی نہ کسی بات پر ہماری لڑائی ہوتی۔ زاہد خاموش ہو جاتے۔ ایک دن جٹھانی کے بچوں کو شور کرنے پر میں نے پھٹر لگا دیا تو وہ بھی میدان میں اتر آئیں۔ پھر تو جھگڑے روز کا معمول بن گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن میری زبان درازی پر اس نے مجھے ٹوکا تو میں نے غصہ میں اندھی ہو کر انہیں جھاڑو اٹھا کر دے ماری۔ زاہد اسی وقت گھر میں داخل ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھا تو غصہ سے آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے کہا تم نے میری ماں پر ہاتھ اٹھایا تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوئی ان سے معافی مانگو ورنہ آج کے بعد تم اس گھر میں نظر نہیں آؤ گی۔ میں نے معافی تو کیا مانگنی تھی، اسی وقت گھر چھوڑ کر آ گئی۔

اب میں اپنی والدین کے گھر میں ہوں۔ زاہد نے اس دن کے بعد نہ مجھے فون کیا، نہ واپس بلایا۔ میں جانتی ہوں میری غلطی ہے۔ میں اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر سکی۔ لیکن میں اپنے مزاج اور طبیعت سے مجبور ہوں۔ مجھ سے ہر وقت اتنا شور، ہنگامہ برداشت نہیں ہوتا نہ اتنی محنت کر سکتی ہوں۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟

ج:۔ اچھی بہن! جو کچھ ہوا، اس میں آپ کا تو قصور ہے ہی آپ کے والدین کا بھی قصور ہے۔ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی بیٹی ایک بالکل مختلف ماحول میں رہ سکے گی یا نہیں۔ انہیں آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنا چاہیے تھا۔ مڈل کلاس میں رشتوں کا حصول آسان نہیں ہوتا۔ بہت سی چیزوں پر کمپروماز کرنا ہوتا ہے۔ آپ کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کو پڑھا لکھا شریف لڑکا صحیح عمر میں مل گیا۔ بے شک ان لوگوں کا ماحول آپ کی افتاد طبع کے مطابق نہ تھا۔ اب آپ کے سامنے دو راستے ہیں، شوہر سے علیحدگی اختیار کر لیں یا معافی مانگ کر ان کے گھر واپس چلی جائیں۔

یہ سوچ لیں کہ شوہر سے علیحدگی کے بعد آپ نے کیا کرنا ہے۔ دوسری شادی ہو سکتی ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ آپ کو آپ کی مرضی کے مطابق شوہر مل سکے۔ ہو سکتا ہے اگر ٹیمپلی مختصر ہو تو لڑکے میں کوئی اور خامی ہو، کماتا نہ ہو، کوئی بری عادت ہو تو اس صورت میں آپ کو کمپروماز تو کرنا پڑے گا۔

تعلیم بھی آپ کی کم ہے۔ کوئی اچھی جاب ملنا بھی مشکل ہے اگر آپ مزید تعلیم حاصل کر لیں تو اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہیں لیکن یہ مرحلہ بھی آسان نہیں ہوگا۔ اس کے لیے وقت چاہیے۔

اگر آپ چند سال اپنی سسرال میں صبر و برداشت کے ساتھ گزار لیں تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ آپ کے شوہر میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ وہ آپ کا خیال بھی رکھتے ہیں، ہو سکتا ہے آنے والے دنوں میں ان کی تنخواہ بہتر ہو جائے اور وہ آپ کی حسب منشاء زندگی آپ کو دے سکیں۔

آپ ان تمام باتوں پر غور کر کے خود فیصلہ کریں کہ کیا کرنا ہے۔

س: امتل آپ! میرے بال بہت بے رونق اور بے جان ہیں۔ میں اپنی غذا کا بھرپور خیال رکھتی ہوں اور ہر ہفتے بالوں میں تیل بھی باقاعدگی سے لگاتی ہوں۔ اس کے باوجود نہ تو بال جھڑنا بند ہوئے ہیں، نہ ہی ان کی بے رونقی دور ہوتی ہے؟

ج: بالوں کی بے رونقی کی ایک وجہ آپ کا شیمپو بھی ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنا شیمپو تبدیل کیجیے۔ اس کے علاوہ اپنی خوراک میں پھلوں کے استعمال کو یقینی بنائیں۔ آپ باقاعدگی سے تیل کا استعمال بھی کرتی ہیں تو اس کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ ہمارے بالوں کو پروٹین کی ضرورت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پروٹین کی کمی کے باعث بال بے رونق ہو جاتے ہیں۔ آپ انڈے کی زردی میں دو چمچے تیل اور دو چمچے دہی لے کر اچھی طرح مکس کر لیں اور بالوں کی جڑوں میں اس آمیزے کو اچھی طرح لگائیں۔ تقریباً دو گھنٹے بعد بالوں کو دھولیں۔ اس عمل کو ہفتے میں ایک بار ضرور دہرائیں، بالوں کا روکھا پن دور ہو جائے گا۔

س: آپ! میری عمر ستائیس سال ہے۔ مجھے کافی عرصے سے ایکنی کی پرالیم کا سامنا ہے۔ میں نے ہر قسم کے ٹونکے آزمائے مگر دانے اپنے نشانات چھوڑ جاتے ہیں اور اب تو چہرے پر واضح گڑھے پڑنے لگے ہیں، دانوں کی وجہ سے۔ آپ سے گزارش ہے کہ کوئی ایسا ٹونکا بتائیے جس سے داغ دھبے دور ہو جائیں۔

ج: ایکنی ہونے کی اصل وجہ تو جلد کا آئلی ہونا، دوسرا ہاضمے کا خراب رہنا۔ سب سے پہلے تو آپ

اپنی غذا پر توجہ دیں۔ پھل اور سبزیاں اچھی جلد کے لیے بہت ضروری ہیں اور اگر پانی کم پیتی ہیں تو دن میں آٹھ سے دس گلاس پانی پینے کی عادت ڈال لیں۔ اس کے علاوہ آپ آدھا کپ بیسن میں دو چمچے روغن بادام، ایک چمچہ ہلدی اور تین چمچے دودھ ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو اپنے چہرے پر لگالیں اور جب سوکھ جائے تو ہلکے ہاتھ سے مساج کر کے چہرے سے اتار لیں پھر چہرے کو پانی سے دھولیں۔ ہفتے میں دو بار ضرور اس عمل کو دہرائیں۔ آپ اس آمیزے کو فریج میں بھی رکھ سکتی ہیں۔

س: آپ! جی! میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ اپنی جاب کی وجہ سے میں اپنی جلد کے ساتھ پیروں کا بھی بہت خیال رکھتی ہوں مگر نہ جانے کیا بات ہے۔ پیروں کی اتنی صفائی رکھنے کے باوجود میرے پیر گندے ہی لگتے ہیں۔ ہر طرح کے ٹونکوں کے باوجود پیر صاف نہیں رہتے؟

ج: جاب کرنے والی اکثر خواتین کے ساتھ یہ مسئلہ رہتا ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ آپ جب گھر سے باہر نکلیں تو ایسے جوتوں کا استعمال کریں جو بند ہوں۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے پیروں کا پیڈی کیور کریں، نیم گرم پانی میں شیمپو کے چند قطرے، سرسوں کا تیل آدھا چائے کا چمچہ اور ڈیٹول ڈال کر پاؤں اس میں رکھیں۔ پندرہ منٹ بعد پیروں کو نکال کر اس کا مساج کریں اور کوئی معیاری لوشن لگالیں۔ چند ہفتوں میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

